فقہائے پاک و ہند

تیرھویں صدی ہجری

جلد سوم

محمد اسحٰق بھٹی

فقہائے پاک و ہند

تیرھویں صدی ہجری

جلد سوم

محمد اسحٰق بھٹی

*

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲-کلب روڈ لاہور

طبع اوّل : ۱۹۸۹ء
تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سراج منیر
ناظم، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور

مطبع : کمبائن پرنٹرز، لاہور

قیمت : -/۱۰۰ روپے

فہرست مضامین

ن

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اپنے لائق احترام قارئین کی خدمت میں "فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری" کی تیسری جلد پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو اس سلسلے کی درحقیقت دسویں جلد ہے۔

"فقہائے ہند" کی تصنیف کا کام آج سے چودہ برس پہلے ۱۹۷۳ء میں شروع کیا گیا تھا اور اب تک اس کی مندرجہ ذیل جلدیں معرضِ اشاعت میں آچکی ہیں۔

۱۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی تھی جو فہرستِ مضامین سمیت ۳۴۸ صفحات پر مشتمل اور برصغیر پاک و ہند کے ۲۹۴ علما و فقہا کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس جلد میں پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کے فقہائے نامدار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

۲۔ دوسری جلد ۱۹۷۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ نویں صدی ہجری کے ۱۰۵ فقہا اور ممتاز ارباب علم و عرفان کے سوانح و کوائف پر محیط ہے اور مع فہرست مضامین کے اس کے کل صفحات ۲۸۰ ہیں۔

۳۔ تیسری جلد میں دسویں صدی ہجری کے ۲۵۲ فقہائے عالی قدر کا تذکرہ ضبط کتابت میں لایا گیا ہے۔ یہ جلد ۴۱۶ صفحات کو گھیرے ہوئے ہے، ۱۹۷۶ء کو معرضِ طباعت میں آئی۔

۴۔ چوتھی جلد (حصہ اوّل) ۱۹۷۷ء میں طبع ہوئی۔ یہ ۲۹۲ صفحات پر محتوی ہے۔ اس میں گیارھویں صدی ہجری کے ۱۲۶ فقہائے کرام کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔ چوتھی جلد (حصۂ دوم) ۱۹۷۸ء میں چھپی۔ یہ بھی گیارھویں صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہے۔

اس جلد کے کل صفحات ۴۳۶ ہیں اور ۱۷۶ فقہائے ذوی الاحترام کا تذکرہ اس میں آچکا ہے ۔

۶ ۔ جلد پنجم (حصہ اول) یہ ۱۹۷۹ء میں طباعت کی منزل سے گزری ۔ اس کے صفحات ۳۶۸ ہیں اور اس میں بارھویں صدی ہجری کے ۱۶۲ فقہائے ہند کی علمی و تصنیفی سرگرمیاں بیان کی گئی ہیں ۔

۷ ۔ جلد پنجم (حصہ دوم) یہ جلد ۱۹۸۱ء میں چھپی ۔ اس کے کل صفحات ۴۲۸ ہیں اور اس میں بارھویں صدی ہجری کے ۱۰۱ اصحابِ علم اور ماہرین فقہ کی تگ و تازِ علمی ضبط تحریر میں لائی گئی ہے ۔

۸ ۔ فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری (جلد اوّل) اس میں نام کی کچھ تبدیلی کر دی گئی ہے ۔ تاہم یہ اسی سلسلے کی کڑی ہے اور تیرھویں صدی ہجری کی جلد اوّل ہے ۔ یہ جلد ۱۹۸۲ء میں طبع ہوئی اور اس کے کل صفحات ۳۵۶ ہیں ۔ اس میں ایک سَو فقہا کا تذکرہ تو اچھی خاصی تفصیل یا کسی قدر اختصار سے کیا گیا ہے ، مگر جن بزرگوں کے حالات زیادہ نہیں مل سکے اور ان کی علمی و فقہی سرگرمیوں کا ذکر تاریخ و رجال کی کتابوں سے فراہم نہیں ہو سکا ، ان کا ذکر متعلقہ حروف تہجی کے ذیل میں " بعض دیگر فقہائے کرام " کے عنوان سے ضبطِ کتابت میں لایا گیا ہے ، ان کی تعداد ۵۵ تک پہنچتی ہے ۔ اس اعتبار سے یہ جلد ۱۵۵ فقہائے رفیع المرتبت کے حالات پر محیط ہے ۔ ترتیب کے لحاظ سے سلسلۂ فقہائے ہند کی یہ آٹھویں جلد ہے ۔

۹ ۔ فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری (جلد دوم) باعتبار ترتیب کے یہ سلسلۂ فقہائے ہند کی نویں جلد ہے جو ۱۹۸۴ء میں منزلِ طباعت سے گزری اور اس کے کل صفحات ۲۸۰ ہیں ۔ یہ جلد فقط حرف ع پر مشتمل ہے ۔ اس میں ۴۶ فقہا کا تذکرہ تو خاصی تفصیل سے آگیا ہے ، لیکن جن حضرات کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے ، صرف یہ پتا چل سکا ہے کہ ان کے اسمائے گرامی فقہائے برصغیر کی وسعت پذیر فہرست میں شامل ہیں ، ان کی تعداد ۳۶ ہے ۔ اس حساب سے یہ جلد ۸۲ علما و فقہا کے حالات و کوائف کو اپنے دامنِ صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے ۔

۱۰ ۔ فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری (جلد سوم) یہ جلد جو دراصل اس سلسلے کی دسویں جلد ہے اور ۵۰۴ صفحات پر محتوی ہے ۔ اس میں ۱۳۳ فقہائے کرام کے واقعاتِ حیات تو کافی مفصل صورت میں مذکور ہیں ، البتہ ان کے علاوہ آٹھ بزرگ وہ ہیں جن کے بارے

ین اصحابِ تذکرہ و رجال نے صرف یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ اپنے دور کے ممتاز فقیہہ تھے، مگر ان کی فقہی سرگرمیوں کا تفصیلی علم نہیں ہو سکا۔ ان کے اسمائے گرامی اس جلد میں چند سطروں کے تعارف کے ساتھ " دیگر فقہائے کرام " کے عنوان کے تحت درج کیے گئے ہیں۔ یہ ہماری مجبوری ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس طرح یہ جلد ۱۴۱ فقہائے عظام کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔

پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری کے اختتام تک پھیلی ہوئی یہ دس جلدیں تین ہزار چھ سو پچاس صفحات کو محیط ہیں اور ان میں برصغیر کے پندرہ سو چورانوے فقہا و علما کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں اور ان کی علمی و فقہی اور تدریسی و تصنیفی سرگرمیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ہر جلد کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں متعلقہ صدی کے حکمرانوں اور ملوک و سلاطین کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ حکمران اپنے دور کے اہلِ علم اور اصحابِ فقہ سے کس درجے تعلقِ خاطر رکھتے تھے اور ان کے نزدیک ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔ نیز یہ کہ خود ان بوریا نشین فقہا اور درویش منش علما کو ان حکمرانوں کی کتابِ حیات کے کن کن اوراق سے بربنائے للّٰہیت اختلاف یا اتفاق تھا اور اس کے اظہار کے لیے وہ کیا لب و لہجہ اختیار کرتے تھے۔ یہ مقدمات متعلقہ عہد کے بہت سے پہلوؤں کو گھیرے ہوئے ہیں۔

سلسلۂ فقہائے ہند کی ان دس جلدوں میں جن علمائے عظام کی تگ و تاز گوناگوں کو حیطۂ تسوید میں لایا گیا ہے، ان میں ہر مسلکِ فقہ کے لائق تکریم حضرات شامل ہیں۔ حنفی بھی اور شافعی بھی، مالکی بھی اور حنبلی بھی، شیعہ بھی اور اہلِ حدیث بھی۔ احناف کی تعداد البتہ بہت زیادہ ہے۔ جن حضرات کی جن مساعیٔ علمی تک رسائی ہو سکی ہے، اسے بلا کم و کاست حوالۂ قرطاس کر دیا گیا ہے۔

قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں گے کہ بحمد اللہ ہم نے بزرگانِ دین اور فقیہانِ بلند مرتبت کی خدماتِ عالیہ کا تذکرہ کرتے وقت ہر بزرگ کے احترام و اکرام کو پوری طرح ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور واضح لفظوں میں بتایا ہے کہ کون بزرگ کس مسلک سے وابستہ تھے اور میدانِ علم و عمل میں انھوں نے کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

ہمارے نزدیک تمام مسالکِ فقہ کے اہلِ علم ہم سب کی مشترکہ میراث اور متاعِ بے بہا ہیں۔ ان سے استفادہ کرنا اور ان کی علمی و فکری مساعی کو نمایاں کرنا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔

یہاں یہ عرض کر دیں کہ فقہائے ہند کی ان دس جلدوں کی تحریر و تصنیف میں ہمارے چودہ سال صرف ہوئے۔ ان کی تصنیف کے علاوہ اس عرصے میں ہم نے اور بھی متعدد خدمات انجام دیں۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ترجمان ماہانہ "المعارف" کی ادارت ہمارے سپرد ہے جو ایک مستقل کام ہے۔ "المعارف" کے لیے خالص علمی و تحقیقی مضامین فراہم کرنا، ان کا ایک ایک لفظ پڑھنا، اپنی پالیسی کے مطابق کتابت و طباعت کے لیے ان کا انتخاب کرنا، کتابت کے بعد ان کی پروف ریڈنگ کرنا اور ان کو خاص انداز سے ترتیب دینا نہایت ذمہ دارانہ کام ہے جو انتہائی محنت اور توجہ چاہتا ہے۔ اللہ کا بے پایاں احسان ہے کہ اس نے ان تمام امور کی انجام دہی کے لیے اس بندۂ عاجز کو ہمت و توفیق کی نعمتِ عظمیٰ سے حصۂ وافر عطا فرمایا۔ آئندہ کے لیے بارگاہِ ایزدی سے عاجزانہ دعا ہے کہ اللھم وفقنا لما تحب و ترضیٰ۔

اس موقعے پر ہم فخر و مباہات کے طور پر نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کناں ہیں کہ بتوفیق خداوندی ہمارا ذہن ہمیشہ جادۂ صواب پر رہا ہے اور ہم نے اپنی دانست میں انتہائی احتیاط و توازن سے قلم کو حرکت دینے کی سعی کی ہے۔ تاہم اگر کہیں سہواً نوکِ خامہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گئی ہو تو ہم انتہائی عجز سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں معافی کے لیے اپنا دامن پھیلاتے ہیں اور جن حضرات کو ہماری کسی تحریر سے ذہنی اذیت پہنچی ہو، ان سے معذرت خواہ ہیں۔

یہاں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ ان دس جلدوں میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمارے نزدیک حرفِ آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے بہت سے فقہا و علما کے حالات تک ہماری رسائی نہ ہو سکی ہو یا بعض بزرگوں کے بارے میں ہمیں کم معلومات میسر آئی ہوں اور تفصیل ہماری نظروں سے اوجھل رہی ہو۔

یہ جو کچھ بھی ہے معزز قارئین کے سامنے ہے۔ ہمارے علم و مطالعہ کے مطابق اس موضوع کی یہ پہلی کوشش ہے۔ جن اصحاب کا دائرۂ معلومات اس باب میں زیادہ وسیع ہے، وہ اگر ہماری رہنمائی کے لیے وقت نکالیں گے اور ہماری لغزشوں سے مطلع فرمائیں گے تو ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔ ان کے نام اور ان کے فراہم کردہ معلومات کے حوالے سے اپنی لغزشوں کا اعتراف کریں گے اور ان کے لیے اللہ کے حضور دعا گو ہوں گے۔

"فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری" کی جلد اوّل کا مقدمہ آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کے سانحۂ وفات پر ختم ہوا تھا۔ دوسری جلد کے مقدمے میں ۱۸۵۷ء سے بعد کے حالات، وہابی مقدمات، کالے پانی کی سزائیں، ۸۔ فروری ۱۸۷۲ء کو کالا پانی میں وائسرے ہند لارڈ میو کے قتل اور وہابی قیدیوں پر اس کے ردِّ عمل وغیرہ امور کی صراحت کی گئی تھی۔ اب اس کے بعد کی چندان تحریکوں کا ذکر کیا جائے گا جو ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص مسلمانوں کے علمی و ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے شروع کی گئی تھیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اختصار کے ساتھ سر سید احمد خاں اور ان کی عملی مساعی کا جائزہ لیا جائے گا۔

سر سید احمد خاں

سر سید احمد خاں کی ولادت ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے دادا جواد الملک سید ہادی تھے جو مغل حکمران شاہ عالم کے عہد میں صوبہ شاہجہاں آباد کے محکمۂ احتساب اور قضاۂ لشکر کے منصب رفیع پر فائز تھے۔ والد کا اسم گرامی میر محمد متقی تھا میر محمد متقی آزاد منش آدمی تھے اور معاملاتِ دنیوی سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں اس دور کے معروف بزرگ شاہ غلام علی مجددی دہلوی کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ ان کی خدمت و صحبت میں رہنا اور ان سے استفادہ کرنا ان کے اصل مشاغل تھے۔

سر سید احمد خاں کے نانا کا نام نامی خواجہ فرید الدین احمد تھا جنھیں مغل حکومت کی طرف سے دبیر الدولہ، امین الملک، خان بہادر اور مصلح جنگ کے خطابات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسہ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ پھر اکبر شاہ ثانی کے وزیر مقرر ہو گئے تھے۔ بہت نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ علم و فہم اور سیاست و تدبّر میں مشہور تھے۔ مشکل اور الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ سر سید کی زندگی کا دورِ آغاز ننھیال کے اسلوبِ زیست سے بھی متاثر ہوا اور ددھیال کے طرزِ حیات سے بھی۔

حکومت و اقتدار کے اعتبار سے برصغیر کے مسلمانوں کا یہ دورِ زوال تھا، لیکن علم و عرفان اور معرفت و ادراک کے لحاظ سے دلّی کا ستارہ عروج پر تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کے افق پر اشاعتِ مذہب اور تبلیغِ علومِ اسلامی کے دو عظیم الشان مرکز جلوہ گر ہیں۔ ایک شاہ عبد العزیز

کا مدرسہ جسے مذہبی و دینی علوم کا گہوارہ کہنا چاہیے، اور دوسرا مرکز شاہ غلام علی مجددی کی خانقاہِ تصوف و طریقت کا۔

سر سید کے ننھیال شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے دامنِ عقیدت سے وابستہ تھے اور ان کے والد میر محمد تقی کا شاہ غلام علی سے باقاعدہ تعلقِ ارادت تھا۔ اس بنا پر سر سید نے فیض کے ان دونوں سرچشموں پر حاضری دی اور ان سے خوب سیر ہوئے۔

سر سید کا نام احمد ان کے والد کے مرشدِ عالی قدر شاہ غلام علی نے رکھا تھا اور ان کی تقریب بسم اللہ بھی انہی کے دستِ حق پرست سے ہوئی تھی۔ شاہ صاحب ممدوح سے سر سید کو بے حد عقیدت تھی۔ اپنے والد کے ساتھ بھی وہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے استفاضہ کرتے تھے۔ تنہا بھی ان کے ہاں ان کی آمد و رفت اور ان سے فیض یابی کا سلسلہ جاری تھا۔

سر سید نے قدیم طریقِ تعلیم کے مطابق حصولِ علم کیا۔ طب بھی باقاعدہ پڑھی اور ریاضی میں بھی نامور ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد "صدر امین" کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۸۴۱ء میں منصفی کے امتحان میں شامل ہوئے اور اس میں کامیاب رہے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک دہلی کے منصف کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس اثنا میں مختلف اساتذہ سے مزید تحصیل علم کے مواقع میسر آئے۔ انھوں نے جولائی ۱۸۷۶ء تک پینتیس سال ملازمت کی اور اس اثنا میں دہلی، بجنور، مراد آباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس میں اقامت گزیں رہے۔

تصنیفی خدمات

پینتیس سالہ ملازمت کے دوران اور اس کے بعد سر سید نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین، تسہیل فی جر الثقیل، انتخاب الاخوین یعنی قواعدِ دیوانی کا خلاصہ، اسبابِ بغاوتِ ہند، آثار الصنادید، تبیین الکلام، رسالہ طعام اہلِ کتاب، خطبات احمدیہ، تفسیر قرآن نیز سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کے عقائد و افکار کی تائید میں کئی کتابیں لکھیں جن میں راہِ سنت در ردِ بدعت اور کلمۃ الحق شامل ہیں۔

سر سید کی بعض تصانیف میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اور اس کا اظہار متعدد اہلِ علم نے ان کی زندگی میں بھی پُر زور الفاظ میں کیا اور بعد میں بھی اب تک ہو رہا ہے۔

اشاعتِ تعلیم کے لیے تگ و تاز

تصنیف و تالیف کے علاوہ اشاعتِ تعلیم کے سلسلے میں سرسید نے جو تگ و تاز کی اس کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے سرکاری ملازمت کے دور میں ۱۸۵۹ء کو مراد آباد میں فارسی کا مدرسہ قائم کیا۔ ۱۸۶۲ء کو غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۶۴ء کو غازی پور ہی میں ایک مدرسہ جاری کیا، جس میں انگریزی، اردو، عربی اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ بعد میں یہ مدرسہ وکٹوریہ ہائی سکول کے نام سے موسوم ہوا۔ علی گڑھ میں جس مدرسے کا آغاز کیا تھا، اس کا انتظام و انصرام مولوی سمیع اللہ خاں کے ہاتھ میں تھا۔ جولائی ۱۸۷۶ء کو جب سرسیدؒ پنشن پا کر علی گڑھ آگئے تو اس کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یہ مدرسہ ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا ۸۔ جنوری ۱۸۷۷ء کو کالج کی شکل اختیار کر گیا۔

قومی غیرت و حمیت کی انتہا

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سرسید انگریزی حکومت کے حامی نہ تھے، انگریزی تعلیم کے حامی تھے اور اس کے حصول کا فتویٰ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی دیا تھا علمائے کرام نے سرسیدؒ کی جو مخالفت کی ہے اور جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اس کا تعلق سرسید کے اس نقطۂ نظر سے ہے، جس کا اظہار اُنھوں نے جنات، ملائکہ اور معجزات وغیرہ سے متعلق کیا ہے۔ اس سے اختلاف اس وقت بھی صحیح تھا، اب بھی صحیح ہے۔ لیکن اس ضمن میں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ سرسیدؒ کا مقابلہ عیسائیوں سے تھا جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں انتہائی بغض و عناد رکھتے اور اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ممکن ہے ان کا نقطۂ نظر پانچ چھ فی صد مسائل میں تاویل کر کے پچانوے فی صد اسلام کا تحفظ کرنا ہو، اور جن اہل علم کا سابقہ علمی میدان میں غیر مسلموں سے رہا ہے، ان میں سے بعض حضرات ایسا کرتے رہے ہیں۔ بہر حال معاملہ کچھ بھی ہو، سرسید نے مذہبی مسائل کی توضیح و تبیین میں جہاں جہاں ٹھوکر کھائی ہے، اس میں ان کے موقف کو قرینِ صحت نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

قومی معاملات و مسائل کے بارے میں سرسید نہایت غیور اور انتہائی نازک مزاج تھے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ان کے سامنے بپا ہوا تھا، مسلمانوں کی حکومت کو ختم ہوتے ہوئے اُنھوں نے

اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسلامیانِ ہند کی غیرت و حمیت کو جو شدید اجتماعی صدمہ پہنچا تھا، اس کے وہ عینی شاہد تھے۔ اس صورتِ حال سے وہ بدرجۂ غایت متاثر و متالم اور غمگین تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے زوردار قلم نے مغموم و محزون لہجے میں اس وقت "اسباب بغاوت ہند" لکھی جب پورا ملک پھانسی گھر بنا ہوا تھا اور جگہ جگہ اس کے پھندے لٹک رہے تھے اور لوگوں کی گردنوں میں پیوست ہو رہے تھے۔ جب ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک شبلی کے الفاظ میں "کورٹ مارشل کے ہیبت شعلے بلند تھے"۔

سرسید انگریز کے ہاتھوں باشندگانِ ملک کی سبکی برداشت نہ کر سکتے تھے اور صرف اس بنا پر آگرہ کے دربار سے برہم ہو کر چلے آئے تھے کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجے پر نہ تھیں۔

سر ولیم میور نے جو کسی زمانے میں یوپی کا لیفٹیننٹ گورنر تھا، "لائف آف محمد" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں اسلام اور آں حضرت کے خلاف نہایت گستاخانہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ سرسید نے "خطبات احمدیہ" کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ وہ لائف آف محمد کو پڑھ کر کس درجے کبیدہ خاطر ہوئے، اس کے مطالعے سے ان کے جذبات کو کتنی اذیت پہنچی اور اُن کا احساس کتنا زخمی ہوا، اس کا اندازہ ان کے اس خط سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے نواب محسن الملک کے نام ۲۰۔ اگست ۱۸۶۹ء کو لندن سے لکھا۔ اس طویل خط کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے اور پھر اسلام سے متعلق ان کی محبت کی داد دیجیے۔ لکھتے ہیں:

> ان دنوں میں ذرا دل کو شورش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت کے حال میں لکھی ہے، اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جاوے۔ اگر روپیہ خرچ ہو جاوے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاوے گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔

مارا ہمیں تمغۂ شاہنشاہی بس است[۱]

نواب وقار الملک کا کسی زمانے میں ایک ایسے افسر سے سابقہ پڑا جو کچہری کے اوقات میں نماز پڑھنے میں معترض ہوتا تھا۔ سر سید کو اس صورت حال کا پتا چلا تو انھیں ۹۔جنوری ۱۸۷۵ء کو ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا!

نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے، جس طرح خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں، لیکن کوئی شخص اگر یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا - یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی - میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنے کا صرف گناہ ہے، جس کے بخشے جانے کی توقع ہے - اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرتا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی، اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا کیسا؟ "حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں" کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفیٰ دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادرِ مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی - کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے سے مر جاتے - نہایت اچھا ہوتا[۲]

قومی اور اجتماعی کاموں میں مال خرچ کرنا سر سید کے نزدیک ضروری تھا۔ اس سے پہلو تہی کرنے والوں کو نہایت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے - ایک دوست کو اس ضمن میں لکھتے ہیں -

اپنے ضروری کاموں کے لیے تنگیٔ اخراجات کا عذر، میں اپنے خیال کے مطابق مہمل سمجھتا ہوں۔ پس تم پر کیسی ہی تنگی ہو اور آمدنی اخراجات کو کافی نہ ہو اور ہر مہینے قرض ہوتا جاوے، ایسے امور میں میں ان باتوں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتا - دُنیا کا کارخانہ اسی طرح لشتم پشتم چلا جاتا ہے۔ بجز ان لوگوں کے جو اپنی زندگی کا مقصود

۱؎ مکتوبات سر سید ص: ۶۲

۲؎ مکتوبات سر سید ص: ۲۳۰

گنج قارون جمع کرنا سمجھتے ہیں اور جس قدر جمع ہو جاوے بس نہیں کرتے۔ اور زیادہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا مجھ کو اور تم کو ایسا نہ کرے۔[۳]

سرسید کے خطوط نہایت نہایت دلچسپ ہیں اور ان میں بڑی پتے کی باتیں لکھی گئی ہیں۔ ان سے ایک شخص نے بذریعہ خط استفسار کیا کہ اگر نماز میں قرآن مجید کے الفاظ کے بجائے صرف ان کا ترجمہ پڑھ لیا جائے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں؟ اس کے خط کا جواب مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا:

"مخدومی!

نماز میں قرآن مجید بلفظہ نہ پڑھنے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی"۔[۴]

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا سرسید انگریزی اقتدار کے ہرگز حامی نہ تھے، انگریزی تعلیم کے حامی تھے۔ اس کی بنیادی وجہ اس تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو منازل ارتقا سے روشناس کرانا اور اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں ان کو راہِ تقدم پر گامزن کرنا تھا، اور اُس دور میں یہ ضروری تھا۔

یہاں یہ حقیقت ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس زمانے میں وہابی کو انگریزی حکومت کا باغی سمجھا جاتا تھا اور وہابیت کو بغاوت کے مترادف قرار دیا جاتا تھا، لیکن سرسید اپنے آپ کو دھڑلے سے وہابی کہتے تھے۔

مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید بریلوی کی تحریک کے وہ موید تھے، جب کہ انگریزی حکومت اس تحریک کی سخت مخالف تھی اور اس کے پیروکاروں پر بغاوت کے مقدمے قائم کرکے اُنھیں کالا پانی اور پھانسی کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس سلسلے کے پانچ مشہور وہابی مقدمات کی تفصیل "فقہائے پاک وہند تیرھویں صدی ہجری" کی جلد دوم کے مقدمے میں بیان کی جا چکی ہے۔

آثار الصنادید میں اُنھوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا اسماعیل شہید اور سید

---

[۳] موج کوثر ص: ۱۱۰

[۴] مکتوباتِ سرسید ص: ۶۶۹

احمد شہید کا تذکرہ محبت و عقیدت سے بھرپور الفاظ میں کیا ہے۔

ہندوستان میں کانگریس انگریزوں نے قائم کی تھی۔ اس کا مقصد اس ملک کے باشندوں کو جمہوریت کی ان اقدار سے متعارف کرانا تھا جو برطانیہ میں رواج پذیر تھیں اور اس کے ذریعے انھیں کچھ مراعات سے نوازنا تھا۔ لیکن سرسید نے اس کے بعض پہلوؤں کی شدید مخالفت کی۔ اگر وہ انگریز کے حامی ہوتے تو اس عہد میں کانگریس کے خلاف قلم و زبان کو حرکت میں نہ لاتے۔ یاد رہے، سرسید کے زمانے میں کانگریس کا پروگرام برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کرنا اور اس مقصد کے لیے اس سے پنجہ آزما ہونا نہ تھا۔ بلکہ انگریز کے بتائے ہوئے طریقے اور اس کی ہدایات کے مطابق مودبانہ الفاظ میں اس کی خدمت میں کچھ مطالبات پیش کرنا تھا۔ اور سرسید کو اس سے اتفاق نہ تھا۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ "اسباب بغاوت ہند" ہندوستان کی سیاست پر پہلی کتاب تھی، جس کی تلخ نوائی نے برطانوی حکومت کے حلقوں میں ایک تہلکہ بپا کر دیا تھا اور بڑے بڑے انگریز منصب دار اس کی اشاعت کے بعد اہل ہند کے سیاسی اور اجتماعی مسائل کو غور و فکر کا ہدف قرار دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ کتاب ۱۸۵۹ء میں یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے صرف دو سال بعد شائع ہوئی تھی۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی عام بغاوت کا اصل ذمے دار انگریزی حکومت اور ہندوستانیوں کے بارے میں اس کے طرزِ عمل کو قرار دیا گیا ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ممکن ہے اس کتاب سے انگریزوں کی اثر پذیری کا نتیجہ ہو۔

سرسید احمد خاں نے اسّی سال سے زائد عمر پا کر ۲۷۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی۔ مرض الموت میں حالتِ ہذیان طاری ہونے سے پہلے قرآنِ مجید کی یہ آیات ان کی زبان پر جاری رہیں۔

حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ہ

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ہ

آئینی اصلاحات کا سلسلہ

ہندوستان میں گورنر جنرل کی کونسل سب سے پہلے ۱۸۵۴ء میں بنائی گئی تھی، جب کہ اس ملک

پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی، لیکن اس کونسل میں کوئی ہندوستانی ممبر نہ تھا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تو اس کے اثرات انگلستان کی پارلیمنٹ تک پہنچے۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء میں آئینی اصلاحات کا پہلا قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے گورنر جنرل کی کونسل میں تین ہندوستانی ممبر بذریعہ نامزدگی لینا منظور کیے گئے۔

اس کے بعد ملک کے بعض صوبوں میں چند نیم سیاسی جماعتیں معرضِ وجود میں آئیں۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال میں "انڈین ایسوسی ایشن" قائم ہوئی اور ۱۸۸۴ء میں مدراس میں "مہاجن سبھا" کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۸۴ء ہی میں "انڈین نیشنل یونین" قائم کی گئی۔ اسی سال ایک انگریز مسٹر ہیوم نے ہندوستان کے باشندوں میں سیاسی شعور کو تیز کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن تھا۔ ہیوم اس کے پاس کچھ تجاویز لے کر گیا، جن کا مفاد یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں اصلاحِ رسوم اور اصلاحِ تمدن کی ایک انجمن کی طرح ڈالیں۔ لیکن لارڈ ڈفرن نے اس کی تجاویز سن کر کہا کہ اس ملک میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو انگلستان کی طرح حکومت کے خلاف کام کرتی ہو۔ چوں کہ انگریزوں کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے اور ان کی حکومت کے بارے میں ہندوستانی کیا رائے رکھتے ہیں، اس لیے یہاں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو اس خلا کو پُر کرے۔ حاکم اور محکوم دونوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستان کے باشندے ہر سال اپنا ایک اجتماع کر کے حکومت کو یہ بتانے کا اہتمام کریں کہ اس کے نظامِ حکومت میں کہاں کہاں نقائص ہیں اور انھیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے اور ملک کی حالت کس صورت میں زیادہ سے زیادہ بہتر ہو سکتی ہے۔

اپنی بات ختم کر کے لارڈ ڈفرن نے ہیوم سے کہا کہ جب تک وہ اس ملک کا وائسرائے ہے، اس تجویز کا اظہار کسی سے نہ کیا جائے۔ چنانچہ جب تک ڈفرن ہندوستان کا وائسرائے رہا، ہیوم نے اس کی یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔ جب وہ اپنی مدت ختم کر کے ہندوستان سے چلا گیا تو ہیوم اس کے بعد انگلستان گیا اور اس مسئلے سے متعلق وہاں کے متعدد لیڈروں سے بات کی۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

انگلستان میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ہندوستان میں ایک جماعت قائم کی جائے۔ چنانچہ ہیوم نے ہندوستان واپس آ کر ملک کے مختلف لوگوں سے مشورہ کیا اور

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں ہوا۔
اس وقت حکومت سے کانگریس کا اس درجے قریبی تعلق تھا کہ ہیوم نے وائسرائے ہند
سے مل کر یہ کوشش کی کہ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت ملک کے کسی صوبے کے انگریز گورنر کو
کرنی چاہیے۔ لیکن وائسرائے نے اس تجویز کو اس لیے عمل میں نہ آنے دیا کہ گورنر کی موجودگی میں لوگ
آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکیں گے۔

انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ لندن میں بھی قائم کی گئی تھی، جس کا صدر وہاں کا ایک انگریز
سر ولیم وڈیرن تھا جو صوبہ بمبئی میں سول سروس کا ایک بڑا افیسر رہ چکا تھا۔ اس واقعہ کے بعد انتیس
سال یہ شخص زندہ رہا اور عمر بھر کانگریس کی خدمت کو اس نے اپنا معمول بنائے رکھا۔ اس کو ملازمت
کی ایک ہزار پونڈ سالانہ پنشن ملتی تھی۔ یہ تمام رقم وہ کانگریس کے کاموں میں خرچ کر دیتا تھا۔ ۱۸۸۹ء
میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں ہوا تھا، جس کی صدارت اسی نے کی تھی اور اس کے لیے وہ
انگلستان سے آیا تھا۔ کانگریس کا یہ وہ دور تھا جس کی سر سید نے مخالفت کی تھی۔ بہت بعد میں
آہستہ آہستہ کانگریس نے اپنی حیثیت بدل لی تھی اور انگریزی حکومت کے خلاف اس نے بہت
بڑا محاذ قائم کر لیا تھا جس کا نتیجہ آزادیِ وطن نکلا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزی حکومت نے بے حد
اذیتوں میں مبتلا کیا۔ دہلی کی علمی رونق اجڑ گئی اور وہاں کے مدارس کو شدید نقصان پہنچا۔ اس صورتِ
حال سے متاثر ہو کر بعض سر کردہ حضرات نے دیوبند (ضلع سہارن پور) میں عربی علوم کا ایک دارالعلوم
قائم کرنے کا عزم کیا۔ ۱۵۔ محرم ۱۲۸۳ھ (۳۰۔ مئی ۱۸۶۶ء) کو بروز پنجشنبہ چھتے کی پرانی مسجد کے
صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں بغیر کسی رسمی تقریب اور نمائش کے نہایت
سادگی کے ساتھ دارالعلوم کا افتتاح ہوا۔ ملا محمود دیوبندی کو جو اس زمانے میں میرٹھ میں مدرس تھے
اور بلند پایہ عالم تھے، مدرس مقرر کیا گیا۔ محمود حسن جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے نام سے
مشہور ہوئے، اس دارالعلوم کے اولین طالب علم تھے، جنھوں نے افتتاح کے موقعے پر استاد
کے سامنے کتاب کھولی۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا پہلا استاد بھی محمود تھا اور پہلا

شاگرد بھی محمود ۔!

دار العلوم دیوبند کے افتتاح کے وقت اللہ پر توکل اور اس کے کرم کے سوا کوئی ظاہری ساز و سامان نہ تھا ۔ پُر خلوص داعیہ، خدمتِ دین کا جذبہ اور اللہ پر بھروسہ ہی بانیانِ دار العلوم کی کل کائنات تھی ۔ نہ وسیع و عریض جگہ تھی، نہ عمارت اور نہ اساتذہ اور طلبا کی کوئی بڑی جماعت ۔ صرف ایک طالبعلم اور ایک استاد ۔! یہ حالت تھی اس ادارے کی جو اپنی خدماتِ گوناگوں کی بنا پر آج پوری دُنیا میں مشہور ہے ۔

اکابر دار العلوم کی جانب سے قیام دار العلوم کے موقعے پر جو اعلان شائع کیا گیا، وہ درج ذیل ہے اور جن حضرات کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا، ان کے اسمائے گرامی اعلان کے نیچے درج ہیں ۔

"الحمد للہ دیوبند میں اکثر اہلِ ہمت نے جمع ہو کر کسی قدر چندہ جمع کیا اور ایک مدرسہ عربی پندرہ تاریخ محرم ۱۲۸۳ھ سے جاری ہوا، اور مولوی محمد محمود صاحب بالفعل بمشاہرہ پندرہ روپیہ ماہوار پر مقرر ہوئے ۔ چوں کہ لیاقت مولوی صاحب کی بہت کچھ ہے اور تنخواہ بسبب قلتِ چندہ کے کم ۔ ارادہ مہتممانِ مدرسہ کا ہے کہ بشرطِ وصولِ زرِ چندہ قابلِ اطمینان جس کی امید کر رکھی ہے، تنخواہ مولوی صاحب کی زیادہ کی جاوے اور ایک مدرس فارسی و ریاضی کا مقرر ہو ۔ جملہ اہلِ ہمت و خیر خواہانِ ہند خصوصاً مسلمان سکنائے دیوبند و قرب وجوار دیوبند پر واضح ہو کہ جو لوگ اب تک شریک چندہ نہیں ہوئے، بہ دل شریک ہو کر امداد کافی دیویں، اور واضح ہو کہ سوائے چندہ فہرست ہذا کے جس کی میزان ۱۰۴ روپے آٹھ آنے ہے، دوسرا چندہ واسطے خوراک و مدد خرچ طلبائے بیرون جات کے جمع ہوا ہے اور سولہ طالب علموں کا صرف ہو گیا ہے اور انشاء اللہ روز بروز جمع ہوتا جاتا ہے ۔ اس میں سے طلبائے بیرون جات کو کھانا پکا پکایا اور مکان رہنے کو ملے گا ۔ کتابوں کا بندوبست بھی متعاقب ہوگا ۔ نام مہتممان کے درج ذیل ہیں ۔ جن صاحبوں کو روپیہ چندہ بھیجنا منظور ہو تو بنام ان کے بذریعہ خط بیرنگ ارسال فرما دیویں ۔ رسید ان کی بصیغہ پیڈ بھیجی جاوے گی ۔ فقط

حاجی عابد حسین صاحب ۔ مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی ۔ مولوی مہتاب علی صاحب ۔ مولوی ذوالفقار علی صاحب ۔ مولوی فضل الرحمٰن صاحب، منشی فضل حق صاحب ۔ شیخ نہال احمد صاحب ۔

العبد فضل حق سربراہ کار مدرسہ عربی وفارسی وریاضی۔ قصبہ دیوبند۔

تحریر بتاریخ ۱۹۔ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ ۔ روز دوشنبہ"

یہ حضرات مدرسہ دیوبند کی ابتدائی مجلسِ شوریٰ کے رکن بھی تھے اور اس کے اوّلین معمار بھی۔ ان میں سے مولانا محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست تھے اور حاجی عابد حسین پہلے مہتمم۔

دارالعلوم کا دستور العمل

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دینی مدارس بالخصوص دارالعلوم دیوبند کے قیام وبقا کے لیے جو دستور العمل مرتب اور تجویز فرمایا، اس میں اسلامی دورِ حکومت کے سابقہ طریق کے برعکس عوامی چندے اور جمہوری طرز اختیار کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس دستور العمل کی آٹھ شقیں ہیں۔ مولانا نانوتوی نے بتایا ہے کہ دینی مدارس کے قیام کے وقت ان کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ یہ بنیادی اور ضروری اصول درج ذیل ہیں۔

"۱۔ اصل اوّل یہ ہے کہ تامقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲۔ ابقائے طعامِ طلبا بلکہ افزائشِ طلبا میں جس طرح ہو سکے، خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳۔ مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالف رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو۔ اور اس لیے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیّت نیک اس کو سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو، بہ دل وجان قبول کریں گے۔ اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و

صادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو ۔ اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہل مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا ہو تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے ۔

۴ - یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں ۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں ۔

۵ - خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو، پوری ہو جایا کرے ۔ ورنہ یہ مدرسہ اوّل تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا ۔

۶ - اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک ان شاء اللہ یہ مدرسہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا ، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے ۔

۷ - سرکار کی شرکت اور امرا کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے ۔

۸ - تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسنِ نیت اہلِ چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے ۔"

مولانا نانوتوی کی اس تحریر کو ان کے اصولِ ہشت گانہ کہیے یا دارالعلوم دیوبند کا دستورالعمل قرار دیجیے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نہایت عمدہ اور شاندار باتیں ہیں ۔ اس میں مدارس دینیہ کے لیے سرکاری امداد کے بجائے عوامی چندے کو اہمیت دی گئی ہے تاکہ دین کے یہ گہوارے اور اسلامی علوم کے یہ مرکز سرکاری عمل دخل سے پاک رہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ظاہری شان وشوکت اور آمدنی کے حتمی اور یقینی ذرائع اختیار کرنے سے جو جاگیروں کی آمدنی اور نوابوں اور سرمایہ داروں کی وساطت سے حاصل ہوں، احتراز کیا جائے ۔ یہ وہ ذرائع ہیں جن

جن کے اپنانے سے اللہ کا خوف و رجا ختم ہو جاتا ہے اور رجوع الی اللہ کا سر رشتہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

مظاہر علوم - سہارن پور

رجب ۱۲۸۳ھ (نومبر ۱۸۶۶ء) کو مولانا سعادت علی فقیہہ اور بعض دیگر حضرات کی کوششوں سے سہارن پور میں دینی علوم کا ایک مدرسہ "مظاہر علوم" کے نام سے قائم ہوا۔ اس کے اہتمام و تدریس کی ذمے داریاں مولانا سعادت علی فقیہہ کے سپرد تھیں۔ مولانا ممدوح نے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) کو وفات پائی۔ اس زمانے میں مولانا احمد علی سہارن پوری کلکتہ میں فروکش تھے۔ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) کو وہ کلکتہ سے سہارن پور آگئے اور مدرسہ مظاہر علوم کی تدریس و اہتمام کا سلسلہ بالاتفاق ان کے سپرد کر دیا گیا۔

مدرسہ منظاہر علوم (سہارن پور) میں منقولات اور معقولات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس میں جو حضرات فرائض تدریس سرانجام دینے پر مامور تھے، وہ تمام علوم مروّجہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ اس مدرسے نے بڑی ترقی کی اور بے شمار علما و فضلا اس سے فارغ التحصیل ہوئے جنھوں نے تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کے میدان میں بہت نام پایا۔ یہ مدرسہ اب بھی جاری ہے اور اللہ کے فضل سے اس کی رفتارِ خدمت بہت تیز ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء - لکھنؤ

علی گڑھ، دیوبند اور سہارن پور وغیرہ کے مدارس کے اٹھائیس تیس سال بعد جب کہ ملک میں متعدد قومی تحریکیں جاری تھیں، ندوۃ العلما کے قیام کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کا مقصد علما کی اصلاح تھا جو بہت بڑا کام تھا۔ اس تحریک کے اصل محرک ایک بزرگ مولوی عبد الغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن اس کی تکمیل مولانا شاہ محمد علی کانپوری کے ہاتھوں ہوئی جو مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے۔ ان کی محنت و سعی سے ندوۃ العلما ۱۸۹۴ء کو لکھنؤ میں قائم ہوا۔ وہی اس کے ناظم اوّل مقرر ہوئے۔ اس کے بڑے بڑے مقاصد یہ تھے۔

۱۔ نصاب تعلیم میں اصلاح، قدیم نصاب تعلیم اور علی گڑھ کے جدید طریق تعلیم کے درمیان ہم آہنگی کی ایک قابلِ قبول صورت پیدا کرنا۔

۲۔ علما کے باہمی نزاع ختم کر کے انھیں ایک مرکز پر جمع کرنا۔

۳ - ملک کے سیاسی معاملات سے الگ رہ کر مسلمانوں میں حصولِ علم کا جذبہ پیدا کرنا -

۴ - ایک بڑے دارالعلوم کا قیام، جس کے نصابِ تعلیم کے ذریعے آپس کے مسلکی اختلافات ختم ہو سکیں -

۵ - ایک عظیم الشان لائبریری کا قیام جس میں تمام علوم و فنون کی کتابیں موجود ہوں -

۶ - محکمۂ افتا کا قیام -

اُس دور میں عام طور سے علما پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے مسلکی اختلافات کی بنا پر خود بھی باہم جھگڑتے رہتے ہیں اور لوگوں کو بھی آمادۂ پیکار رکھتے ہیں، لہٰذا ضرورت تھی کہ علما کو مصالحت و مفاہمت پر آمادہ کر کے ان کی آپس کی لڑائی کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ ندوۃ العلما کی اصلاحی تحریک بہت حد تک کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور مشترکہ مقاصد کے لیے مختلف الخیال علمائے کرام ندوۃ العلما کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے، جس سے آپس کے مذہبی نزاعات میں بہت حد تک کمی واقع ہوئی - مولانا شبلی اور صاحب تفسیر حقانی مولانا عبدالحق دہلوی نے اس کے اغراض و مقاصد مرتب کیے۔ سرسید، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور دیگر متعدد اکابر نے اس کے اغراض و مقاصد کو سراہا اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں علما کی اس کوشش کا خیر مقدم کیا -

اس سلسلے میں ندوۃ العلما کے ناظم مولانا محمد علی کے ایک خط کے جواب میں سرسید نے ۲۱- دسمبر ۱۸۹۴ء کو ان کے نام جو مکتوب تحریر فرمایا وہ یہ ہے!

جنابِ مولانا مخدوم مکرم من مولوی محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلما -!

بعد سلام مسنون عرض یہ ہے کہ آپ کا نوازش نامہ اور حصہ اوّل روئداد ندوۃ العلما پہنچا۔ ممنون عنایت ہوا - اس پر ریویو لکھنا اور فرائض ریویو نویسی کو پورا پورا ادا کرنا کسی قدر مشکل اور نامناسب ہے۔ ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے، اس کو چلنے دینا چاہیے۔ خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے۔ میں اس کی رسید اخبار میں چھاپوں گا اور نواب محسن الملک، مولوی سید مہدی علی کانفرنس کے اجلاس میں ایک ریزولیوشن پیش کریں گے اور جو آپ کا ارشاد ہے، اس پیرایہ میں اس کی تعمیل ہو جائے گی۔ اگرچہ مجھ کو کچھ توقع نہیں ہے کہ باہم علما کے اتفاق ہو - الّا کوشش ضرور ہو۔ السلام علیکم [۵۵]

---

۵۵ مکتوبات سرسید ص: ۶۵۱

علمائے کرام کے اتحاد کے علاوہ ندوۃ العلماء کی دوسری بہت بڑی خدمت قدیم نصابِ تعلیم کی اصلاح ہے۔ اپنے دور کی ضرورت اور ماحول کے مطابق جلیل القدر اور ماہر فن علما کے مشورہ و تجویز سے ایک ایسا نصابِ تعلیم ترتیب دیا گیا جو قدیم و جدید کی دو انتہاؤں کے درمیان "وسط" کا درجہ رکھتا تھا۔ مئی ۱۸۹۸ء کو لکھنؤ میں اپنا ایک دارالعلوم قائم کر کے اس نصابِ تعلیم کے مطابق ابتدائی درجوں کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔

یہ نصابِ تعلیم اور طریقِ تعلیم نہایت کامیاب رہا اور ملک کے اہلِ علم نے اس کی تحسین کی۔ مسلمانوں میں مولانا احمد رضا خاں کے سوا شاید کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ انھوں نے اس کے خلاف پُر زور مضامین لکھے اور ندوہ کے مقابلے میں ایک جماعت "مجددہ" قائم کی۔

ہمارے خیال میں کسی علمی کوشش کی مخالفت اور اس پر تنقید اس بنا پر ضروری بھی ہے کہ اس سے بہت سی نئی باتیں سامنے آجاتی ہیں اور اپنے کام میں اصلاح کے مواقع اُبھرتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کے نصابِ تعلیم میں تفسیر قرآن، حدیث و فقہ، عربی ادب اور عربی میں تحریر و تقریر کو خاص طور پر شامل کیا گیا اور علما و طلبا نے انتہائی شوق و توجہ سے اس نصاب کے مطابق اپنی تعلیم مکمل کی اور وہ ہر گوشہ علم اور شعبۂ فن میں ممتاز ہوئے۔ ان میں سے حضرات مرحومین میں سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، ریاست علی ندوی، معین الدین، سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ندوی، ابوظفر ندوی، مسعود علی ندوی اور مسعود عالم ندوی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

بزرگانِ موجودین میں سے مولانا محمد حنیف ندوی[۶] اور سید ابوالحسن علی ندوی کے نام لائق تذکرہ ہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں کہ تصنیف و تالیف کے مختلف دائروں میں جن کی خدمات پر بجا طور سے فخر کیا جا سکتا ہے یا بالفاظِ دیگر کہنا چاہیے کہ ندوۃ العلماء کے محرک و بانی اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور جس جذبے کے تحت اُنھوں نے یہ صحت مندانہ قدم اُٹھایا تھا اس میں اُنھیں کامرانی حاصل ہوئی۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ علما کے دو دھڑوں میں جب اختلاف پیدا ہو جائے تو وہ ختم نہیں ہوتا، قائم رہتا ہے بلکہ روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس اختلاف کے حدود جس قدر وسیع ہوئے ہیں، اسلام اور مسلک کے نام پر ہوتے ہیں۔ گویا اسلام اور ان

۶۔ مولانا محمد حنیف ندوی ان سطور کی تحریر سے گیارہ دن بعد ۱۲۔ جولائی کو فوت ہوئے۔

کے مسلک کا بنیادی مقصد ان حضرات کو اختلاف کی راہ پر لگانا تھا۔ اب صلح کرنا اسلام اور مسلک کے خلاف ٹھہرا۔ (العیاذ باللہ) لیکن ندوۃ العلما کے قیام کا بیڑا اُٹھانے والے حضرات نے کسی ایسی ساعتِ سعید اور نیت خالص کے ساتھ علما کے باہمی اتحاد کا سلسلہ شروع کیا تھا کہ وہ اس میں سو فی صد کامیاب رہے اور اس کے بعد ندوہ میں جو نصاب ترتیب دیا گیا، وہ باقی مدارس برِصغیر کے لیے ایک نمونہ اور مثال ثابت ہوا۔ پھر ندوۃ العلما سے فارغ ہونے والے حضرات نے جو علمی کام کیا، وہ سب مسلمانوں کا مشترکہ کام ہے، اس میں کہیں نزاع یا باہمی اختلاف کے جراثیم نہیں ہیں۔

بعض حضرات ندوہ اور فرزندانِ ندوہ پر سخت الفاظ میں تنقید کرتے ہیں اور تنقید اگر صحت مندانہ ہو تو مفید بھی ہوتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کبھی انھوں نے ندوہ کے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ اس کے بانیوں کے اخلاص اور مصنفین کی کوششوں کے کس قدر شان دار نتائج نکلے اور انھوں نے علم و عمل کے میدان میں کتنی ترقی کی۔

چند الفاظ اس کتاب کے بارے میں

"فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری" کی یہ تیسری جلد ہے جو خوانندگانِ ذی احترام کے زیرِ مطالعہ ہے۔ لیکن ترتیب کے اعتبار سے یہ سلسلۂ فقہائے ہند کی دسویں جلد ہے۔

تیرھویں صدی ہجری کی جلد اوّل ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی تھی اور حروفِ تہجی کی ترتیب سے حرفِ الف سے شروع ہو کر حرفِ ظ پر ختم ہوئی تھی۔

جلد دوم ۱۹۸۴ء میں طبع ہوئی تھی اور اس میں صرف انہی فقہائے اعلام کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کے اسمائے گرامی حرفِ ع سے شروع ہوتے ہیں۔

اب جلد سوم پیشِ خدمت ہے۔ اس کا آغاز حرف غ سے اور اختتام حرفِ ی پر ہوا ہے۔ اس میں ۱۳۳ علما و فقہا کا تذکرہ تو خاصی تفصیل یا کسی قدر

اختصار سے کیا گیا ہے۔ البتہ آٹھ فقہائے گرامی قدر کے حالات نہیں مل سکے، صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ان کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے اصحاب فقہ میں ہوتا تھا۔ ان کا تعارف متعلقہ حروف ہجا میں "چند دیگر فقہائے کرام" کے عنوان سے چند سطروں میں کرا دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ جلد برصغیر کے ۴۱۱ علما و فقہا کے تذکرے پر محیط ہے۔

وما توفیقی الّا باللہ العلی العظیم

بندۂ عاجز
محمد اسحاق بھٹی
۳۔ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ
یکم جولائی ۱۹۸۷ء

غ

۱۔ مولانا غلام امام حیدرآبادی

علمائے ہند میں جن حضرات نے تاریخ، شعروشاعری، حساب و ریاضی اور علم فقہ میں شہرت حاصل کی، ان میں حیدرآباد (دکن) کے مولانا غلام امام کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا مختصر سا نسب نامہ یہ ہے:۔
غلام امام بن منور بن مکارم بن غلام محمد۔ یہ اصلاً افغانی تھے۔ ان کے اسلاف میں سے کسی بزرگ نے افغانستان سے نقل مکانی کرکے حیدرآباد (دکن) میں سکونت اختیار کرلی تھی، اس لیے مولانا غلام امام افغانی حیدرآبادی کہلائے۔ ان کی ولادت ۱۲۲۳ھ کو حیدرآباد میں ہوئی اور وہیں نشوونما پائی۔ ابتدا میں گھڑسواری اور فنِّ حرب میں مہارت پیدا کی۔ پھر بعض امرائے مملکت سے رابطہ قائم کیا اور ماہر حرب ہونے کی بنا پر فوج میں حصول ملازمت کی کوشش کی۔ لیکن ان کی ذہانت و قابلیت کی وجہ سے حیدرآباد کے چند امرائے سلطنت نے ان کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کی ہوچکی تھی۔ چنانچہ ۱۲۴۳ھ میں اُنھوں نے علم صرف کی ابتدائی کتاب "میزان الصرف" پڑھنا شروع کی اور حیدرآباد کے مقامی اساتذہ سے عربی کی کتابیں پڑھیں۔ بعدازاں ریاضی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی تمام درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ شعروشاعری اور تاریخ میں بھی مہارت پیدا کی اور اس میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے۔ تاریخ میں ایک کتاب "رشید الدین خانی" کے نام سے تصنیف کی۔ اپنے اشعار کا ایک دیوان مرتب کیا، جس میں امرائے سلطنت کی مدح؛

توصیف کی اور بہت سے انعامات حاصل کیے۔ بعد ازاں منطق و فلسفے کو موضوع بنایا اور اس ضمن کی تمام درسی کتابیں باقاعدہ مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ کتب تصوّف کی تکمیل بھی ماہر علما سے کی۔ حیدر آباد کے نامور عالم شیخ غلام علی سے اخذِ طریقت کیا۔ ان تمام علوم و فنون میں درک حاصل کرنے کے بعد تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ، اصول فقہ اور علمِ کلام کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی۔ اس وقت وہ کبرسنی کو پہنچ چکے تھے۔ اب اُنھوں نے درس و افادہ کی مسند بچھائی اور اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور بہت سے علما و طلبا نے ان سے اِستفادہ کیا۔

مولانا غلام امام نہایت باہمّت اور صاحبِ عزم عالم تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ رشید الدین خانی اور دیوان شعری کے علاوہ اُنھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

۱۔ خورشید جاہی : تاریخ کی ایک مبسوط کتاب ہے جو ۱۲۸۳ھ میں لکھی۔
۲۔ محی الصلاۃ : یہ فقہ سے متعلق ہے اور حنفی نقطۂ نظر کی کتاب ہے۔
۳۔ ترجمہ کیدانی : یہ بھی فقہ حنفی کے بارے میں ہے۔
۴۔ احسن الترکیب : حکمت و فلسفے کے متعلق ہے۔
۵۔ خورشید دانش : یہ بھی فلسفہ اور حکمت کے موضوع پر ہے۔
۶۔ مائتہ رسائل : اپنے دوستوں کے نام خطوط، جن کی تعداد ایک سو تک پہنچتی ہے۔ یہ خطوط ادب و انشا سے تعلق رکھتے ہیں۔
۷۔ کشف الغوامض : معمّوں کے حل کرنے کے بارے میں
۸۔ مطالع خورشید : علم منطق میں۔
۹۔ تیغ ہندی : لغتِ ہندی کی اصطلاحات سے متعلق۔
۱۰۔ خورشید حساب : فنِ ریاضی میں
۱۱۔ ایک رسالہ علم ہیئت کے موضوع پر
۱۲۔ ایک دیوان شعری۔

بلاشبہ مولانا غلام امام افغانی حیدر آبادی دیارِ ہند کے عظیم عالم تھے اور علوم کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ذہانت و فطانت میں اس نواح کا کوئی شخص ان کا ہم پایہ نہ تھا۔ خط نہایت عمدہ تھا۔ اپنے اوصاف و کمالات کی وجہ سے ہر حلقے میں عزّت و احترام کے مستحق گردانے جاتے تھے۔ امرائے مملکت، عمال حکومت، اصحاب تدریس، ارباب تصوّف، علمائے وقت سب تکریم سے پیش آتے تھے۔ علم کے ساتھ اللہ نے ان کو عمل کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔

اس عالم اَجل اور فاضلِ کامل نے باسٹھ سال کی عمر پاکر ۱۸ رشوال ۱۲۸۵ھ کو حیدر آباد میں انتقال کیا [1]

۲ ــــ مولانا غلام حُسین امیٹھوی

مولانا غلام حسین امیٹھوی تیرھویں صدی ہجری کے جیّد ہندی علما میں سے تھے۔ ان کے والد کا نام نامی محمد عظیم تھا۔ نہایت صالح اور صاحبِ تقویٰ عالم دین تھے۔ شیخ حسن غوری کی اولاد سے تھے اور حنفی المسلک تھے۔ یوپی کے ایک مقام دیوناتہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما کی منزلیں طے کیں۔ اپنے عہد کے نامور عالم شیخ فقیر اللہ قادری سے اکتسابِ علم کیا۔ پھر دہلی گئے، اس زمانے میں دہلی میں شیخ برخوردار لاہوری کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے اور دہلی کے دیگر اساتذہ سے حصولِ علم کیا۔ علم سے فراغت کے بعد علاقۂ اودھ میں وارد ہوئے اور یوپی کے شہر امیٹھی میں اقامت اختیار کی۔ اسی بنا پر امیٹھوی کہلائے۔ امیٹھی مشہور عالم و شیخ احمد عرف میاں جیون کا مسکن تھا، جنھوں نے ۹ ذیقعدہ ۱۱۳۰ھ کو دہلی میں وفات پائی اور بہترین تعلیمی و تدریسی اور تصنیفی خدمات انجام دیں۔

مولانا غلام حسین کچھ عرصہ یوپی کے ایک شہر متھرا میں بھی اقامت گزیں رہے اور

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۴۷، ۳۴۸

وہاں کے لوگوں کو مستفید فرمایا۔
مولانا ممدوح حدیث، فقہ، تصوّف اور دیگر علوم عقلیہ و نقلیہ میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ حقائق و معارف کے بیان و اظہار میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ مسائل فقہ کی وضاحت اس اسلوب سے کرتے کہ سامعین حیران رہ جاتے۔ تصوّف و سلوک کی باتیں بھی مؤثر انداز میں لوگوں کے ذہن نشین کراتے۔ تفسیر و حدیث کی تبلیغ و توضیح میں بھی اس دور میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر پاتا۔
ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بلند پایہ شاعر تھے اور ان کا کلام نہایت عمدہ تھا۔ مسائل فقہ میں ایک منظوم کتاب لکھی جو ان کے دور میں بڑی مقبول ہوئی[۲]۔
اس عالم و فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۳ــــ مولانا غلام حسنین صدیقی قنوجی

ہندوستان کا ایک شہر "قنوج" ہے۔ یہ شہر کسی زمانے میں علما و فضلا کا مرکز تھا۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر میں جو اصحاب علم پیدا ہوئے ان میں مولانا غلام حسنین صدیقی کا اسمِ گرامی قابلِ ذکر ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: غلام حسنین بن حسین علی بن عبدالباسط بن رستم علی بن علی اصغر صدیقی قنوجی ــــ یہ تمام بزرگ علم و فضل میں یکتا اور مسائل فقہ میں مرجع خلائق تھے۔
مولانا غلام حسنین کی ولادت ۱۲۲۱ھ کو ہوئی۔ تاریخی نام "غلام علیم" تھا۔ بعض درسی کتابیں مولانا محمد سعادت خان فرخ آبادی سے پڑھیں جو اپنے عہد اور علاقے کے جلیل القدر عالم تھے اور "متوکل" کے عرف سے معروف تھے۔ ۱۲۳۶ھ میں مفتی فرخ آباد مولانا ولی اللہ بن احمد علی حسینی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے علوم عقلیہ

۲؎ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۱

کی بعض کتابوں کا درس لیا اور تفسیر و حدیث کی مروّجہ کتابیں مکمّل کیں۔ بعد ازاں ارضِ حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے اور ۱۲۵۵ھ میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اسی اثنا میں مکّہ مکرمہ میں شیخ عبداللہ سراج، شیخ شمس الدین شطا اور سیّد عمر آفندی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے مستفید ہوئے۔ مدینہ منورہ میں اس زمانے میں مولانا محمد عابد سندھی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے بھی خوب استفادہ کیا اور کتبِ صحاح اور سننِ مشہورہ کی سند لی۔ قیامِ حجاز کے دور میں تصوّف کی کتابیں بھی پڑھیں۔

وطن واپس آئے تو بڑودہ میں سکونت اختیار کی۔ ان کے جدِّ امجد مولانا عبدالباسط صدیقی قنوجی نے ایک کتاب "منازل الاثناء عشر" تصنیف کی تھی، انھوں نے اس کی ذیل لکھی اور اس پر حاشیہ تحریر کیا۔ یہ کام نہایت محنت اور سرگرمی سے انجام دیا۔

مولانا غلام حسنین قنوجی کا شمار مشہور فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا اور وہ اپنے عصر میں ارضِ ہند کے جیّد عالم، مشہور فقیہ، بہت بڑے صوفی اور ممتاز محقق تھے۔ مسائلِ فقہ میں انھیں جو عبور حاصل تھا، وہ کم ہی لوگوں کو حاصل ہوگا۔ تفسیر اور حدیث میں بھی ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ غرض علومِ عقلی و نقلی میں ان کا مرتبہ بڑا بلند تھا۔ فقہی معاملات میں ان کی تحقیق اور فتوے کو مستند سمجھا جاتا تھا۔

آخر عمر میں پھر سفرِ حجاز پر روانہ ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ واپسی پر جہاز بمبئی کے ساحل پر لگا تو نیچے اُترے اور بیمار پڑ گئے، بمبئی ہی میں وفات پائی۔ حدائق الحنفیہ میں مرقوم ہے کہ "حج کر کے بمبئی میں واپس آئے تو وہاں بیمار رہ کر حدود ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی"۔ دوسرے تذکرہ نگاروں نے سنِ وفات تحریر نہیں کیا۔[۳۱]

---

[۳۱] ابجد العلوم ج ۳ ص ۲۶۵ —— تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۳، ۱۵۴ —— حدائق الحنفیہ ص ۴۸۰، ۴۸۱ —— نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۳۵۲، ۳۵۳۔

۴۔ مفتی غلام حضرت اعظمی لکھنوی

مفتی غلام حضرت اعظمی لکھنوی اپنے عہد کے فاضل بزرگ تھے۔ ان کے والدِ مکرم کا نام محمد غوث تھا ــــــ مفتی صاحب ممدوح تیرھویں صدی ہجری کے بلدۂ لکھنؤ میں ممتاز فقیہ اور بہت بڑے شیخ و عالم کی حیثیت سے معروف تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے جو اس دور میں مجمعِ علما اور مرکزِ فقہا تھا۔ انھوں نے اپنے شہر لکھنؤ کے اساتذہ سے کسبِ علم کیا اور مرتبۂ عالی کو پہنچے۔ علم سے فارغ ہوئے تو لکھنؤ کے منصبِ افتا پر فائز ہوتے او زنا دمِ حیات اس پر فائز رہے۔ افتا کی ذمے داری اپنے اندر بہت سی نزاکتیں رکھتی ہے اور مفتی صاحب موصوف نے ان ذمے داریوں کو پوری طرح نباہا۔ ان کے اخلاص اور فراوانیٔ علم کے باعث لکھنؤ کے اُمرا و وزراان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

مفتی غلام حضرت نے ۱۲۳۴ھ کو وفات پائی۔[۴]

۵ــــ مولانا غلام رسُول ــــ قلعہ میہاں سنگھ

خطۂ پنجاب میں بے شمار علما و محدثین اور صوفیا و فقہا پیدا ہوئے جن کی علمی مساعی اور فقہی کاوشوں سے لاتعداد لوگوں نے استفادہ کیا۔ ان اعاظم رجال میں ایک بزرگ مولانا غلام رسُول تھے جو ضلع گوجرانوالہ کے ایک قصبے قلعہ میہاں سنگھ میں فروکش تھے۔ اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا خاندان کئی پشتوں سے علم و فضل اور تصوّف و صالحیت میں مشہور تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: غلام رسول بن رحیم بخش بن نظام الدین

۴؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۴ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۳

بن بہاء الدین بن محمد اکرم بن حافظ عصمت اللہ بن عبداللہ بن سکندر بن نور محمد بن پیر محمدؒ —
یہ تمام بزرگ اپنے دور کے عالم، فاضل، صوفی اور دیندار لوگ تھے۔ وعظ و نصیحت اور تحقیقِ مسائل میں اس نواح کے باشندے انہی سے رجوع کرتے تھے اور اس اعتبار سے ان کو مرجع خلائق کی حیثیت حاصل تھی۔

مولانا غلام رسُول کے دادا مولوی نظام الدین جو تدیّن و تقویٰ کی دولت سے مالامال تھے، فارسی کے بہت اچھے شاعر بھی تھے، وہ خادم تخلص کرتے تھے، نظامی گنجوی کے "تتبع" میں انھوں نے فارسی مثنوی بھی لکھی تھی جو اُس عہد میں بہت مقبول ہوئی تھی۔

ولادت

یہ خاندان ضلع گجرات کے موضع سکندرپور میں سکونت پذیر تھا۔ وہاں کی سکونت ترک کرکے یہ لوگ ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کوٹ بھوانیداس میں آبسے تھے۔ وہیں ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) میں مولوی غلام رسُول پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے سلسلے میں دو واقعے قابلِ ذکر ہیں۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ مولوی غلام رسُول کے دادا مولوی نظام الدین خادم کے ایک دوست کا نام میاں محمد یوسف تھا جو ضلع گوجرانوالہ کے ایک مقام پیروکوٹ کے رہنے والے تھے، بہت متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، نجاری کا کام کرتے تھے۔ کوٹ بھوانیداس سے پیروکوٹ تقریباً چار میل کے فاصلے پر ہے، میاں محمد یوسف کا یہ معمول تھا کہ وہ ایک دن چھوڑ کر ہر دوسرے دن مولوی نظام الدین سے ملنے کوٹ بھوانیداس آتے تھے۔
مولوی غلام رسُول کے بڑے بھائی کا نام غلام محمد تھا جو طبابت کرتے تھے اور دینی علوم سے بہرہ ور تھے۔ ان کی پیدائش کے بعد میاں محمد یوسف نے مولوی غلام رسُول کے والد مولوی رحیم بخش سے کہا:

"آپ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا، اس کا نام غلام رسول رکھنا۔ یہ عالم باعمل، صوفیِ باکمال، متبع سنّتِ نبوی، مقتدائے انام اور ہادیٔ کتاب و سنّت ہوگا۔ لوگ اس کے علم و عرفان اور مواعظ و نصائح سے استفادہ کریں گے۔"

دوسرا واقعہ جو لائقِ تذکرہ ہے، یہ ہے کہ غلام رسول کی ولادت سے پہلے ان کی ماں نے خواب دیکھا کہ چودھویں رات کا چاند ان کی جھولی میں آگرا ہے اور دُور دُور تک اُس کی روشنی پھیل گئی ہے اور چاند مسلسل بڑھتا جا رہا ہے ـــــــ معبروں سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی تو بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ انھیں ایک ایسا بیٹا عطا فرمائے گا جو صاحبِ ورع و تقویٰ ہوگا اور بہت سے لوگ اس سے مستفید ہوں گے[۵]

عالمِ طفولیت

غلام رسول ابھی عالمِ طفولیت ہی میں تھے کہ ان کے عمل و حرکت سے ایسے آثار نمایاں ہونے لگے جو زہد و اتقا کے سلسلے میں ان کے تابناک مستقبل کی نشان دہی کرتے تھے۔ مثلاً وہ عام بچوں کی طرح کھیل کود کے عادی نہ تھے، اپنے ہم عمر بچوں کو شرارتوں سے روکتے اور گالی گلوچ سے منع کرتے تھے، مزاج میں نرمی اور انکسار کا غلبہ تھا، بڑوں کا احترام بجالاتے اور آگے بڑھ کر ان کو سلام کہتے، والدہ نماز میں مشغول ہوتیں تو خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ جاتے، قرآن مجید پڑھا جاتا تو چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے۔ ان اوصاف کی وجہ سے وہ بچپن ہی "منتقی" مشہور ہو گئے تھے۔ گاؤں کے مسلمان اور ہندو ان کی تعریف کرتے اور اُن کے والد مولوی رحیم بخش سے کہا کرتے کہ آپ کا بیٹا بڑا سعادت مند ہے اور اس کی عادات و اطوار اولیاء اللہ سے ملتی ہیں۔ اس بچے سے لوگوں کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ کوئی بیمار ہو جاتا تو اس سے پانی دم کراتے اور بیمار پر چھڑک دیتے، بعض لوگ مریضوں پر دم کرانے کے لیے اس کو اپنے گھر لے جاتے اور مریض اس کے دم سے واقعی اچھا بھلا ہو جاتا۔ کسی کی کوئی چیز گم ہو جاتی تو اس بچے سے دُعا کرائی جاتی اور چیز کہیں نہ کہیں سے مل جاتی[۶]

---

۵ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۲۲ -

۶ ایضاً ؛ ص ۲۳ ، ۲۴

تعلیم و تربیت

پانچ برس کے ہوئے تو اس زمانے کے دستور کے مطابق قرآن مجید پڑھنے کے لیے ان کو مسجد میں لے جا کر معلّم کے سپرد کیا گیا، لیکن والدین اور معلّم کو نہایت پریشانی ہوئی کہ پڑھنے لکھنے کی صلاحیت سے یکسر عاری اور حفظ و ذکاوت کی نعمت سے ذہن بالکل خالی، بڑی مشکل سے ناظرہ قرآن مجید پڑھا۔ والد انتہائی متفکر کہ جو لڑکا بچپن ہی میں نیک اور پرہیزگار مشہور ہے اور لوگ جسے "متقی" کہتے ہیں، وہ پڑھنے لکھنے کے اوصاف سے تہی دامن ہے۔ توقع کچھ اور تھی، ظہور میں کچھ اور ہی آرہا ہے۔ اس طرح کئی سال گزر گئے ـــــــ ایک دن خود غلام رسول نے خواب دیکھا کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حویلی میں اذان دے رہے ہیں اور اذان کی آواز سن کر لوگ ہجوم در ہجوم ان کی طرف آرہے ہیں۔ صبح ہوئی تو خواب اپنے دادا حافظ نظام الدین خادم کو سنایا۔ انھوں نے تعبیر دی کہ بہت سے لوگ تیرے ہاتھ پر مسلمان ہوں گے۔ اس واقعہ سے چند روز بعد حافظ نظام الدین کو اسہال کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ ایام مرض میں غلام رسول نے ان کی بہت خدمت کی اور حافظ صاحب نے اپنے اس پوتے کو بہت دعائیں دیں۔

اسی اثنا میں ایک بزرگ حضرت کاکا شاہ (جو موضع گڈ کور ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے) کوٹ بھوانیداس میں حافظ نظام الدین سے ملاقات کے لیے تشریف لائے، وہ حافظ صاحب سے قلبی تعلق رکھتے تھے۔ حافظ صاحب نے ان کو بتایا کہ غلام رسول نے میری بے انتہا خدمت کی ہے، میں نے اس کے لیے بارگاہِ خداوندی میں فیض رسانی کی دعا کی ہے۔ اب میرا وقتِ رحلت قریب ہے، میرے بعد اس کی روحانی تربیت اور ظاہری پرورش کا اہتمام آپ کے ذمے ہے، جب تک آپ زندہ ہیں اس کا خیال رکھیں، ایسا نہ ہو کہ یہ لڑکا ضائع ہو جائے ــــ شاہ صاحب نے اس ذمے داری کو نبھانے کا عہد کیا اور فی امان اللہ کہہ کر تشریف لے گئے۔ اس سے دوسرے دن حافظ نظام الدین وفات پا گئے۔

چند روز بعد حضرت کاکا شاہ پھر کوٹ بھوانیداس آئے اور غلام رسول سے ملے۔ گلے لگایا اور کچھ پڑھنے کی تلقین فرمائی، حافظ صاحب کی قبر پر جانے کے لیے بھی کہا۔ دوسرے دن پوچھا، جو کچھ میں نے بتایا تھا، وہ پڑھا؟ عرض کی "حضرت! میں تو وہ الفاظ بھول گیا ہوں" شاہ صاحب نے ہنس کر فرمایا: "حافظہ ندارد" پھر انھیں اپنے پاس بلا کر فرمایا "تم میرے دوست کے پوتے ہو اور تمھارے بارے میں انھوں نے مجھے خاص طور سے وصیت کی ہے" — یہ کہہ کر غلام رسول کے سینے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: "برخوردار! کہو اَللّٰھُمَّ بَارِكْ فِیْ عِلْمِیْ وَعَمَلِیْ - رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ——— اس وقت غلام رسول کی عمر بارہ برس تھی[57]۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں کوٹ بھوانیداس میں متعدد اہل علم اور ارباب تصوف سکونت پذیر تھے اور مولوی نظام الدین کی وجہ سے بہت سے صلحا و اتقیا کی وہاں آمد و رفت تھی، اسی بنا پر مشہور تھا:

کوٹ بھوانیداس دا بغداد اے پنجاب دا

بہرحال کچھ دن کاکا شاہ صاحب کوٹ بھوانیداس میں مقیم رہے، جانے لگے تو غلام رسول دور تک اُن کے ساتھ گئے۔ رخصت ہوتے وقت فرمایا: "بیٹے! میں جب بھی تمھیں بلاؤں، مجھے ضرور ملنا، جس طرح بھی ہو سکے کتابیں پڑھ لو، زیادہ محنت کرنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود تمھاری حفاظت کرے گا، وہی تمھیں کتابیں اور اُن کے مضامین حفظ کرائے گا۔ محنت و مشقت جس قدر ہو سکے یادِ خدا میں کرو"، اس کے بعد دعا کی اور تشریف لے گئے[58]۔

مولانا غلام رسول فرماتے ہیں، جس دن شاہ صاحب نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا کی تلقین کی تھی، اس دن کے بعد میری یہ کیفیت ہو گئی کہ اگر میں نے کسی کتاب کے

---

[57] سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۲۵ تا ۲۷

[58] ایضاً، ص ۲۹۔

سوصفحات کا بھی مطالعہ کیا ہے تو کتاب کے الفاظ اگر تمام و کمال یاد نہیں رہے تو مطالب ضرور ذہن میں محفوظ ہو گئے۔[۹]

اب اللہ نے حصولِ علم کے لیے ان کا سینہ کھول دیا اور وہ باقاعدہ طلبِ علم کی راہوں پر گامزن ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذکرِ الٰہی اور وظائف و اوراد کو بھی اپنا معمول ٹھہرا لیا۔ یعنی علم ظاہری اور علم باطنی دونوں کے لیے کمر ہمت باندھ لی اور اللہ نے دونوں میں حصۂ وافر عطا فرمایا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

حضرت کاکا شاہ صاحب کے تشریف لے جانے سے چند روز بعد غلام رسول گاؤں سے چلے اور لاہور آ گئے۔ وہاں بازار حکیماں کی لال مسجد میں موضع بگہ[۱۰] کے مولانا غلام محی الدین بگوی کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور باقاعدہ حصولِ علم کا آغاز کیا۔ دو مہینے بعد خواب میں حضرت کاکا شاہ کو دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں "تم مجھے ضرور ملو"۔ صبح اُٹھے تو مولانا غلام محی الدین بگوی سے اجازت لی اور موضع گڈگور پہنچے۔ شاہ صاحب انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، کچھ نصیحتیں کیں، وظائف بتائے، اتباعِ سنت

---

[۹] سوانح حیات مولوی غلام رسولؒ ص ۲۹

[۱۰] بگہؔ، ضلع سرگودھا میں بھیرہ کے قریب ایک مشہور جگہ ہے جسے کسی زمانے میں علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا غلام محی الدین یہیں کے رہنے والے تھے اور اپنے عہد کے نامور عالم اور فقیہ تھے۔ ۲ محرم ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) کو بگہ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کرنے اور ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے بھائی مولانا احمد الدین بگوی کے ساتھ دہلی گئے۔ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے حدیث پڑھی، حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی سے سندِ حدیث حاصل کی اور شاہ غلام علی مجدّدی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ ۱۲۳۱ھ کو وطن واپس آئے۔ والد صاحب (حافظ نور حیات) وفات پا چکے تھے، ان کی مسندِ درس کو رونق بخشی۔ فقیر عزیز الدین کی درخواست پر لاہور آئے اور بیس برس تک بازار حکیماں کی لال مسجد میں درسِ حدیث دیتے رہے۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ و استفاضہ کیا۔ بعد ازاں اپنے وطن بگہ چلے گئے۔ ۳۰ شوال ۱۲۷۳ھ کو وفات پائی۔

پر قائم رہنے کی تلقین فرمائی، صحابہ کرام کا عملی نمونہ بننے کا درس دیا اور حصولِ علم کی تاکید کی۔

مولانا غلام رسول فرماتے ہیں شاہ صاحب کی ان باتوں سے میں نہایت متاثر ہوا، ان کی ہر بات دل میں اترتی اور ذہن میں پیوست ہوتی جاتی تھی ـــــ ان کے دلنشیں وعظ اور اثر میں ڈوبے ہوئے اسلوبِ کلام کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مدارجِ محبت کا مرکز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس قرار پا گئی اور قلب کی گہرائیوں میں ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ اتباعِ رسولؐ اور پیروئ سنت کے لیے میری جان بھی چلی جائے اور میرے جسم کے پرزے اڑا دیے جائیں تو بھی مجھے کوئی پروا نہ ہوگی اور میں اس نعمتِ عظمیٰ کو کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دوں گا ـــــ اس دن سے مجھے ایسے محسوس ہونے لگا کہ میں آنحضرت کی ذاتِ ستودہ صفات کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ اگر مجھ سے خلافِ سنت کوئی کام ہونے لگتا تو ایسے معلوم ہوتا کہ خود آنحضرتؐ اس سے منع فرما رہے ہیں۔ میں ہر وقت نشۂ محبتِ رسولؐ میں سرشار رہتا تھا۔[۱۱]

شاہ صاحب سے اجازت لے کر مولانا غلام رسولؒ واپس آنے لگے تو فرمایا:

"غلام رسول! میری زندگی میں مجھ سے ملتے رہنا۔ شاید تم میری باقیاتِ صالحات میں سے ہو اور ممکن ہے یہی بات میرے لیے ذریعۂ نجات بن جائے۔ دیکھو! علم حاصل کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرنا۔"

اس واقعہ پر کچھ عرصہ گزرا تھا کہ مولانا غلام محی الدین لاہور سے اپنے وطن بگہ تشریف لے گئے اور ان کی جگہ ایک اور عالم کو مدرس مقرر کر لیا گیا جو علم میں تو بلاشبہ کامل تھے، مگر عمل میں ان کا درجہ کم تھا۔ مولانا غلام رسول نے ان سے علمِ نحو کی کتابیں ہدایت النحو اور کافیہ پڑھیں۔ اسی اثنا میں ایک رات مولانا غلام رسول نے خواب دیکھا کہ حضرت کاکا شاہ صاحب نے ان سے ملاقات کے لیے فرمایا ہے۔ مولانا نے استاد سے

---

۱۱ سوانح حیات مولوی غلام رسول، ص ۳۱ ۔

وہاں جانے کی اجازت طلب کی، لیکن اُستاد نے اجازت نہ دی۔ دوسری رات پھر وہی خواب دیکھا، اُستاد نے اب بھی اجازت دینے سے انکار کیا۔ تیسری رات خواب دیکھا کہ شاہ صاحب فرما رہے ہیں، "یہ میری تم سے آخری ملاقات ہے۔ تم لاہور سے بگہ چلے جاؤ اور مولوی غلام محی الدین سے استفادہ کرو، تمھارے موجودہ استاد دین دار نہیں ہیں"۔ اب مولانا غلام رسُول نے کتابیں اٹھائیں اور اُستاد سے اجازت لیے بغیر لاہور سے روانہ ہوئے اور حضرت کا کا شاہ صاحب کے گاؤں گڈگور پہنچے۔ لیکن ان کے وہاں پہنچنے سے قبل شاہ صاحب وفات پا چکے تھے، ان کی قبر پر گئے، نماز جنازہ پڑھی، پھر اپنے گاؤں واپس آ گئے ۔۔۔ بیٹے کو دیکھ کر ان کے والد رحیم بخش بہت خوش ہوئے اور فرمایا: "اچھا ہوا تم آ گئے اور مجھ سے ملاقات ہو گئی"۔۔۔ دوسرے دن مولوی رحیم بخش نماز عصر ادا کر رہے تھے کہ چوتھی رکعت کے سجدے میں جان جان آفریں کو دے دی۔ سعادت مند بیٹے نے پدرِ بزرگ وار کو غسل دیا اور کفن دفن کا انتظام کیا۔ چند روز وہاں مقیم رہے، پھر بگہ تشریف لے گئے۔ وہاں مولانا غلام محی الدین بگوی کے برادرِ صغیر مولانا احمد الدین بگوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور پھر تمام درسی کتابوں کی تکمیل انہی سے کی۔[۱۲]

۱۲ے مولانا حافظ احمد الدین بگوی، ۱۲۱۷ھ میں موضع بگہ (ضلع سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ علم بیان و معانی میں مطوّل اور فقہ میں شرح وقایہ تک کتابیں اپنے بڑے بھائی مولانا غلام محی الدین بگوی سے پڑھیں اور بعد ازاں انہی کی معیت میں مزید حصولِ علم کے لیے دہلی گئے اور حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی سے استفادہ کیا، چودہ سال وہاں قیام فرما رہے اور علوم قرآن، حدیث و فقہ اور دیگر علوم مروّجہ کی تکمیل فرمائی۔ شاہ محمد اسحاق صاحب سے سند و اجازہ کا شرف حاصل کیا اور واپس وطن آ کر مسندِ تدریس آراستہ کی۔ بے شمار لوگ ان سے مستفید ہوئے اور اپنے علاقے میں تبلیغِ اسلام اور اشاعتِ علم کا مؤثر ترین ذریعہ بنے۔ حضرت ممدوح بہت متقی اور بلند اخلاق عالم دین تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور عربی کے اچھے شاعر تھے۔ پنجاب کے اس نامور عالم و فقیہ نے ۱۳ شوال ۱۲۸۶ کو وفات پائی (تفصیل دیکھیے فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری، جلد اوّل ص ۸۸ تا ۹۰)

قلعہ میہاں سنگھ میں سکونت

موضع بگّہ کے مولانا احمد الدین بگوی سے تحصیل علم کے بعد مولانا غلام رسول واپس اپنے گاؤں کوٹ بھوانیداس آ گئے۔ اس سے قبل سردار میہاں سنگھ (جس کے نام سے قلعہ میہاں سنگھ کا قصبہ موسوم ہے) مولانا غلام رسول کے والد مولوی رحیم بخش سے علم حاصل کرتا رہا تھا۔ وہ مولانا کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد کو قلعہ میہاں سنگھ لے آیا تھا اور ان کے علم و فضل اور تدین و تقویٰ سے بہت متاثر تھا۔ بڑے بھائی کے ساتھ مولانا غلام رسول بھی یہیں آ گئے اور پھر اسی قصبے میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور خطابت و امامت کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں۔ یہاں آنے کے بعد ان کے علم و عرفان کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور لوگ وسیع تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے جو اُن سے علم بھی حاصل کرتے تھے اور تصوّف و سلوک کا درس بھی لیتے تھے۔ بلاشبہ وہ اپنے دور کے جیّد عالم، صاحب اتقا، صوفی و سالک اور عارف باللہ تھے۔

اخوند صاحب سوات سے ملاقات

مولانا غلام رسول پر اب یہ کیفیت طاری تھی کہ ہر آن محبّت الٰہی میں سرشار اور مے توحید میں سرمست رہتے۔ جس طرف کسی مے کدۂ معرفت کا پتا چلتا، اُسی طرف دوڑ پڑتے۔ اس راہ کی مشکلات کو عبور کرنے میں وہ انتہائی خوشی محسوس کرتے اور مجاہدہ و ریاضت کی کٹھن منزلوں سے گزرنا ان کے لیے باعثِ مسرّت ہوتا۔ انھیں معلوم ہوا کہ سوات میں ایک بزرگِ کامل اخوند صاحب فروکش ہیں، بہت سے جویانِ حق ان کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ مولانا غلام رسول وہاں پہنچے اور اخوند صاحب سے ملے۔ مولانا فرماتے ہیں اخوند صاحب عابد و زاہد اور متقی تو ہیں، لیکن سنّتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ وہاں انھیں اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوا، صرف دو دن اُن کے ہاں ٹھہرے اور واپس چلے گئے۔[۱۳]

---

[۱۳] سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۳۸

سیّد امیر صاحب کی خدمت میں

واپسی پر علاقہ ہزارہ کے ایک مقام تربیلہ میں آئے تو ان کی ملاقات وہاں کے ایک ارباب (یعنی رئیس یا نمبردار) سے ہوئی۔ ارباب صاحب نے ان کو اپنا مہمان ٹھہرایا، گفتگو شروع ہوئی تو انھوں نے مولانا غلام رسُول سے اس تکلیف دہ اور طویل وعریض سفر کا سبب دریافت کیا۔ مولانا نے جب تفصیل بیان کی تو ارباب صاحب نے ان کو سید امیر صاحب ساکن کوٹھا کا پتا دیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی سیّد امیر صاحب کے مرید اور عقیدت مند ہیں اور کہا کہ وہ عبادت و زہد میں یکتا ہیں، علم و فضل کے زیور سے بھی آراستہ ہیں اور عاملِ کتاب وسنت بھی ہیں۔ ارباب صاحب نے سیّد امیر صاحب کی بہت تعریف کی۔ حضرت میر صاحب کے بارے میں ارباب صاحب کی باتوں سے وہ اس درجے متاثر ہوئے کہ بڑی مشکل سے وہاں ایک رات گزاری۔ فجر کی نماز پڑھی اور عازم کوٹھا ہوگئے۔ سیّد امیر صاحب سے ملاقات ہوئی تو خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ سلسلۂ بیعت سے متعلق پوچھا تو امیر صاحب نے بتایا "میں بیعت شدہ سید صاحب بریلوی مرشد مولوی اسماعیل صاحب شہید کا ہوں"[۱۴]

سیّد امیر صاحب کو حضرت سیّد احمد بریلوی سے فیض حاصل تھا اور بلاشبہ وہ بہت متقی اور پرہیزگار عالم تھے۔[۱۵]

---

[۱۴] سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۳۹

[۱۵] اخوند سید امیر صاحب نے "ملا صاحب کوٹھا" کے نام سے شہرت پائی۔ کوٹھا تحصیل صوابی ضلع مردان کا ایک مشہور مقام ہے۔ سیّد امیر صاحب یہیں کے رہنے والے تھے اور سیّد احمد صاحب بریلوی کے مخلص ارادت مند تھے۔ بعیتِ اقامتِ شریعت کے بعد سیّد احمد بریلوی نے انھیں کوٹھا کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ ۱۵ شعبان ۱۲۴۴ھ کو ان کے نام باقاعدہ قضا نامہ جاری ہوا۔ سید صاحب سے تعلقِ ارادت کی بنا پر ملا صاحب گوناگوں مصائب و آلام کا ہدف بنے۔ ایک موقع پر انھیں "وہابیت" سے متہم کیا گیا اور اُن کی زندگی خطرے میں پڑ گئی، لیکن وہ اپنے

مولانا غلام رسُول کو سیّد امیر صاحب نے سینے سے لگایا اور فرمایا تم رُوحانی اعتبار سے تعجب انگیز استعداد کے حامل ہو۔ تیری خوشی کی بھی کوئی انتہا نہیں اور میری خوشی کا بھی کوئی حساب نہیں۔ مجھے آج تک تیرے جیسا مشتاق سنت نہیں ملا۔ الحمد للہ کہ اس نے تمھیں بدعتیوں اور بے راہ رو لوگوں سے بچالیا۔[۱۶]

مولانا چند روز سیّد امیر صاحب کی خدمت میں رہے اور پھر واپس قلعہ میہاں سنگھ آگئے۔ اب ان کی دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ یادِ الٰہی اور اتباعِ سنّت ان کا اصل مشغلہ قرار پاگیا تھا، جو طالب علم ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے انھیں بھی جواب دے دیا۔ قلب پر خوفِ خدا نے غلبہ حاصل کر لیا تھا اور زبان اس کے ذکر سے تر رہتی تھی۔

خواجہ سلیمان تونسوی سے ملاقات

اس زمانے میں خواجہ سلیمان تونسوی کے تصوّف و ریاضت کا بہت شہرہ تھا۔ مولانا غلام رسُول کے دل میں ان سے ملاقات کی خواہش نے کروٹ لی اور عازم تونسہ ہوئے۔ تونسہ سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں پہنچے تو سورج غروب ہو گیا اور وہیں رہ پڑے۔ اس گاؤں کی مسجد کے امام صاحب نیکی و تدین کے اوصاف سے متصف تھے۔ اور حدیث و فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں درک رکھتے تھے۔ وہ نہایت تکریم سے پیش آئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) موقف و مسلک پر قائم رہے ــــ اکابرِ ہند میں سے دو بزرگوں کو ملا صاحب کوٹھا سے خاص تعلق پیدا ہوا، ایک مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ کو اور ایک مولانا سیّد عبداللہ غزنوی کو ــــ ملا صاحب ممدوح کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ حقیقی بھانجے صاحبزادہ عبداللطیف کو خانہ داماد بنالیا تھا۔ وہ بھی اجل عالم تھے۔ عالمِ جوانی میں انھیں شہید کر دیا گیا تھا۔ ان کے صاحب زادے (یعنی ملا صاحب کے نواسے) صاحبزادہ نواب سر عبدالقیوم خاں تھے جو اس ملک کی سیاست میں خاصے نامور ہوئے اور تعلیمی خدمات کے اعتبار سے "صوبہ سرحد کے سر سیّد" کہلائے۔

[۱۶] حیات مولوی غلام رسول ص ۴۰۔

اور مولانا کو کھانا کھلایا۔ اثنائے گفتگو میں جب انھیں پتا چلا کہ مولانا علم و فضل کی دولت سے بہرہ ور ہیں تو ان سے بعض مشکل علمی مسائل دریافت کیے، مولانا نے جو جواب دیا، اس سے وہ متاثر ہوئے اور تسکینِ خاطر ہوئی۔ پھر پوچھا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

فرمایا "خواجہ سلیمان کے پاس تونسے جا رہا ہوں۔"

بولے "وہاں تو بدعات کا زور ہے، آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں، بہتر یہی ہے کہ آپ وہاں نہ جائیں۔"

لیکن مولانا نہیں مانے اور وہاں جانے پر مصر رہے۔ اب امام صاحب نے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور اللہ سے دعا مانگی کہ:

"اے اللہ! اگر میں اپنے عقیدے میں سچا ہوں اور وہ شخص ایسا ہی ہے جیسا کہ میں جانتا ہوں تو مولوی غلام رسول کو اس کی ملاقات کا موقع نہ دے۔"

مولانا غلام رسول جب تونسہ پہنچے تو خواجہ سلیمان صاحب وہاں موجود نہ تھے اور وہاں سے بہت دور کہیں دورے پر تشریف لے گئے تھے۔

مولانا پھر اسی گاؤں میں اسی امام صاحب کے پاس آگئے اور خواجہ صاحب سے ملاقات نہ ہونے کی اطلاع دی۔ امام صاحب یہ سن کر خوش ہوئے۔

اس سے کئی مہینے بعد پھر تونسہ گئے اور خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولانا نے ان کو فارسی نظم میں ایک طویل خط لکھ کر پیش کیا۔ یہ خط نہایت عمدہ ہے، اس میں بہترین الفاظ اور دلنشین اسلوبِ کلام میں نصیحتیں کی گئی ہیں اور دنیا کی ناپائیداری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔

مولانا فرماتے ہیں، "یہ خط پڑھ کر خواجہ سلیمان صاحب خوش ہوئے۔" "لیکن میری اور ان کی نسبت نہ ملی، کیونکہ خواجہ صاحب کی حالت موافق سنّت نہ تھی۔" مولانا ان کے بعض وظائف سے بھی اتفاق نہ کرتے تھے اور تصوّرِ شیخ کو بھی صحیح نہ سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں۔ "میں ایسی باتوں کا سخت مخالف تھا۔"

مولانا غلام رسول خواجہ صاحب کے بارے میں یہ بھی فرماتے ہیں۔

"مجھ پر آپ نے بڑی مہربانی کی، اپنے مجرّبہ تعویذ اور وظائف سکھائے اور بلا بیعت ہونے کے مجھے اپنا خلیفہ ہونے کا لقب عطا فرمایا۔ چند روز مجھے وہاں ٹھہرایا۔ مجھ پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب تم کو مرید ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم خود لوگوں کو اپنا مرید بنایا کرو۔ بعد رخصت میں گھر آیا۔"[۱۷]

ایک مجذوب سے ملاقات

تونسہ سے مولانا غلام رسول قلعہ میہان سنگھ آئے اور وہاں سے فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداسپور، مشرقی پنجاب) گئے۔ ان کی شادی فتح گڑھ چوڑیاں میں ہوئی تھی۔ یہاں کے لوگوں نے انھیں بتایا کہ علاقہ تخت ہزارہ میں ایک گاؤں کا نام "نچے" ہے۔ وہاں ایک بزرگ رہتے ہیں جو حافظِ قرآن اور باکمال ولی ہیں۔ فتح گڑھ چوڑیاں کے سب لوگ ان حافظ صاحب کے مرید تھے۔ مولانا غلام رسول وہاں سے موضع نچے پہنچے۔ یہ سفر انھوں نے پیدل طے کیا اور حافظ صاحب سے ملاقات کی۔ کئی دن حافظ صاحب کے ہاں مقیم رہے۔ حافظ صاحب نے ان سے فرمایا:

"میرے پاس براہِ راست آپ کا کوئی حصہ نہیں۔ مگر ایک مجذوب کے طفیل میرے فیض کا کچھ حصّہ آپ کو ملے گا۔"

حافظ صاحب نے اس مجذوب کے نام ایک خط لکھ کر مولانا کو دیا اور فرمایا:

"اس کا نام نامدا رقوم کا مارنہ ہے اور موضع گڑھی اعواناں میں ملک رحمت خاں کے گھر میں رہتا ہے۔ بُرا بھلا کہے گا، آپ بُرا نہ مانیں، میرا یہ خط اُن کو دے دیں اور میری طرف سے السلام علیکم کہہ دینا۔"

مولانا غلام رسول حافظ صاحب سے اجازت لے کر موضع اعواناں گئے۔ ان کے ساتھ ایک کشمیری طالب علم تھا جو ان سے علم معانی و بیان کی کتاب "مطول" پڑھتا تھا۔

---

۱۷ یہ تمام تفصیلات سوانح حیات مولوی غلام رسول میں درج ہیں۔ (دیکھیے صفحہ ۴۰ تا ۴۴)

اس گاؤں میں جا کر مجذوب کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ گاؤں سے باہر گئے ہیں اور جنگل میں بیمار گدھوں کو چرا رہے ہیں[۱۸]

مولانا اپنے کشمیری شاگرد کے ساتھ جنگل میں پہنچے اور مجذوب کے قریب گئے تو وہ مولانا سے مخاطب ہوا "یہ تیرا ساتھی شخص نسب کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے، اس کو میرے پاس نہ لاؤ، دور چھوڑ کر میرے پاس آجاؤ"۔ اس طالب علم کے بارے میں مجذوب نے کئی قسم کی باتیں کیں ـــ مولانا طالب علم کو چھوڑ کر مجذوب کے پاس پہنچے تو حافظ صاحب کا خط پیش کیا اور ان کا سلام پہنچایا۔ اس نے اپنی گودڑی بچھائی، مولانا کو احترام کے ساتھ اس پر بٹھایا اور بہت عزت سے پیش آیا۔

مولانا کہتے ہیں اُس دن سے میرا شوقِ ریاضت و مجاہدہ روز بروز ترقی کرتا گیا، میری شہرت دُور دور تک پہنچ گئی اور کثرت سے لوگ میرے پاس آنے لگے۔ لیکن مجھے حضرت سیّد امیر صاحب کوٹھا والے کا شوقِ ملاقات آرام نہیں لینے دیتا تھا۔ ان کی صحبت نہایت دلکش و دلآویز تھی اور اس کا کچھ اور ہی رنگ تھا۔

دوبارہ عزمِ کوٹھا

گڑھی اعواناں کے مجذوب سے ملاقات کے بعد مولانا اپنے گاؤں قلعہ میہاں سنگھ آئے اور اہل خانہ سے سیّد امیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا عزم ظاہر کیا اور تیاری شروع کر دی۔ ان کے اعزہ واقارب ان کے اس کثرت سے مختلف مقامات

---

[۱۸] اس مجذوب کی یہ عادت تھی کہ لوگ اپنے گدھوں سے سخت محنت کا کام لے کر بے کار اور کمزور کر کے چھوڑ دیتے تو یہ اس قسم کے تمام گدھوں کو اکٹھا کر کے جنگل میں لے جاتے اور محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے ان کو چرایا کرتے۔ جب یہ گدھے تندرست اور کام کے لائق ہو جاتے تو مالک اُن کو اپنے گھروں میں لے جاتے اور دوسرے بے کار و لاغر گدھوں کو چھوڑ جاتے۔ پھر یہ مجذوب ان گدھوں کو چرانا شروع کر دیتے۔ دن بھر وہ یہی کام کرتے رہتے۔

(سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۴۵)

ہیں جانے پر تعجب وحیرت کا اظہار کرتے اور کہتے کہ "یہ مجنون ہو گیا ہے یا اس کے پاؤں کو چکّر آگیا ہے یا آسیب زدہ ہے۔ یہ شخص آبِ حیات کی تلاش میں ہے"۔ مولانا فرماتے ہیں، اس قسم کے طعن وملامت سے میرے شوق میں مزید اضافہ ہوتا اور میری آتشِ اشتیاق اور بھڑکتی ــــ بہر حال وہ اپنے گاؤں سے روانہ ہوئے اور سیّد امیر صاحب کی خدمت میں دوبارہ کوٹھا پہنچے۔

مولانا عبداللہ غزنوی سے ملاقات

کوٹھا گئے ابھی دو ہی دن ہوئے تھے کہ حسنِ اتفاق سے مولانا عبداللہ غزنوی بھی وہاں پہنچ گئے اور مولانا غلام رسُول اور مولانا عبداللہ کی پہلی ملاقات یہیں ہوئی، جس نے آگے چل کر مضبوط روحانی تعلقات و روابط کی شکل اختیار کر لی۔ ان دونوں بزرگوں کے درمیان اس قدر محبت کا رشتہ استوار ہو گیا تھا کہ حضرت سیّد امیر صاحب اسے دیکھ کر انتہائی خوش ہوتے اور فرماتے کہ تم دونوں کے درمیان مجھے عجیب طرح کا نُورِ اخوت گردش کرتا ہُوا دکھائی دیتا ہے اور تمھیں دیکھ کر مجھے بہت مسرّت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تم دونوں کی محبت میں ترقی دے[۱۹]۔

مولانا غلام رسُول کا کوٹھے کا یہ دوسرا چکّر تھا۔ وہ اس سے قبل جب پہلی مرتبہ یہاں آئے تھے تو حضرت سیّد امیر صاحب کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے تھے۔ مولانا عبداللہ غزنوی پہلی دفعہ تشریف لائے تھے، وہ بھی سیّد صاحب سے بیعت ہوئے اور ان کی بیعت کا مقصد محض سیّد امیر صاحب کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہونا تھا، ورنہ ان کو بیعت کی ضرورت نہ تھی۔

کوٹھا سے روانگی اور ایک مجذوب سے ملاقات

مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ غزنوی چند روز کوٹھا میں مقیم رہے۔ اس اثنا

۱۹ے سوانح مولوی غلام رسول ص ۴۸ ــــ مولانا عبداللہ غزنوی کے حالات کے لیے دیکھیے "فقہائے پاک وہند تیرھویں صدی ہجری" جلد دوم ص ۱۴۷ تا ۲۱۹ -

ہیں دونوں کے درمیان گہرے قلبی اور روحانی روابط پیدا ہو چکے تھے۔ دونوں کوٹھا سے قلعہ میہاں سنگھ کو روانہ ہوئے۔ جب گجرات کے قریب پہنچے تو مولانا عبداللہ غزنوی ایک مقام پر رُکے اور فرمایا مجھے یہاں ایک ایسے مجذوب کی خوشبو آ رہی ہے جو ملاقات کے قابل ہے۔

یہاں یہ واقعہ لائقِ تذکرہ ہے کہ کوٹھا سے روانگی کے بعد دورانِ سفر میں دونوں بزرگوں نے کتب حدیث پڑھنے کا ارادہ کر لیا تھا اور یہ بات بھی دونوں میں طے پا چکی تھی کہ دہلی جا کر حدیث کی تعلیم حاصل کی جائے گی۔ اسی خیال کو دل میں لیے ہوئے مجذوب کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مجذوب کا نام جنگو شاہ تھا۔ اس سے یہ حضرات پوچھنا چاہتے تھے کہ حدیث کہاں جا کر پڑھی جائے۔

جب یہ مجذوب کی طرف روانہ ہوئے تو اس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا دیکھو "دو ایسے شخص آ رہے ہیں جو عمل و اخلاق کے اعتبار سے محمدی نمونہ ہیں، ان کے آنے سے پہلے جلدی سے مجھے کپڑا پہنا دو اور ان کے لیے فرش بچھا دو۔"
جب یہ اس مجذوب کے قریب آئے تو اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان کا استقبال کیا اور احترام سے اپنے پاس بٹھایا۔ پھر دہلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"جنت اس طرف ہے۔" اس کے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ حیران تھے کہ یہ مجذوب کبھی کسی سے مخاطب نہیں ہوا، مگر آج ان بزرگوں سے باتیں کر رہا ہے۔
مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسُول مجذوب کی مجلس سے اُٹھ کر واپس آنے لگے تو اُس نے کہا: "لباس دیکھ کر نہ بھول جانا، وہ شخص مسکین صورت ہے اور اس کا نام سید نذیر حسین ہے، اُس سے پڑھنا۔"[۲۰]
وہاں سے چل کر یہ بزرگ قلعہ میہاں سنگھ پہنچے۔ مولانا عبداللہ غزنوی نے فرمایا: مجھے اللہ کی طرف سے القا ہوا ہے کہ میں چند مہینوں کے بعد حدیث پڑھنے دہلی جاؤں۔

---

[۲۰] سوانح مولوی غلام رسُول، ص ۴۸، ۴۹

مولانا غلام رسول کو سیّد امیر صاحب نے فی الحال لاہور جا کر قیام پذیر ہونے اور وہاں وعظ و ارشاد کا سلسلہ جاری کرنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ دونوں قلعہ میہاں سنگھ سے لاہور آگئے، چند روز وہاں قیام کیا، پھر امرتسر چلے گئے اور وہاں باغ والی مسجد میں حافظ محمود صاحب کے ہاں مقیم ہوئے۔ حافظ صاحب نے مولانا عبداللہ غزنوی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔

لاہور میں قیام اور سلسلۂ وعظ و ارشاد

مولانا غلام رسُول کچھ دن امرتسر رہے اور پھر لاہور آگئے۔ لاہور میں انھوں نے مسجد چینیاں والی میں قیام کیا اور وعظ و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ ان کا وعظ نہایت عمدہ اور مؤثر ہوتا تھا۔ ہر بات سامعین کے دلوں میں اُترتی جاتی تھی۔ وعظ میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی شرکت کرتے اور ان کے ارشادات سے اثر پذیر ہوتے تھے۔ بہت سے غیر مسلم وعظ کے دوران ہی میں اسلام قبول کر لیتے اور آگے چل کر تبلیغ اسلام کا ذریعہ بنتے۔ اس طرح بے شمار لوگ ان کے وعظ سے مسلمان ہوئے، اور بہت سے افراد کی زندگیاں اسلام کے قالب میں ڈھلیں۔

مولانا غلام رسُول میں یہ خوبی تھی کہ اگر کسی جگہ کے لوگ ان کے وعظ سے متاثر نہ ہوتے یا دوران وعظ مخالفت پر اُتر آتے تو بالکل نہ گھبراتے، نہ بددل ہوتے بلکہ اپنا سلسلۂ ارشاد جاری رکھتے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ واعظ اور مبلغ کا کام اپنی بات پورے اخلاص اور کوشش سے لوگوں کے کانوں تک پہنچانا ہے، کسی کو ماننے پر مجبور کرنا اس کے فرائض میں داخل نہیں۔ بعض لوگ انبیا علیہم السّلام کی بات نہیں مانتے تھے، حالاں کہ وہ مبعوث من اللہ تھے۔ ہم لوگوں کی بات اگر کوئی نہیں مانتا تو افسوس و ملال کی ضرورت نہیں۔

ان کے وعظ میں عوام و خواص اور علما و طلبا کثیر تعداد میں شریک ہوتے اور ان کے ارشادات عالیہ سے فیض حاصل کرتے۔ بعض لوگ اعتراض و بحث کی غرض سے آتے اور اثر پذیر ہو کر واپس جاتے۔ ان کا اندازِ کلام نہایت شیریں اور پیارا

تھا۔ وعظ میں قرآن کی آیات تلاوت کرتے، احادیث رسول پڑھتے، ائمہ کے اقوال بیان کرتے اور اشعار سناتے، جس سے سامعین محظوظ بھی ہوتے اور متاثر بھی۔ جو بات ان کی زبان سے نکلتی، وہ ان کے دل کی آواز تھی۔ وہ جب وعظ میں دوزخ، جنت اور قیامت کا ذکر کرتے تو سامعین پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی کہ گویا وہ ان تمام مقامات کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ اس سے ان کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے اور ان کی اثر پذیری کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔

طلب حدیث کے لیے عزم دہلی

کچھ عرصہ مولانا غلام رسول نے لاہور میں قیام کیا اور وعظ و نصیحت کو اپنا مشغلہ قرار دیے رکھا۔ ان کے مواعظ و نصائح سے نہایت اچھے اثرات مرتب ہوئے اور بے شمار لوگوں نے مسائلِ دین سیکھے اور اسلام قبول کیا۔ پھر لاہور سے امرتسر گئے اور باغ والی مسجد میں حافظ محمود صاحب کے پاس ٹھہرے۔ امرتسر میں بھی وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رہا۔ امرتسر سے مولانا عبداللہ غزنوی کے ساتھ تحصیل علم حدیث کے لیے عازم دہلی ہوئے۔ امرتسر سے دہلی تک کا سفر بذریعہ یکہ آٹھ دن میں طے کیا۔ ان دنوں حضرت سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی وہاں درس حدیث دیتے تھے، مولانا غلام رسول بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور کتب حدیث پڑھنا شروع کیں۔ مولانا عبداللہ غزنوی بھی ان کے شریکِ درس تھے۔ حضرت میاں صاحب سے مولانا غلام رسول نے سندِ حدیث حاصل کی۔

مولانا غلام رسول کے وعظ کی شہرت دہلی تک جا پہنچی تھی۔ جب وہاں کے لوگوں کو اُن کی دہلی میں آمد کی اطلاع ہوئی تو وعظ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ایک دن لال قلعے سے ایک مغل شہزادہ بھی حضرت میاں نذیر حسین کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولوی صاحب کو وعظ کے لیے قلعے میں بھیجا جائے، چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی اور لال قلعہ میں مولانا نے وعظ کہا، جس میں خود سید نذیر حسین

نے بھی شرکت فرمائی۔ اور بھی بہت سے حضرات مولانا کا وعظ سننے کے لیے قلعہ میں گئے۔ وعظ نہایت مؤثر اور دلنشین تھا۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی

مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ غزنوی ابھی دہلی میں حضرت میاں صاحب کے حلقۂ درس ہی میں تھے کہ ۱۶ ررمضان ۱۲۷۳ھ (۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) کو جنگِ آزادی شروع ہوگئی، فتح کے بعد جسے انگریزوں نے "غدر" کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا آغاز میرٹھ سے ہوا، پھر یہ جنگ دہلی پہنچی اور اس کے بعد بہت جلد ہی پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ دہلی شہر اس زمانے میں انتہائی بدامنی کی لپیٹ میں تھا اور چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ جس مسجد میں مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول علم حدیث حاصل کرنے کے لیے اقامت گزیں تھے، وہاں مسلسل بندوق کی گولیاں آکر گرتیں اور مہیب آوازیں آتی تھیں، اس پر مولانا عبداللہ غزنوی جو مولانا غلام رسول کو عبداللہ کہہ کر پکارتے تھے، ان سے حیرانی سے پوچھتے: "عبداللہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟"[۱]

یہ نہایت اضطراب اور گھبراہٹ کا زمانہ تھا، ہر شخص اپنی جان کی فکر میں تھا، کسی دوسرے کی خبر نہ تھی۔ مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ غزنوی اس وحشت ناک دور میں بھی نہایت اطمینان اور سکون کے عالم میں تھے اور حصولِ علم حدیث ہی ان کا اصل مشغلہ تھا۔ کسی اور طرف قطعاً ان کی توجہ نہ تھی۔

ایک انگریز عورت کی امداد

ایک دن مولانا عبداللہ غزنوی نے مولانا غلام رسول سے کہا: میں نے خواب دیکھا ہے کہ تم پر بلائے آسمانی نازل ہو رہی ہے، لہٰذا یہاں رہنے کی نسبت تمھارا اپنے گھر چلے جانا زیادہ بہتر ہے۔ جب سے میں نے یہ خواب دیکھا ہے، تمھاری طرف سے بہت مضطرب ہوں۔

مولانا غلام رسول فرماتے ہیں کہ مولانا عبداللہ غزنوی مجھے بار بار گھر جانے کے لیے کہتے اور اس پر اصرار کرتے تھے۔ میں انھیں جواب میں کہتا کہ اگر آپ مجھے واقعی مبتلائے مصیبت

---

[۱] سوانح حیات مولانا غلام رسول ص ۶۰

ہونے والا دیکھتے ہیں تو مجھ سے ایسی باتیں کریں، جن سے مجھے تسکین قلب اور اطمینان حاصل ہو، نہ کہ مزید گھبراہٹ میں ڈالنے کی کوشش فرمائیں۔ لیکن مولانا عبداللہ برابر اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ بالآخر ان کے بے حد اصرار پر وہ دہلی سے وطن جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

مولانا عبداللہ غزنوی ان کو رخصت کرنے کے لیے میاں سید نذیر حسین کے مدرسے سے لاہوری دروازے کے باہر شاہدرہ تک ان کے ساتھ گئے۔ وہاں کھڑے دونوں بزرگ الوداعی باتیں کر رہے تھے کہ سامنے ایک انگریز عورت پر نظر پڑی جو سخت زخمی حالت میں تھی اور پیاس سے بلک رہی تھی، مگر کوئی اُسے پانی نہ پلاتا تھا۔ انسانی ہمدردی کے پیشِ نظر یہ دونوں بزرگ اس عورت کے پاس آئے اور کہیں سے پانی لا کر اُسے پلایا۔ اس وقت مولانا غلام رسول نے ایک عجیب فقرہ کہا جو بعد میں پیش آنے والے حالات کی روشنی میں الہامی ثابت ہوا۔ اُنھوں نے فرمایا:

"خبر نہیں، کب تک یہ ہندوستان غلامی میں رہے، کیوں کہ لوگ بچوں اور عورتوں پر ظلم کرنے لگ گئے ہیں جو اسلامی قانون کے خلاف ہے"[۲۲]

اس سے ٹھیک نوّے سال بعد (۱۹۴۷ء تک) یہ برِصغیر انگریزوں کا غلام رہا۔ اس کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے نام سے دو مملکتیں معرضِ قیام میں آئیں۔

۱۸۵۷ء کا دور کچھ ایسا ہنگامہ خیز تھا کہ کسی انگریز سے اظہارِ ہمدردی کرنا اپنے آپ کو مُصیبت کے منہ میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اگرچہ وہ انگریز بوڑھا ہو، مظلوم ہو، بیمار ہو، مرد ہو، عورت ہو، بچہ ہو، کوئی ہو، اُس کی اِمداد کرنا نہایت مشکل تھا، حالاں کہ اسلام کی رُو سے ایسے لوگوں کی اِمداد کرنا اور ان کو ظلم و زیادتی سے بچانا ضروری ہے۔ مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس انگریز عورت کی مدد کی۔ اس کو کسی صورت میں مردانہ لباس پہنایا اور

---

[۲۲] سوانح حیات مولوی غلام رسول، ص ۵۹۔

مسجد کے حجرے میں لے آئے۔ رات کو کچھ لوگوں کو شبہ ہوا تو وہ مسجد میں تلاشی کے لیے آئے انھوں نے ان لوگوں کو بتایا کہ کوئی مسافر مریض ہے جو حجرے میں لیٹا ہوا ہے۔ اس پر وہ لوگ واپس چلے گئے۔

مولانا غلام رسُول نے اب وطن جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس عورت کے علاج اور خدمت میں مصروف ہو گئے۔ چند روز میں وہ صحت یاب ہو گئی تو پتا چلا کہ وہ ایک انگریز کرنل کی بیوی ہے۔ اسے کسی طرح اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔ اب عورت نے مولانا غلام رسول کو اپنی طرف سے خط لکھ کر دینا چاہا کہ اگر کسی وقت ضرورت پڑے تو اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے لیکن مولانا نے خط لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا ہم نے یہ کام صرف رضائے الہٰی اور انسانی ہمدردی کے لیے کیا ہے، اللہ ہی اس کا صلہ دے گا۔ اس عورت نے یہ بھی کہا کہ ممکن ہے ہندوستانیوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو جائے، اس صورت میں یہ خط آپ کے کام آئے گا اور اگر انگریزی حکومت سے کسی نے آپ کی شکایت کی تو بھی متعلقہ لوگوں کو یہ خط دکھایا جا سکتا ہے لیکن مولانا نہیں مانے۔ فرمایا ہم درویش آدمی ہیں، کوئی ہماری شکایت کیوں کرے گا اور ہمیں تکلیف پہنچا کر اُسے کیا ملے گا۔

وطن کو روانگی اور وارنٹ گرفتاری

اس انگریز عورت کی صحت یابی کے بعد اُسے گھر پہنچایا اور پھر اس سے کئی دن بعد وطن کو روانہ ہوئے۔ اس اثنا میں کسی نے حکومت سے شکایت کر دی کہ "انگریزوں کے خلاف جو کچھ ہوا ہے اس میں مولوی غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے کا بھی ہاتھ ہے اور یہ اس زمانے میں دہلی میں مقیم تھے اور انگریزی حکومت کے خلاف سازش میں شریک تھے۔" یہ وہ دور تھا جب انگریزوں نے بغاوت کو کچل دیا تھا اور ہندوستانیوں کو وسیع پیمانے پر گرفتار کر کے انھیں سنگین سزائیں دی جا رہی تھیں۔ جگہ جگہ پھانسیاں نصب تھیں اور جس پر کوئی ذرا سا شبہ ہوتا اُسے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ مولویوں سے حکومت بالخصوص بدظن تھی اور جن مولویوں پر وہابی

کے لفظ کا اطلاق ہوتا تھا، انھیں بہت زیادہ ہدفِ ستم ٹھہرایا جاتا تھا، اتفاق سے مولانا غلام رسُول اسی زمرے میں شامل تھے اور انھیں وہابی کہا جاتا تھا۔ انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے بے شمار ہندوستانی اور بہت سے علمائے کرام گرفتار کیے جا چکے تھے۔ مولانا غلام رسُول کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکے تھے۔ وہ دہلی سے چلے اور اِدھر اُدھر کے چکّر کاٹتے ہوئے امرتسر پہنچے۔ وہ دن حافظ محمود کے پاس باغ والی مسجد میں رہے۔ وہیں انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی گرفتاری کے لیے حکومت نے اشتہار جاری کر دیا ہے یعنی پولیس کی اصطلاح میں انھیں "اشتہاری مجرم" قرار دے دیا گیا ہے۔ امرتسر میں دو دن قیام کے بعد اپنے سُسرال فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداسپور) گئے۔ اُن کے سُسر مولوی عبدالحق زندہ تھے اور مولانا کی گرفتاری سے متعلق اشتہار کا واقعہ اُن کے علم میں آ چکا تھا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ حکومت کے جاسوس اور ملازم ان کے رشتے داروں اور واقفوں کے گھروں میں جا جا کر ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امرتسر کا ڈپٹی کمشنر انگریز تھا جو اس قدر بدحواس ہو گیا تھا کہ جس شخص کے بارے میں فساد میں ملوّث ہونے کی ذراسی بھنک اس کے کان میں پڑتی اُسے بلاتحقیق گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیتا تھا۔ مولوی عبدالحق اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے اور تمام دن دروازے پر بیٹھے رہتے تاکہ کسی کو پتا نہ چل جائے کہ مولانا غلام رسُول ان کے گھر میں موجود ہیں۔

فتح گڑھ چوڑیاں کا ایک مشہور رئیس دیوان نرنجن داس تھا۔ وہاں کے لوگ اس کی بہت عزّت کرتے تھے، سرکار دربار میں بھی اچھّی حیثیت رکھتا تھا اور حُسنِ اتفاق سے مولوی عبدالحق کا شاگرد تھا اور اُن کو انتہائی لائقِ احترام گردانتا تھا۔ ایک دن کچھ سرکاری لوگ دیوان نرنجن داس کے پاس پہنچے، اس کو مولانا غلام رسول کے وارنٹ گرفتاری دکھائے اور ان کی گرفتاری کے لیے اس سے طالبِ امداد ہوئے۔ دیوان صاحب نے خفیہ طور پر اس کی اطلاع مولوی عبدالحق کو دی اور پیغام بھجوایا کہ اگر مولانا غلام رسُول یہیں ہیں تو ان کو علی الصبح ان کے وطن (قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ) روانہ کر دیں۔ ان کا

اپنے علاقے میں چلے جانا ہی مناسب ہے۔ ایک تو اس لیے کہ وہاں کے لوگ ان کے حالات و معاملات سے ہماری نسبت زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اور خطرے کی صورت میں وہ ان کی اچھے طریقے سے مدد کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ممکن ہے وہاں کوئی ایسا حاکم ہو جو محض شبہے کی بنا پر پکڑنا مناسب نہ سمجھتا ہو، لوگوں کی شہادتیں اور بیان لینا بھی ضروری قرار دیتا ہو اور اسی کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا عادی ہو۔

دیوان نرنجن داس کی یہ بات بالکل صحیح اور ہمدردانہ تھی، چنانچہ مولانا فتح گڑھ چوڑیاں سے چلے اور اپنے وطن قلعہ میہاں سنگھ پہنچ گئے۔

گرفتاری

یہاں ان کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد سکونت پذیر تھے۔ انھوں نے مولانا کو باہر نہ نکلنے اور گھر ہی میں چھپے رہنے کا مشورہ دیا۔ مولانا نے فرمایا چھپ چھپا کر زندگی گزارنا مشکل ہے۔ میں اللہ کی رضا اور قضا پر راضی ہوں۔ حاکم وقت آخر میرا بیان بھی تو لے گا اور معاملے کی تحقیق بھی کرے گا۔ یوں ہی کسی کی شکایت پر تو پھانسی نہیں دے دے گا۔ آپ مجھے باہر نکلنے سے منع نہ کریں۔[۲۳]

مولانا کا یہ جواب سن کر حکیم صاحب مسجد میں چلے گئے۔ دیکھا تو مسجد میں ایک نووارد مسافر بیٹھا تھا۔ حکیم صاحب نے اسے اجنبی سمجھ کر کھانے کے متعلق پوچھا، اس نے انکار کیا اور کھانا نہیں کھایا۔ اس کی شکل و شباہت سے حکیم صاحب کو شبہ ہوا کہ یہ کوئی انگریز ہے جو بھیس بدل کر اور دیسی لباس پہن کر یہاں آیا ہے۔ وہ اسی وقت گھر گئے اور مولانا کو اس نووارد کے بارے میں بتایا۔ وہ نماز ظہر کا وقت تھا۔ مولانا نماز کے لیے مسجد میں آئے تو وہ شخص ان کو دیکھتے ہی باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد پولیس کپتان اور اس کے ساتھ بہت سے پولیس والے مسجد میں آ گھسے، وہ نووارد مسافر بھی ان کے ساتھ تھا۔ آتے ہی مولانا کو گرفتار کر لیا اور انھیں پکڑ کر لاہور کو روانہ ہو گئے۔

۲۳۔ سوانح حیات مولوی غلام رسول، ص ۶۲

اس پر گاؤں میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور لوگوں نے پولیس والوں کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور اندیشہ تھا کہ پولیس تمام گاؤں کے لوگوں پر سختی کا برتاؤ کرے گی۔ مولانا نے جو پولیس کی حراست میں تھے بلند آواز سے لوگوں سے کہا کہ وہ پولیس کی کارروائی میں مزاحم نہ ہوں، اس نے مجھے گرفتار کر لیا ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں، سب لوگ آرام سے اپنے گھروں کو چلے جائیں، اگر مزاحمت کی گئی تو آپ لوگوں کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو جائے گا اور خود میری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اگر امن و امان قائم رہا تو میں انشاء اللہ جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ مولانا کی یہ باتیں سُن کر لوگ پیچھے ہٹ گئے اور پولیس مولانا کو پکڑ کر لاہور کو روانہ ہو گئی۔ اس وقت تین آدمی ان کے ساتھ تھے۔ بڑے بھائی حکیم غلام محمد، پھوپھی زاد بھائی مولوی بدرالدین اور گوجرانوالہ کے مولوی علاء الدین جوان کے شاگرد تھے۔

میہاں سنگھ کی بہو کا نام "سکھدیئی" تھا۔ خود سکھدیئی اور اُس کے خاندان کے لوگ مولانا کی بے حد تکریم کرتے تھے۔ یہ مولانا کی گرفتاری سے بہت پریشان ہوئی۔ اس زمانے میں ایمن آباد (ضلع گوجرانوالہ) کا دیوان جوالا سہا مہاراجہ جموں کشمیر کا وزیر تھا۔ وہ اتفاقاً چند روز پیشتر جموں سے ایمن آباد آیا تھا اور پولیس اور فوج کے کچھ لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ سکھدیئی نے اس کو مولانا کی گرفتاری کی اطلاع دی اور اُن کی رہائی کے لیے کوشش کرنے کو کہا۔ وہ بھی مولانا کا بہت احترام کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے کوشش کر کے مولانا کو اور اس پولیس کو جس نے انھیں گرفتار کیا تھا۔ اپنے ہاں ایمن آباد بلا لیا اور پولیس سے کہا کہ مولانا کا تعلق چوں کہ گوجرانوالہ سے ہے اور اسی علاقے میں انھیں گرفتار کیا گیا ہے لہٰذا ان پر گوجرانوالہ ہی میں مقدمہ چلایا جائے، لاہور یا کسی دوسری جگہ انھیں نہ لے جایا جائے۔ اب پولیس والے مولانا کو دیوان جوالا سہا کے پاس چھوڑ گئے اور دیوان صاحب مولانا کو گوجرانوالہ لے گئے۔ دیوان صاحب کا مقصد یہ تھا کہ گوجرانوالہ کے لوگ مولانا کو جانتے اور قابلِ احترام گردانتے ہیں، اس لیے ضلعی حکام ان سے کسی قسم کی سختی کا برتاؤ نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے بعد ہوا یہ کہ گوجرانوالہ کی ضلعی انتظامیہ نے مولانا کو لاہور پہنچا دیا اور

کہا کہ یہ کیس فنانشل کمشنر منٹگمری کی عدالت میں پیش ہوگا اور وہی اس کی سماعت کریں گے۔

اللہ کی ضمانت پر رہائی

لاہور میں ان کو فنانشل کمشنر منٹگمری کی عدالت میں پیش کیا گیا، وہ انھیں دیکھ کر نہایت متاثر ہوا اور کرسی پر بٹھایا۔ بیان لینے کے بعد حسب قاعدہ انھیں حوالات میں بھیج دیا گیا۔ لاہور اُن کے لیے کوئی اجنبی شہر نہ تھا۔ یہاں کے بے شمار لوگ ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے۔ انھیں گرفتاری کا پتا چلا تو فنانشل کمشنر صاحب کے دفتر کے سامنے آ بیٹھے۔ فنانشل کمشنر کو مختلف ذرائع سے مولانا کی شخصیت کا علم ہوا تو اُنھیں دوبارہ عدالت میں طلب کیا اور کہا۔

"آپ کا کوئی ضامن ہے تاکہ آپ کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے"؟

فرمایا "ہاں — !"

پوچھا "کون"؟

آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر جواب دیا۔ "میرا ضامن اللہ تعالیٰ ہے"۔

اس پر مسل خواں اور دیگر اہل کار جو وہاں موجود تھے، مسکرائے، لیکن فنانشل کمشنر کے دل پر اس کا بے حد اثر ہوا، اور کہا۔

"اچھا تو ہم آپ کو اسی کی ضمانت پر رہا کرتے ہیں"— اس کے بعد انھیں رہا کر دیا۔[۲۴]

دوبارہ نظر بندی اور وعظ کی بندش

۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ نہایت نازک اور پُر آشوب تھا۔ انگریزی حکومت اس قدر حسّاس ہوگئی تھی کہ ذرا سی شکایت اور شبہے پر بڑے سے بڑے آدمی کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیتی تھی۔ علمائے کرام کو بالخصوص نشانۂ ستم بنایا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ ملک میں بغاوت پھیلانے کا ذمے دار یہی گروہ ہے۔ مولانا غلام رسول کے بارے میں بھی بعض لوگوں نے حکومت کے کان بھرنا شروع کر دیے اور کہا گیا کہ یہ شخص وہابی ہے اور انگریزی حکومت کا مخالف ہے۔ اس وقت وہابی اور باغی کے ایک ہی معنی لیے جاتے تھے۔ چنانچہ مولانا کو ان کے گاؤں میں نظر بند کر دیا گیا۔ کافی عرصہ نظر بند رہے۔ نہ

۲۴۔ سوانح مولوی غلام رسول، ص ۶۶

کہیں جانے کی اجازت تھی نہ وعظ و نصیحت کی۔

اس کے بعد حالات معمول پر آئے تو نظر بندی بھی ختم کر دی گئی اور وعظ و نصیحت کی اجازت بھی دے دی گئی۔

حج بیت اللہ اور سندِ علم حدیث

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول علم حدیث پڑھنے کے لیے میاں سید نذیر حسین کی خدمت میں دہلی گئے تو ان کے قیام دہلی ہی کے زمانے میں رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ (مئی ۱۸۵۷ء) میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت ہوگئی تھی جس میں ہندوستان کی تمام قوموں نے حصہ لیا تھا۔ مولانا غلام رسول کو حضرت میاں صاحب نے جو سند عطا کی اس میں مرقوم ہے کہ انھوں نے ۱۲۷۳ھ میں اُن سے کچھ حصہ صحیح بخاری کا اور صحیح مسلم کا مقدمہ پڑھا۔ لکھا ہے کہ مولوی عبداللہ المعروف غلام رسول نہایت ذہین و طباع ہیں۔ حد نیک اور بلند اخلاق و عالی کردار شخص ہیں۔ میاں صاحب نے ان کو صحاح ستہ اور تمام کتب حدیث پڑھانے کی اجازت دی اور تلقین فرمائی۔ —— یہ سند ماہِ ربیع الثانی ۱۲۷۹ھ کو تحریر فرمائی گئی، یعنی سالِ تعلیم سے چھ سال بعد اس کا اجرا ہوا۔

اس سے تقریباً دس سال بعد ۱۲۸۸ھ کو مولانا غلام رسول حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں مولانا عبدالغنی مجددی کا سلسلۂ درس جاری تھا جو ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ حضرت میاں نذیر حسین کی طرح مولانا عبدالغنی مجددی بھی حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کے شاگرد تھے اور ہندوستان اور دیارِ عرب کے بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور علم حدیث پڑھا تھا۔ مولانا غلام رسول نے بھی مدینہ منورہ جا کر ان سے تفسیر، حدیث اور دیگر علوم متداولہ کی سند حاصل کی۔[25] ——

---

[25] میاں سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبدالغنی مجددی کی یہ دونوں اسناد (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

حج بیت اللہ کو روانگی کے وقت مولانا غلام رسول کی عمر ۵۶ برس کی تھی۔ پانچ افراد اور تھے جو ان کے ہم رکاب تھے۔ اور یہ کل چھ افراد کا قافلہ تھا جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھا۔

۱۔ خود مولانا غلام رسول۔
۲۔ ان کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد۔
۳۔ بڑی صاحب زادی۔
۴۔ مولانا کے داماد مولوی محمد عثمان۔
۵۔ ایک طالب علم محمد قاسم۔
۶۔ چودھری حاکم سکنہ لدھیوالہ وڑائچ ضلع گوجرانوالہ۔

چودھری حاکم جہاز ہی میں بیمار پڑ گئے تھے، دس دن بیمار رہے اور جہاز ہی میں وفات پا گئے۔ ان کے ایام بیماری میں مولانا غلام رسول نے ان کی بہت خدمت کی۔ وفات کے وقت انھوں نے اپنا تمام سامان مولانا کے سپرد کر دیا تھا اور اختیار دے دیا تھا کہ جسے چاہیں اللہ کی راہ میں دے دیں۔ لیکن مولانا ان کا سامان واپس لائے اور ان کے گھر والوں کے حوالے کر دیا۔

اپنے وطن سے چل کر مولانا اور ان کے ساتھی پہلے مکہ معظمہ گئے اور سعادتِ حج حاصل کی، بعد کو عازمِ مدینہ منورہ ہوئے۔ وعظ و نصیحت کا سلسلہ جہاز میں بھی جاری رہا اور حرمین شریفین میں بھی۔۔۔ ابکہ حرمین شریفین میں اس میں اور تیزی آگئی تھی۔

سلسلۂ تدریس اور چند شاگرد

مولانا غلام رسول تفسیر، حدیث، فقہ اور منطق و فلسفہ وغیرہ تمام علومِ مروجہ میں کامل دست گاہ رکھتے تھے اور قلعہ میہاں سنگھ میں ان کا باقاعدہ سلسلۂ تدریس جاری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) جو انھوں نے مولانا غلام رسول کو دیں یہ "سوانح حیات مولوی غلام رسول" کے صفحہ ۳۵، ۳۶ اور ۳۷ پر درج ہیں۔

تھا۔ بیس سے لے کر تیس ایسے طالب علم ہمیشہ ان کے درس میں موجود رہتے جن کا تعلق گاؤں سے باہر کے علاقوں اور دُور کے قصبات و دیہات سے تھا۔ ان طلبا کی کفالت خود مولانا ہی کرتے اور ان کے خورد ونوش کے تمام انتظامات انہی کے ذمّے تھے۔ مقامی لوگ اور قرب وجوار کے بھی بہت سے حضرات ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں نے اپنے علاقوں میں بہت کام کیا۔ ہمیشہ خدمتِ علم میں مصروف رہے اور اپنے دور کی اہم شخصیتوں میں ان کا شمار ہوا۔ مولانا کے سوانح نگار نے ان کے متعدد تلامذہ اور فیض یافتگان میں سے مختلف علاقوں کے بائیس افراد کی ایک فہرست درج کی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کے نام انھیں یاد رہ گئے ہیں اور جو علم وعمل میں خاص شہرت کے حامل ہیں۔

(۱) مولانا علاؤ الدین گوجرانوالہ (۲) مولوی محمد عظیم اللہ موضع برن ضلع میرپور (۳) مولوی محمد عثمان سکنہ فتح گڑھ چوڑیاں ضلع گورداسپور (۴) مولوی محمد موضع بکن ضلع گوجرانوالہ (۵) مولوی قطب الدین ضلع فیروز پور (۶) مولوی محمد علی میر واعظ سکنہ لوپڑ، ضلع گوجرانوالہ (۷) مولوی محمود شاہ واعظ سکنہ ڈھینڈہ ضلع ہزارہ (۸) مولوی بدر الدین سیالکوٹ (۹) مولوی بدر الدین ساکن گکھڑ ضلع گوجرانوالہ (۱۰) مولوی احمد علی کوٹ بھوانیداس ضلع گوجرانوالہ (۱۱) مولوی شمس الدین جموں کشمیر (۱۲) حافظ کرم الدین جموں کشمیر (۱۳) حافظ ولی اللہ لاہور (۱۴) مولوی عبدالعزیز ناظم انجمن اہل حدیث لاہور و بانی انجمن حمایت اسلام لاہور، (۱۵) حافظ گوہر دین سکنہ لوکھر ضلع گوجرانوالہ (۱۶) حافظ غلام محمد سدھا کمبوہ ضلع شاہ پور (۱۷) مولوی بُرہان الدین جہلم (۱۸) مولوی محمد لقمان جہلم (۱۹) مولوی نور احمد سکنہ کمائی ضلع جہلم (۲۰) مولوی نور احمد چنیوٹ (۲۱) مولوی غلام حسین سکنہ ساہو والا چیمہ ضلع سیالکوٹ (۲۲) مولوی عمر الدین گوجرہ ضلع لائل پور۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بزرگ تھے جو مولانا غلام رسول سے مستفید ہوئے اور جنھوں نے اپنے عہد اور علاقے میں دینی وعلمی خدمات انجام دیں اور عمل وکردار کی وہ روشنی پھیلائی جو عالی قدر استاذ کے فیضِ صحبت سے انھیں حاصل ہوئی تھی۔

نقطۂ نظر کی اصابت

اختلافی اور نزاعی مسائل کے اظہار و تبیین میں مولانا کا نقطۂ نظر انتہائی اصابت فکر کا عکاس اور ذہنی سلجھاؤ کا غماز تھا۔ بعض لوگ دورانِ درس یا اثنائے وعظ میں ان سے اس انداز سے اختلافی مسائل پوچھتے کہ جس سے ان کا مقصد دو فرقوں میں باہم تصادم پیدا کرنا اور ایک دوسرے سے الجھانا ہوتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی قابلیت اور صحتِ دماغی سے نوازا تھا کہ سائل کو ایسا جواب دیتے جس سے وہ قطعاً خاموش ہو جاتا اور اپنے مقصدِ فساد و شر میں کامیاب نہ ہو پاتا۔ ایک مرتبہ وعظ کہہ رہے تھے کہ ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ مقلد اور غیر مقلد کے بارے میں فرمایئے کہ دونوں میں حق پر کون ہے؟

مولانا نے اس کا نہایت عمدہ جواب دیا۔ فرمایا: یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے اس کی مثال ایک ایسے تالاب کی ہے، جس سے پانی کی چار نالیاں نکلتی ہیں، جو شخص جس نالی سے بھی پانی پیئے گا وہ تالاب ہی کا پانی ہوگا، اور جو شخص براہ راست تالاب سے پیئے گا وہ بھی وہی پانی ہوگا۔ یہی حال مقلد اور غیر مقلد کا ہے کسی نے بعض مسائل میں براہِ راست حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر عمل کر لیا اور کسی نے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی وساطت سے عمل کر لیا، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ دل کی تہہ میں یہ حقیقت راسخ رہنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کے مقابلے میں کسی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ائمہ مجتہدین کا بھی یہ فرمان ہے کہ آنحضرت کے ارشاد و عمل سے ان کا قول یا فعل متصادم ہو تو اس کو بالکل نہ مانا جائے۔

مولانا نے فرمایا، فقہی مسائل بیان کرتے وقت لوگوں میں تفریق پیدا کرنی اور ناحق کسی کی تکفیر کرنی بہت بڑی معصیت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ جب حضرت موسیٰ تورات لینے کے لیے اللہ کے حکم سے کوہِ طور پر گئے تو بعد میں بنی اسرائیل نے سامری کی شرارت میں آکر بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ حضرت موسیٰ واپس آئے تو صورت حال دیکھ کر

بھائی پر خفگی کا اظہار کیا۔ حضرت ہارون نے جواب دیا کہ میں نے اس لیے خاموشی اختیار کی کہ :

اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (طٰہٰ : ۹۴)

مجھے اندیشہ ہوا کہ تم یہ کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان تفریق ڈال دی۔

یعنی پیغمبر بھی معصیت تفرقہ کے ارتکاب سے ڈرتے تھے۔

مولانا وعظ میں منفی انداز اختیار کر کے کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے، مثبت انداز میں وعظ فرماتے۔ نہ خواہ مخواہ کسی کی تکفیر فرماتے اور نہ ایسی بات زبان سے نکالتے جو مسلمانوں کے درمیان تفریق پیدا کرنے کا باعث بنتی ہو۔ وہ صاف ستھرے انداز میں مسائل بیان کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہزاروں لوگ ان کی تقریر سننے کے لیے آتے اور گناہوں سے تائب ہوتے۔ غیر مذہب کے لوگ بھی کثیر تعداد میں ان کی باتوں سے متاثر ہوتے اور کفر کو ترک کر کے اسلام قبول کرتے۔

مکتوبات

مولانا غلام رسول کے مکتوبات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس زمانے کے دستور اور رواج کے مطابق یہ تمام مکتوبات فارسی زبان میں ہیں۔ مولانا فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ چنانچہ بعض مکتوب فارسی نظم میں ہیں۔ بعض مکتوب مولانا عبداللہ غزنوی کے نام ہیں، بعض اپنے شاگردوں مثلاً مولانا علاء الدین گوجرانوالہ اور حکیم نبی بخش وغیرہ کے نام ہیں۔ بعض اپنے عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے گئے ہیں، اور بعض ارادت مند حضرات کے نام مرقوم ہیں۔ ایک خط ایک ہندو کو لکھا گیا ہے جس کا نام رام دتہ ٹانڈو تھا اور حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) کا رہنے والا تھا۔ یہ خط بھی فارسی میں ہے اور اس کے ایک مذہبی استفسار کے جواب میں ہے۔ یہ ایک تفصیلی خط ہے۔ اس خط سے پتا چلتا ہے کہ مولانا ہندوؤں کی مذہبی کتابوں اور ان کے مذہبی افکار و تصورات سے بھی باخبر تھے۔

یہ مکتوبات مختلف مسائل اور نصائح پر مشتمل ہیں۔ بعض میں فقہی مسائل بیان کیے گئے

ہیں، بعض میں تصوّف وسلوک کے نکات حل کیے گئے ہیں اور بعض میں اختلافی معاملات کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

قبولیت دُعا اور تقرب الٰہی

مولانا غلام رسول بے شمار خصوصیات کے حامل اور بہت بڑے عالم و فقیہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بلاشبہ اللہ کے مقرّب اور ولی تھے۔ ان کی زبان میں بے پناہ اثر تھا اور اللہ ان کی دُعا کو شرفِ قبولیت بخشتا تھا۔ اس سلسلے میں ان سطور کے راقم نے بہت سی باتیں متعدد ثقہ لوگوں سے سُنی ہیں اور اُن کے سوانح نگار مولوی عبدالقادر نے بھی (جو اُن کے بڑے صاحب زادے تھے) تہتّر واقعات درج کیے ہیں، جو نہایت عجیب و غریب ہیں۔ قبولیت دُعا اور تقرب الٰہی سے متعلق چند واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ موضع ستراہ سندھواں ضلع سیالکوٹ کے ایک شخص کا نام "عمرا" تھا جو گھار برادری سے تعلق رکھتا تھا اور کثیر العیال تھا لیکن آمدنی بہت کم تھی جس کی وجہ سے وہ زیادہ تر تنگ دستی اور غربت کا شکار رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک مرتبہ وہاں مولانا غلام رسول تشریف لے گئے۔ عمرا ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور تنگیٔ معاش کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ کثرت سے بلا تعداد پڑھا کرو، وضو ہو یا نہ ہو اس کی کوئی شرط نہیں، لیکن اس کے معنوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے (یعنی اے اللہ! جو ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے، میں تیری رحمت سے تجھ سے فریاد کرتا ہوں) اگر ایسا کرو گے تو اللہ فضل کرے گا۔

اس نے اس پر عمل کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں مال دار ہو گیا۔ موضع ستراہ میں اچھی خاصی زمین بھی خرید لی[26]

---

[26] اس دعا کے بارے میں راقم الحروف بھی اپنا ایک ذاتی واقعہ اور تجربہ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

۲۔ سلیمان ایک بنگالی طالب علم تھا جو تمام عمر مولانا کی خدمت میں رہا، ان کی وفات کے بعد بیت اللہ شریف چلا گیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ مولانا کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد ایک شخص شیخ غلام حسین بھیروی کے دو ہزار روپے کے مقروض تھے۔ وہ قرض جلدی ادا نہ کر سکے تو شیخ غلام حسین نے دعویٰ کر کے ڈگری حاصل کر لی، اور حکیم غلام محمد کو عدالت نے جیل بھجوا دیا۔ مولانا غلام رسول اس وقت گاؤں میں موجود نہ تھے۔ اسی روز عصر کے قریب تشریف لائے اور سنتِ نبوی ؐ کے مطابق پہلے مسجد میں آئے۔ حکیم صاحب کے بارے میں پوچھا کہ کہاں ہیں۔ سلیمان بنگالی نے تمام واقعہ بیان کیا۔ مولانا کو اس سے نہایت ذہنی کوفت ہوئی۔ نمازِ عصر سے فارغ ہوئے تو سلیمان سے کہا "پانی کا ایک لوٹا بھر لو اور میرے ساتھ آؤ"۔ گاؤں سے کچھ دور جا کر اپنے گرد ایک حصار کھینچا، اسی میں وضو کیا، قبلہ رو ہو کر بیٹھ گئے اور کچھ پڑھنے لگے۔ سلیمان بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مغرب کی طرف سے سفید لباس میں ملبوس ایک شخص آیا اور اس نے مولانا کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ آپ نے فرمایا "مجھے دو ہزار کی ضرورت ہے"۔ اس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) بیان کرنا چاہتا ہے۔ میں ہفت روزہ الاعتصام کا ایڈیٹر تھا، جنوری ۱۹۵۸ء میں میں نے اپنا ایک سہ روزہ اخبار "منہاج" جاری کر لیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ملک میں ایوب خان نے مارشل لا جاری کر دیا اور نیوز پرنٹ کنٹرول میں آگیا۔ "منہاج" چوں کہ نیا نیا جاری ہوا تھا اس لیے اُسے کنٹرول ریٹ میں اخباری کاغذ نہیں مل سکتا تھا، اخباری کاغذ پرانے اخباروں کو ملتا تھا۔ میں نے یہ اخبار تنگ آ کر اپریل ۱۹۵۹ء میں بند کر دیا۔ حساب کیا تو میں تین ہزار روپے کا مقروض تھا۔ "الاعتصام" سے مجھے اس زمانے میں دو سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور یہ قرض، جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی، ادا کرنا نہایت مشکل تھا۔ میں نے مولانا محمد علی لکھوی مرحوم کو جو مدینہ منورہ میں مقیم تھے، خط لکھا اور دُعا کے لیے درخواست کی۔ اُنھوں نے فوراً جواب دیا اور یہی وظیفہ اسی طرح بتایا جیسا کہ اوپر مذکور ہے۔ میں نے اس پر عمل کیا اور چند ماہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ میں قرض سے سبکدوش ہو گیا اور تمام مالی تکلیفیں ختم ہو گئیں۔

کہا "ہزار روپیہ دینے والے نے کہا ہے کہ باقی روپے (قرض خواہ) چھوڑ دے گا۔"
آپ اسی وقت وہاں سے اُٹھے اور شیخ غلام حسین کو تلاش کر کے ہزار روپیہ دیا
اور فرمایا "باقی روپے میں جلد ہی ادا کر دوں گا۔" شیخ غلام حسین نے ایک ہزار
روپیہ وصول کیا اور باقی ہزار چھوڑ دیا۔ مولانا گئے اور حکیم صاحب کو جیل سے رہا
کرا کے گھر لے آئے۔

۳۔ علاقہ شاہ پور کے موضع سدرہ میں ایک بزرگ حافظ غلام محمد سکونت پذیر تھے۔ وہ بیان
کرتے ہیں کہ ان کے گاؤں سدرہ کے قریب ایک گاؤں "کوٹلی" ہے۔ کوٹلی کا ایک زمیندار
لاولد تھا۔ وہ اپنی بیوی اور راہنی حافظ غلام محمد کے ساتھ مولانا غلام رسول کی
خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "اللہ سے دُعا کریں وہ مجھے اولاد عطا فرمائے۔"
مولانا نے اسی مجلس میں دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، دُعا کے بعد فرمایا "شاید
اللہ تعالیٰ تمہیں لڑکی عطا کرے گا۔" چنانچہ دُعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے
لڑکی عطا فرمائی۔

۴۔ مولانا غلام رسول کے سوانح نگار مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں کہ قلعہ میہاں سنگھ
میں ایک حافظِ قرآن لڑکوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے۔ ان کے چہرے پر
چنبل ہو گیا۔ بہت علاج کرایا لیکن صحت یاب نہ ہوئے۔ ایک دن انھوں نے
مولانا سے عرض کیا تو آپ نے دیکھ کر دریافت فرمایا "کوئی علاج نہیں کرایا۔؟"
کہا "بہت علاج کرائے، سال بھر سے علاج کرا رہا ہوں مگر بجائے فائدے کے
مرض بڑھ گیا ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے، اب خدائی علاج چاہتا ہوں۔"
آپ نے اسی وقت دم کیا اور فرمایا "متواتر تین دن دم کراؤ۔" حافظ صاحب
نے مولانا کے فرمان کے مطابق تین دم کرایا اور بالکل صحت یاب ہو گئے۔

۵۔ قلعہ میہاں سنگھ کے حاجی کرم الٰہی کا بیان ہے کہ ان کی شادی کے موقعے پر
ان کی والدہ کا زیور گم ہو گیا، جہاں رکھا تھا، بار بار وہاں دیکھا، اور جگہوں میں
بھی دیکھا مگر نہ ملا۔ حاجی صاحب ممدوح کی والدہ مولانا کی خدمت میں حاضر

ہوئیں اور زیور کی گم شدگی کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا "جہاں رکھا تھا وہیں پڑا ہے۔" چنانچہ جا کر دیکھا تو وہیں پڑا تھا۔

۶۔ ضلع سیالکوٹ کے موضع ستراہ سندھواں کے چودھری محمود خان بیان کرتے ہیں کہ ابتدا میں اس کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ مولانا ایک مرتبہ وہاں تشریف لے گئے تو اس نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنی مالی کمزوری کا ذکر کیا۔ فرمایا "اللہ الصمد ہر روز بلا تعداد پڑھا کرو اور نماز تہجد بھی باقاعدہ پڑھا کرو۔" چودھری محمود خاں کا بیان ہے کہ اس نے اس پر عمل کیا اور چند ہی روز میں مال دار ہو گیا۔ یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ اتنی دولت کہاں سے آئی۔ مولانا نے تہجد پڑھنے کا حکم دیا تھا نماز تہجد بھی بالالتزام پڑھنے لگا۔ چودھری محمود خاں کا کہنا ہے کہ اگر کسی دن عمداً سو بھی جاؤں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تہجد کے لیے مجھے خود جگا رہے ہیں۔

۷۔ قلعہ میہاں سنگھ کا ایک درزی امام الدین کہتا ہے کہ وہ بالکل کند ذہن اور ان پڑھ تھا۔ اس کا بڑا بھائی عبداللہ ایک دن اسے مولانا کے پاس لے گیا اور اس کا حال بیان کیا۔ آپ نے فرمایا "لوٹے میں تھوڑا سا پانی لاؤ۔" پانی لایا گیا تو آپ نے اس پر دم کیا اور فرمایا "لو امام الدین اس کو پی جاؤ، تم تھوڑا بہت حساب کتاب سیکھ جاؤ گے۔" امام الدین کہتا ہے کہ اللہ کے فضل اور مولانا کی دعا سے اسی دن سے مجھ میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ حساب کتاب بھی کر لیتا ہوں اور معمولی خط و کتابت بھی کر سکتا ہوں۔

۸۔ ایک شخص ملا کرم داد جو ملتان میں دکان دار تھا کہتا ہے کہ میرا والد مولانا کی خدمت میں گیا اور عرض کیا کہ ہم مختلف مقامات پر مال تجارت لینے جاتے ہیں تو راستے میں چوری وغیرہ ہو جاتی ہے، کوئی وظیفہ بتا دیجیے تاکہ ہمارا مال محفوظ رہے۔ فرمایا "تم جہاں رات کو ٹھہرو، اپنے مال کے گرد ایک سو مرتبہ "یا محیط" پڑھ لیا کرو۔" وہ کہتا ہے کہ ہم یہ عمل کرتے رہے اور ہمیشہ سلامتی کے ساتھ مال لے کر گھر پہنچے۔

رہے ، ہمارا کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا ، جب کہ ہمارے ساتھیوں کا کئی دفعہ نقصان ہوا ۔

۹ ۔ موضع کوٹلی منگھ بھبڑاں (ضلع گوجرانوالہ) کے ایک زمیندار "بلندا" کا بیان ہے کہ اس کا بھائی علی گوہر ایک مدت تک بخار میں مبتلا رہا ۔ اطبا نے تشخیص کی کہ اسے دِق اور سِل کی بیماری ہو گئی ہے ۔ طبی علاج سے نا اُمید ہو کر وارث اس کو مولانا کے پاس لے گئے اور عرض کیا کہ طبیب اس کو مدقوق اور مسلول قرار دیتے ہیں ، فرمایا "طبیبوں نے تشخیص میں غلطی کی ہے ، اسے معمولی سا بخار ہے ۔" اس کے بعد پانی دم کر کے اسے پلایا اور اسی روز بخار اُتر گیا اور مریض اچھا بھلا ہو گیا ۔

۱۰ ۔ بعض ہندو یا سکھ اپنے بچوں کو سودا وغیرہ لینے کے لیے اگر کسی ایسی دکان پر بھیجتے جو مولانا کی مسجد کی طرف ہوتی تو انھیں تاکید کرتے کہ مسجد کے قریب سے "واگرو واہگرو یا رام رام" کرتے جانا اور جلدی سے نکل جانا ۔ ایک دن ایک ہندو لڑکی والدین کی ہدایت کے مطابق بھاگتی ہوئی جا رہی تھی اور "رام رام" کا لفظ اس کی زبان پر تھا ۔ مولانا کے پاس سے گزری تو فرمایا "یا اللہ یا اللہ کہو ، یہ کیسا پیارا لفظ ہے ۔" چنانچہ "یا اللہ یا اللہ" کے الفاظ اس کی زبان سے جاری ہو گئے اور یہی الفاظ ادا کرتی ہوئی گھر پہنچی ۔ والدین بے حد پریشان ہوئے اور اُسے بار بار کہا کہ "رام رام" کہو ، مگر لڑکی مسلسل "یا اللہ یا اللہ" کہتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی گھر والوں سے کہتی تھی کہ تم بھی "یا اللہ یا اللہ" کہو ، یہ بڑا پیارا لفظ ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے اور سب کی زبان سے "یا اللہ یا اللہ" کے الفاظ ادا ہونے لگے ۔

۱۱ ۔ گجرات کا ایک موچی لاہور میں اپنا کوئی کام کاج کرتا تھا ۔ اتفاقاً مولانا لاہور تشریف لائے اور وعظ فرمایا ۔ وعظ میں آپ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں حضرت یحییٰ کی پیدائش کا قصّہ بیان کیا ۔ اس وقت گجرات کا موچی بھی موجود تھا ، وہ دورانِ وعظ ہی میں اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا "حضرت ! اب بھی ایسا

ہو سکتا ہے ؟ " فرمایا " ہاں اب بھی اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر ہے "۔ موچی نے کہا " تو میرا حال بعینہٖ حضرت زکریا علیہ السلام کا سا ہے ۔ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوں ۔ آپ میرے لیے دُعا فرمائیں ، شاید آپ کی دعا کی برکت سے میرے گھر لڑکا پیدا ہو جائے "۔ آپ نے دُعا فرمائی اور لوگوں نے آمین آمین کہا ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کو لڑکا عطا فرمایا ۔ اس نے مولانا کو اطلاع دی تو آپ نے اس کا نام " اللہ دتا " رکھا ۔ وہ لڑکا حافظِ قرآن ہوا۔

۱۲ ۔ ایک دن مولانا لاہور میں کہیں وعظ فرما رہے تھے ۔ دو گورے عیسائی ، سکھ اور چند ہندو بھی وعظ میں موجود تھے ۔ وعظ میں سورہ مریم کی چند آیات تلاوت کیں ، اور ہرقل کے دربار میں قریش مکہ کی سفارت کا ذکر کیا ۔ حضرت جعفر طیار سے ہرقل نے جس انداز سے بات کی اور کلمۂ شہادت سُنا ، وہ بتایا تو ساتھ ہی اس طرح زوردار اور پُرکشش آواز میں کلمۂ شہادت پڑھا کہ سُننے والوں میں ایک تہلکہ بپا ہو گیا اور ہندو ، مسلمان ، گورے عیسائی اور سکھ شدّتِ تاثر سے تڑپنے لگے ۔ اُس وعظ میں جتنے بھی غیر مسلم موجود تھے ، سب مسلمان ہو گئے ۔

۱۳ ۔ لاہور ہی کا واقعہ ہے کہ آپ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر وضو کرنے کی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سکھ عورت " واہگرو واہگرو " کہتی ہوئی وہاں سے گزری ۔ آپ نے فرمایا " وحدہٗ وحدہٗ " کہو ۔ اس عورت کی زبان پر " وحدہٗ وحدہٗ " جاری ہو گیا ۔ گھر والوں نے اُسے بہت سمجھایا اور مار پیٹ بھی کی ، مگر وہ باز نہ آئی اور مسلمان ہو گئی ۔

۱۴ ۔ ایک مرتبہ مولانا ضلع گجرات میں سفر کر رہے تھے کہ ایک سکھ نے آپ سے پوچھا " موضع ڈنگہ کا راستہ کون سا ہے ؟ " فرمایا " بھائی مجھے ڈنگوں کا راستہ تو یاد نہیں ، البتہ سیدھوں کا یاد ہے "۔ اس نے کہا " سیدھوں ہی کا بتا دو " فرمایا سیدھوں کا راستہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے "۔ اِدھر مولانا کی زبان سے یہ نکلا اور اُدھر سکھ کی زبان پر یہی کلمہ جاری ہو گیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا ۔

۱۵ ۔ موضع دلاور چیمہ (ضلع گوجرانوالہ) کے ایک بڑے زمیندار اور دولت مند سکھ کا

نوجوان بیٹا مولانا کا وعظ سُن کر مسلمان ہو گیا اور اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اس سکھ نے ولاور جیمیہ اور علی پور میں اعلان کرادیا کہ کوئی پنڈت یا گرنتھی قلعہ میہاں سنگھ والے مولوی صاحب سے بحث کرکے ان کو شکست دے دے اور میرے بیٹے کو دوبارہ سکھ مذہب قبول کرنے پر آمادہ کرلے تو میں اس کو کئی ایکڑ زمین اور پانچ سو روپے نقد انعام دوں گا۔ علی پور کے ایک پنڈت نے یہ اعلان سُنا تو لالچ میں آکر مولانا سے بحث کے لیے تیار ہو گیا۔ سکھ زمیندار نے پانچ سو روپے نقد جمع کرا دیے۔ اس کے لیے دستاویز لکھ دی اور پنڈت کو ساتھ لے کر قلعہ میہاں سنگھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ بہت سے اور لوگ بھی جن میں غیر مسلم بھی تھے اور مسلمان بھی بحث سننے اور نتیجہ معلوم کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ چل پڑے — یہ لوگ قلعہ میہاں سنگھ پہنچے تو مولانا غلام رسول اپنے بالاخانے پر تشریف فرما تھے اور ایک طالب علم کو شیخ سعدی کی مشہور کتاب بوستان کا وہ سبق پڑھا رہے تھے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ پنڈت نے آتے ہی مولانا سے ایک سوال کیا۔ آپ نے فرمایا، تشریف رکھیے، آپ کی تشریف آوری سے بہت خوشی ہوئی۔ طالب علم کے سبق سے فارغ ہو جاؤں تو آپ سے بات ہوگی، جو جی چاہے سوال کریں، میں انشاء اللہ نہایت خوشی سے جواب دوں گا۔ یہ الفاظ کہہ کر اس شعر کی طرف متوجہ ہوئے۔ ؎

دریں بحر جز مرد راعی نرفت
گم آں شد کہ دنبال داعی نرفت

کہتے ہیں یہ شعر پڑھتے ہی مولانا کا اسلوبِ بیان بدل گیا اور مجلس کا انداز کچھ اور ہی رنگ اختیار کر گیا۔ تقریر میں اللہ نے ایسی تاثیر بھر دی کہ سامعین یوں محسوس کر رہے تھے کہ درو دیوار سے کلمۂ شہادت کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پنڈت جی اور اُن کے ساتھی بے جان تصویر بنے ہوئے مولانا کا منہ تک رہے تھے اور سب کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ ناگہاں پنڈت نے شور مچانا شروع کر دیا، "مجھے لے چلو، مجھے لے چلو"

کچھ لوگوں نے پنڈت کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور بڑی مشکل سے بالاخانے سے نیچے اتارا۔ پنڈت پر مدہوشی سی طاری تھی۔ جب وہ کچھ ہوش میں آیا تو اس سکھ زمیندار نے جو اُسے لے کر گیا تھا اور اس کے ساتھیوں نے اس سے دریافت کیا، تم بڑی شان اور ادّعا سے وہاں گئے تھے، لیکن جاتے ہی خاموش ہو گئے اور کوئی بات کہے بغیر لوٹ آئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ پنڈت نے جواب دیا: میں اسلام کے خلاف اکیس اعتراض سوچ کر گیا تھا جو میرے نزدیک بڑے مضبوط تھے، لیکن مولوی صاحب کے سامنے جاتے ہی تمام باتیں ذہن سے نکل گئیں۔ ان کی تقریر میں کچھ ایسا جادو بھرا ہوا تھا کہ خود میرے دل میں ایک کہرام سا بپا ہو گیا، ان کے مذہب کی سچائی میرے دل میں پیوست ہونے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ میرا مذہب صحیح نہیں ہے۔ مولوی صاحب کی طرف سے ایک روشنی سی میری طرف بڑھ رہی تھی اور میرے مذہب کے آثار مٹنا شروع ہو گئے تھے۔ اگر چند ثانیے مزید ان کے سامنے بیٹھا رہتا تو میں کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔

اس کے بعد بہت سے لوگوں نے پنڈت جی کو مولانا کی خدمت میں لے جانے اور ان سے بحث و مناظرہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے اور صاف لفظوں میں کہا کہ میں ہرگز مولوی غلام رسول سے بحث و مناظرہ نہیں کروں گا۔

۱۶۔ یہی عبداللہ نومسلم جن کے سکھ والد کے کہنے پر پنڈت مذکور مولانا سے بحث کرنے گئے تھے، بیان کرتے ہیں کہ مولانا کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے ایک مسلمان خاندان میں شادی کر لی تھی۔ قبولِ اسلام سے پہلے بھی وہ شادی شدہ تھے۔ ایک دن وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے پوچھا "کہو میاں عبداللہ مع اہل و عیال کے خوش ہو" عرض کیا "حضرت! میری پہلی بیوی بہت سلیقہ شعار اور تابعدار تھی، مجھے وہ بہت یاد آتی ہے آپ دُعا فرمائیں وہ بھی اسلام قبول کر لے اور میرے پاس آ جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو

بہت ہی اچھا ہے ورنہ دن تو گزر ہی رہے ہیں۔"
فرمایا "میاں عبداللہ! جس ذاتِ اقدس نے تم کو ہدایت دی ہے وہ اس کو بھی ہدایت دینے پر قادر ہے۔ گھبراؤ نہیں، ان شاء اللہ جلد ہی تمھاری مراد پوری ہوگی۔ اب تم گھر جاؤ۔"
عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مولانا کے حسب فرمان گھر چلے آئے، ابھی ایک ہی دن گزرا تھا کہ ان کی پہلی بیوی نے ایک شخص کے ہاتھ ان کو خط لکھ کر بھیجا کہ فلاں دن اور فلاں وقت آکر اُسے لے جاؤ ___ وہ گئے اور اُسے ساتھ لے کر مولانا کی خدمت میں قلعہ میہاں سنگھ حاضر ہوئے اور وہ مسلمان ہوگئی۔
۱۷۔ موضع ستراہ سدھواں (ضلع سیال کوٹ) کے چودھری محمود خاں کہتے ہیں کہ ان کے گاؤں کے برہمن نے ان سے کہا کہ سنا ہے جو غیر مسلم مولوی صاحب کا درشن کرنے آتا ہے وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا "بات تو ایسی ہی ہے۔" برہمن نے کہا "کسی دن ہم کو بھی ان کا درشن کرانا" ___ چند روز بعد مولانا تشریف لے آئے اور چودھری محمود خان نے ان سے برہمن کی بات بیان کی ___ فرمایا "اگر کوئی وقت آیا تو میں کہوں گا، تم انھیں بلا لانا" ___ جمعے کا دن تھا، مولانا وعظ فرما رہے تھے کہ محمود خاں کو حکم دیا "برہمن کو بلا لاؤ، کوئی اور غیر مسلم آنا چاہے تو وہ بھی آجائے" ___ حسب ارشاد محمود خاں گئے، برہمن سے کہا اور اس کو لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں آیا۔ دو اور غیر مسلم ان کے ساتھ آگئے۔ جوں ہی وہ مولانا کے سامنے آئے، حالانکہ انھوں نے وعظ کا کوئی لفظ نہیں سنا تھا، ان کو دور سے دیکھتے ہی کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کر دیا۔
محمود خان کہتے ہیں کہ ایندھن کاٹنے کے لیے وہ ایک کلہاڑی برہمنوں سے مانگ کر لاتے تھے۔ انھوں نے وہ کلہاڑی واپس کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن برہمنوں نے نہیں لی اور کہا کہ اس کلہاڑی سے جو لکڑیاں کاٹ کر بھیجی لائی گئی ہیں، ان سے مولوی صاحب کے لیے کھانا پکایا گیا ہے۔ ممکن ہے اس کو دیکھ کر

اور ہاتھ لگا کر ہی ہم مسلمان ہو جائیں۔

۱۸۔ گوجرانوالہ کے دو میاں بیوی اپنی چودہ سالہ لڑکی کو لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان کی لڑکی کے سر پر کوئی بال نہیں ہے اور یہ بالکل گنجی ہے اس کی شادی ہونے والی ہے، آپ دعا فرمائیں کہ اس کے سر پر بال اُگ آئیں۔

مولانا نے لڑکی سے فرمایا "بیٹی نماز پڑھا کرو، ان شاء اللہ تم جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی" لڑکی نے نماز پڑھنا شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں سر پر بال اُگ آئے اور گنجا پن ختم ہو گیا۔ دو سال بعد وہ لڑکی اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ مولانا کی خدمت میں نذرانہ لے کر حاضر ہوئی، اس کی ماں بھی ساتھ تھی ـــ مولانا نے ان سے پوچھا، "تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟" لڑکی کی والدہ نے تمام واقعہ بیان کیا۔ آپ نے پوچھا "نماز پڑھتی ہو یا نہیں؟" لڑکی نے جواب دیا "پہلے تو نماز پڑھا کرتی تھی مگر اب چند روز سے چھوٹ گئی ہے" ـــ یہ سنتے ہی آپ نے نذرانہ واپس کر دیا اور فرمایا "تمھارے جیسے لوگوں سے جو خدا سے وعدہ کر کے توڑ دیتے ہیں، مجھے کوئی سرکار نہیں"۔ ہر چند اس نے کہا، لیکن آپ نے نذرانہ قبول نہ کیا اور دونوں ماں بیٹی واپس گوجرانوالہ چلی گئیں۔ رات کو وہ لڑکی سوئی، صبح اُٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرا تو ایک بال بھی نہ تھا۔

۱۹۔ موضع کھیکی (ضلع گوجرانوالہ) کے حکیم نبی بخش کا بیان ہے کہ انھیں ایک گاؤں میں ایک ایسے مریض کے علاج کی غرض سے جانا پڑا، جو مالیخولیا میں مبتلا تھا اور جسے طبیب لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ حکیم صاحب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ بیان کیا۔ مولانا نے فرمایا علاج کرو، اللہ شافیِ مطلق ہے، شفا دے گا۔

حکیم صاحب نے اس کا علاج شروع کیا اور قدرتِ الٰہی سے ایک ہی دن کے علاج سے آدھی بیماری ختم ہو گئی، دوسرے روز مریض بالکل تندرست ہو گیا۔

حکیم صاحب باذاق آدمی تھے اور مولانا ان کی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ وہ مولانا کے پاس آئے، مریض کی صحت یابی کی اطلاع دی اور عرض کیا، وہ مریض تو

صحت یاب ہو گیا، اگر کوئی ایسا ہی مریض اور آ گیا تو پھر کیا ہو گا؟ فرمایا "اللہ تعالیٰ تمھارے علاج سے ہمیشہ ایسے مریضوں کو صحت عطا فرمائے گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد سے مالیخولیا کے جتنے بھی مریض ان کے پاس آئے اللہ نے انھیں صحت عطا فرمائی۔

۲۰۔ لاہور کے میاں محمد صاحب کہتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں وہ گھوڑوں کا بیوپار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے گھوڑے خرید کر اپنے ملازموں کو سری نگر گھوڑے فروخت کرنے کے لیے بھیجا۔ تین مہینے گزر گئے، لیکن گھوڑے فروخت نہ ہوئے میاں محمد صاحب نہایت پریشان تھے، کیوں کہ سری نگر میں ملازموں کا خرچ بھی پڑ رہا تھا اور گھوڑوں کا بھی۔ اتفاقاً مولانا غلام رسول لاہور تشریف لائے اور مسجد چینیاں والی میں وعظ کہا۔ سامعین میں میاں محمد بھی موجود تھے۔ وعظ کے بعد وہ مولانا سے ملے اور اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ فرمایا "ان شاء اللہ تیسرے روز تمھارے گھوڑے حاکم کشمیر خرید لے گا اور تمھیں تین ہزار روپے منافع ہوگا۔ میاں محمد کہتے ہیں کہ وہ تاریخ انھوں نے لکھ لی۔ جب ملازم واپس آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا کے فرمان کے تین روز بعد گھوڑے فروخت ہوئے اور حساب کیا گیا تو ٹھیک تین ہزار روپے منافع ہوا۔

۲۱۔ گورداسپور (مشرقی پنجاب) کے ایک ہندو مہنت کا نام کاہن داس تھا۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ ایک مرتبہ "موضع کالووالی" آیا جو قلعہ میہاں سنگھ کے قریب ایک گاؤں ہے۔ مہنت نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں سے قلعہ میہاں سنگھ کتنے فاصلے پر ہے؟ بتایا گیا تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ مہنت کاہن داس نے کہا، سنا ہے وہاں مولوی غلام رسول رہتے ہیں جو بہت عالم اور صوفی ہیں، میرے دل میں اسلام کے بارے میں کچھ سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ میں ان سے یہ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے بتایا کہ اُن کے پاس کئی پنڈت اور غیر مسلم بحث و مباحثہ کے لیے گئے اور مسلمان ہو گئے، آپ وہاں نہ جائیں۔ لیکن

مہنت صاحب نہیں مانے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گئے ۔ جاتے ہی سوال کیا "اسلام کیا چیز ہے"؟ فرمایا "پہلی چیز ہے کلمہ پڑھنا۔" پھر کلمہ پڑھ کر سنایا۔ کلمہ سنتے ہی مہنت کاہن داس نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد دو سال وہ مولانا کی خدمت میں قلعہ میہاں سنگھ فروکش رہے۔

اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جو مولانا غلام رسول کی طرف منسوب ہیں۔

ہم لوگوں پر مادیت نے قبضہ کر لیا ہے اور روحانیت تقریباً ختم ہو گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں سے اکثریت کے ذہن اس قسم کے واقعات کی صحت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ مولانا ممدوح ۱۲۹۱ھ میں فوت ہوئے۔ ان سطور کی تحریر تک ان کی وفات پر صرف ۱۱۵ سال گزرے ہیں اور اب سے تیس پینتیس برس پہلے ایسے کئی حضرات موجود تھے جنھوں نے مولانا کو دیکھا اور ان کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل کیا تھا، خود ان سطور کے راقم کو ایسے بزرگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان سے مولانا کے بارے میں اس قسم کی باتیں سنی ہیں۔

کرامات کے ظہور کی وجہ

مولانا غلام رسول سے بکثرت کرامات کیوں ظاہر ہوئیں اور ان کی دعا دربارِ خداوندی میں اتنی جلدی کیوں شرفِ قبولیت حاصل کرتی تھی؟ اس کے بارے میں ان کے ایک شاگرد اور مرید مولوی قطب الدین بیان کرتے ہیں کہ ایک روز وہ مولانا کی خدمت میں حاضر تھے۔ عرض کیا "حضرت! آپ سے اس درجہ بکثرت کرامات ظاہر ہونے کا سبب کیا ہے؟ پہلے بھی بہت سے بزرگ ہو گزرے ہیں، اب بھی کئی متدین اور متقی لوگ موجود ہیں، بلاشبہ ان سے بھی کرامات کا ظہور ہوتا رہا ہے، لیکن اتنی کثرت سے نہیں جتنا کہ آپ سے"۔

مولانا نے جواب دیا "جب سے مجھے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اس وقت سے کرامات ظہور میں آ رہی ہیں۔"

مولوی قطب الدین کہتے ہیں کہ اب میں نے اس خواب کی کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پہلے تو وہ کئی دن ٹالتے رہے، لیکن جب میرا اصرار بہت بڑھ گیا تو فرمایا: ایک مبارک رات کو میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، اس حالت کو نہ تو میں خواب سے تعبیر کرسکتا ہوں اور نہ اُسے عالم بیداری کہہ سکتا ہوں۔ مجھے حضور علیہ السلام نے صابن عنایت کرکے فرمایا: "اس سے اپنے کپڑے دھولاؤ"۔ میں نے حسبِ حکم کپڑے دھوئے اور پھر حاضر ہوا۔ اب حضورؐ نے مجھے مسجد کے منبر پر کھڑا کرکے ایک ہاتھ میں قرآن مجید دیا اور دوسرے میں صحیح بخاری دی۔ فرمایا "یہ لوگوں کو سناؤ، تم میرے وارث ہو"۔ — مولانا فرماتے ہیں کہ ایسی رات پھر تمام عمر نصیب نہیں ہوئی۔ اس رات جو فیوض و برکات حاصل ہوئے، وہ کبھی حاصل نہ ہوئے۔

اس قسم کے اصحابِ تقویٰ اور عابد و زاہد لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔ اللہ نے ان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا اور اپنے فضل و کرم خاص کا مستحق گردانا تھا۔

ایک اور واقعہ

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد انگریزی حکومت کے نزدیک مولانا غلام رسول کا شمار انگریز کے باغیوں میں ہونے لگا تھا۔ اس لیے انگریزی حکومت نے انھیں نظر بند کر دیا تھا اور پھر وعظ پر پابندی عاید کردی تھی۔ انگریزی حکام گاؤں میں آکر یا تھانے اور کچہری بُلا کر انھیں اور ان کے خاندان کے بعض افراد کو پریشان کرتے تھے۔ بالخصوص ان کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد سے زیادہ پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ اس ضمن میں مولانا غلام رسُول کے سوانح نگار اور ان کے فرزند ارجمند مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے تایا حکیم غلام محمد نے بتایا کہ ایک روز انھوں نے مولوی غلام رسول سے کہا، ہم حکام کی باز پرس سے تنگ آگئے ہیں۔ بہتر ہے کہ یہاں کی بود و باش ترک کرکے کسی ریاست میں جا قیام کریں۔ مولوی صاحب نے فرمایا بھائی صاحب آپ کا فرمان بجا ہے، لیکن میں مجبور ہوں، کیونکہ ایک دن میں مسجد میں سویا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آکر جگایا اور کہا "تم میرے ساتھ چلو، تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بُلا رہے ہیں۔ میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔ جب گاؤں

سے باہر نکلا تو دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پالکی رکھی ہوئی ہے۔ میں نے حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا۔ "غلام رسول، ہم تمھاری مسجد میں جانا چاہتے ہیں۔" آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑے رکھا اور پالکی والوں نے پالکی اٹھالی ہمسجد میں تشریف لے جاکر اسی پکڑے ہوئے ہاتھ سے مجھے منبر پر بٹھایا اور فرمایا "وعظ کہا کرو، تم سے لوگوں کو ہدایت ہوگی، تمھاری یہی جائے بود و باش ہے۔"

یہ خواب سُنانے کے بعد فرمایا "بھائی صاحب اب فرمایئے میں تو مامور ہوں، کیسے اس جگہ کو چھوڑ سکتا ہوں؟[۲۷]

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تمام عمر وہ اسی گاؤں (قلعہ میہاں سنگھ) میں رہے اور خلقِ کثیر نے یہاں آکر ان سے استفادہ و استفاضہ کیا۔

صحابہ کرام کی خوشبو

مولانا کے ایک شاگرد اور مرید مولوی علاءالدین کا بیان ہے کہ ایک دن وہ مولانا کے ساتھ موضع ہیراں والا جا رہے تھے۔ مولانا گھوڑی پر سوار تھے۔ راستے میں سطح زمین سے قدرے اونچا ایک مقام آیا تو آپ گھوڑی سے اُتر پڑے اور فرمایا "علاءالدین یہاں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ کی خوشبو آرہی ہے، تم گھوڑی پکڑ لو۔" انھوں نے حسبِ ارشاد گھوڑی کی لگام پکڑی۔ آپؒ نے وضو کیا اور جوتے اتار کر اِدھر اُدھر گھومنے لگے، جیسے کوئی خاص جگہ تلاش کر رہے ہوں، بالآخر ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ دوپہر کا وقت اور گرمیوں کا موسم تھا۔ آپ جذب کے عالم میں تھے، کافی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ دستار مبارک سر سے گر گئی تھی اور انھیں اپنے آپ کا کچھ پتا نہ تھا۔ مولوی علاءالدین تعجّب و تحیر کے عالم میں کھڑے ان کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ مولانا ظہر کے اوّل وقت وہاں سے اُٹھے اور نماز ادا کی۔ پھر فرمایا:

۲۷؎ سوانح مولوی غلام رسول ص ۱۳۸، ۱۳۹۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ میری قبر یہاں ہو"[۲۵]

یہاں یہ یاد رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی تعداد بعض تاریخی روایات کے مطابق ایک لاکھ پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ وہ صرف جزیرۃ العرب ہی میں اقامت گزیں نہ رہے تھے، جنگ و جہاد، کاروبار اور تبلیغ دین و اشاعت اسلام کے سلسلے میں مختلف ملکوں اور علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ کتب تاریخ سے ثابت ہے کہ ہندوستان کے بعض شہروں اور علاقوں میں بھی پچیس صحابہ تشریف لائے۔ ان کی آمد و رفت کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد (۱۵ ہجری) سے لے کر یزید بن معاویہ کے زمانے تک جاری رہا۔ ان کے نام بھی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ موجودہ بلوچستان کے متعدد علاقوں اور صوبہ سرحد کے شہر بنوں میں بھی (جسے عربوں نے "بنہ" کہا ہے) بغرض جہاد صحابہ کرام کا ورود مسعود ہوا۔ عین ممکن ہے اس سے آگے بڑھ کر موجودہ پنجاب کے بعض علاقوں میں بھی آئے ہوں اور مولانا غلام رسول کو جس مقام سے صحابہ کی خوشبو آئی، وہاں کوئی صحابی مدفون ہو۔ ہمارے لیے اگرچہ اس معاملے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کہ اولیا و اتقیا کا معاملہ عام لوگوں سے بہت مختلف ہوتا ہے اور ان کے قلب و روح کی قوت حاسہ اس درجے تیز ہوتی ہے کہ اس کی مدد سے وہ ایسے آثار تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جہاں ہم ظاہر بینوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

سخاوت اور مہمان نوازی

مولانا غلام رسول بہت سخی اور مہمان نواز تھے۔ اہل و عیال کے علاوہ رشتے داروں اور اعزہ و اقارب پر بھی دل کھول کر خرچ کرتے تھے، ان کے شادی بیاہ کی ذمے داریاں بھی انہی نے سنبھال رکھی تھیں۔ ان کی تعلیم و تعلم کے معاملات بھی انہی کے سپرد تھے۔ ان کے مدرسے میں جو طلبا حصول علم کے لیے آتے اور جو لوگ فیض حاصل کرنے

---

[۲۵] سوانح مولوی غلام رسول، ص ۱۰۵، ۱۰۶

کی غرض سے وہاں مقیم رہتے، ان کے خورد و نوش کا انتظام بھی وہ خود ہی کرتے تھے ـــــ
مہمانوں کی تعداد پندرہ کے قریب روزانہ ہوتی تھی، بعض دفعہ یہ تعداد چالیس تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ گھر کی عورتیں یا چکی پیستی رہتیں یا کھانا پکانے میں مصروف رہتی تھیں۔ ایسا بھی ہوتا کہ مہمان روحانی فیض بھی حاصل کرتے، کھانا بھی کھاتے، کئی کئی دن وہاں مقیم بھی رہتے اور پھر جاتے وقت سفر خرچ کا مطالبہ بھی کرتے۔ بعض بھنگی پوستی بھی ان کی سخاوت سے فائدہ اٹھاتے اور اپنی اس ضرورت کے لیے ان سے پیسے لے جاتے۔

اس مردِ درویش کا دستِ سخا اس قدر وسیع تھا کہ کسی شخص کا دامنِ طلب خالی نہ رہتا۔ ایک مرتبہ ایک پوستی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور صاف لفظوں میں کہا کہ میں پوست پینے کا عادی ہوں اور بہت زیادہ پیتا ہوں، آج بالکل خالی ہاتھ ہوں، پوست لینے کے لیے کوئی پیسہ میرے پاس نہیں ہے، سخت طلب لگی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے کچھ پیسے دیجئے تاکہ پوست پی سکوں۔ آپ نے اُس کو ایک روپیہ دیا۔ دوسرے دن وہ پھر آیا، وہی ضرورت بیان کی اور ایک روپیہ لے گیا۔ اس طرح متواتر سات دن آتا اور ایک ایک روپیہ روزانہ لے جاتا رہا۔ اس اثنا میں جو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، وہ آپ کو کہتے رہتے کہ یہ شخص خود پوست پینے کا اعتراف کرتا ہے اور اسی کے لیے آپ سے پیسے لیتا ہے، آپ اس غلط کام کے لیے کیوں روزانہ ایک روپیہ دیتے ہیں۔ ایک روپے کی اس زمانے میں بہت قیمت تھی، لیکن مولانا نے کوئی پروا نہ کی اور اُس کا مطالبہ پورا کرتے رہے۔ آٹھویں دن وہ آیا اور روپیہ طلب کیا تو اُسے اپنے پاس بٹھا لیا، نہایت شفقت سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پوست اور دوسری نشہ آور چیزوں کی مذمت بیان کرنا شروع کی۔ وہ شخص اتنا متاثر ہوا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت پوست نوشی سے توبہ کر لی۔ اب پوست کے بجائے مولانا نے اُسے اپنی جیب سے دودھ پلانا اور حلوہ کھلانا شروع کر دیا۔ چھ مہینے وہ ان کی خدمت میں رہا، ذکرِ الٰہی اور یادِ خدا اس کا ہر وقت کا معمول بن گیا تھا۔

مولانا عبداللہ غزنوی سے مولانا غلام رسول بیعت بھی تھے اور دونوں کا آپس میں گہرا دوستانہ بھی تھا۔ مولانا عبداللہ غزنوی نے چونکہ اتباعِ کتاب وسنّت کی پاداش میں اپنا ملک چھوڑا تھا اور ہندوستان آ کر وہ خالصتاً دینی خدمات انجام دے رہے تھے، اس لیے مولانا غلام رسُول ان سے بے پناہ تعلقِ خاطر رکھتے تھے اور ان کی مالی امداد کو اپنے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔

اولاد کی تربیت

مولانا غلام رسُول کے فرزند گرامی مولوی عبدالقادر مرحوم بیان کرتے ہیں کہ مولانا اپنی اولاد کی تربیت کا خاص طور سے اہتمام فرماتے تھے، ان کو دینی مسائل سکھاتے اور پانچ وقت کی نمازیں باجماعت ادا کرنے کا حکم دیتے۔ سحری کے وقت تہجّد کے لیے جگاتے اور مسجد میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں :

"میری عمر اس وقت محض نو سال کی تھی۔ ایک دن والدہ صاحبہ نے کہا کہ ابھی یہ نابالغ ہے، شرع نے اس کو مکلّف نہیں کیا تو اس کو تہجّد کے لیے جگانے اور مہمانوں کی خدمت کے لیے تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا ہے۔ آنحضرت نے فرمایا ہے: انما الاعمال بالنیات۔ میں اس کو اس نیّت سے تکلیف دیتا ہوں کہ اس کو نیک کاموں کی عادت ہو جائے۔ دوسرا مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب یہ کسی دن یتیم ہو جائیں گے، جو کچھ میں اس سے اب کراتا ہوں، یہ اس کو یاد رہے گا اور بڑا ہو کر ان عادات کا پابند ہو جائے گا۔ اس کے دل میں تخم حمیت اور مروّت بو رہا ہوں۔ ان شاء اللہ کسی روز یہ تخم پھل پھول جائے گا، میرا خدا میری محنت کو ضائع نہ کرے گا۔ نابالغوں کا سینہ مثل آئینہ ہوتا ہے، جس طرف ان کو لگایا جائے وہ رستہ ان کے سینوں میں نقش ہو جاتا ہے"[29]

اولاد کی دینی اور مذہبی تربیت نہایت ضروری ہے۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے گھر کے سربراہ کو "راعی" یعنی نگہبان قرار دیا ہے۔ اس حیثیت سے والد کا فرض ہے کہ اولاد کی ہر اعتبار سے نگرانی اور نگہداشت کرے۔ اس ضمن میں مولانا غلام رسُول

---

۲۹ ۔ سوانح مولوی غلام رسول ص ۱۵۰، ۱۵۱

کا نقطہ نظر جو یہاں بیان کیا گیا ہے، عین حقیقت پر مبنی ہے۔ انھوں نے عمدہ طریقے سے اولاد کی تربیت کی اور بچپن ہی میں انھیں نیکی کی راہ پر لگا دیا اور اس کی جو وجہ بیان فرمائی وہ بالکل صحیح ہے۔

چند خصوصیات

گزشتہ صفحات میں مولانا غلام رسول کے تقویٰ و طہارت اور خصائل حمیدہ کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ان کی بے شمار خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ہر وقت باوضو رہتے اور اپنے اصحابِ عقیدت و ارادت کو بھی باوضو رہنے کی تلقین فرماتے اور کہا کرتے الوضوء سلاح المؤمنین (وضو مومنوں کا ہتھیار ہے) ان کا ارشاد ہے کہ باوضو آدمی پر نہ جادو اثر کرتا ہے، نہ جن بھوت اُسے تکلیف پہنچا سکتے ہیں اور نہ موذی چیزیں اُسے مبتلائے مصیبت کر سکتی ہیں۔ فرمایا کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک مرتبہ انصار سے پوچھا کہ تم میں وہ کون سی صفت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید میں تمھارے بارے میں اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ فرمایا گیا ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا ہم لوگ باوضو رہتے ہیں۔

فرمایا کرتے کہ وضو کر کے جو کام بھی کیا جائے، اس میں برکت پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ خود پاکیزگی اختیار کرنا اور دوسرے کو پاکیزہ رہنے کی تلقین کرنا منشأ اسلام ہے۔ صوفی اور سالک دربارِ خداوندی میں اسی لیے زیادہ مقبول ہیں کہ وہ طہارت اور پاکیزگی کا التزام کرتے ہیں۔ مجذوب بھی بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوتا ہے، مگر وہ سالک اور صوفی کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ سالک شرع کا مکلّف ہے اور ہر وقت اللہ سے طالبِ رضا رہتا ہے۔ اس کے برعکس مجذوب پر استغراق اور جذب کی کیفیّت طاری رہتی ہے۔ سالک تمام درجاتِ سلوک طے کر کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے، لیکن مجذوب جزئیاتِ شرع اور مراتبِ تصوّف سے واقف نہیں ہوتا۔

ارادت مندوں سے کہا کرتے کہ اصل فضیلت اتباعِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوتی ہے، جس کو اتباعِ رسُولؐ نصیب نہیں، اُسے مرتبہ، فضیلت نصیب نہیں ہوتا۔ ہر قسم کے روحانی فیوض و برکات اور درجات و مراتب کا بنیادی منبع رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات اقدس ہے۔

ہمیشہ نیچی نظر کر کے چلتے۔ دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے۔ اس کے لیے کتاب و سنّت میں جو احکام صادر فرمائے گئے ہیں وہ لوگوں کو سُناتے۔ زیادہ باتیں کرنے سے منع کرتے اور زبان کو قابو میں رکھنے کی تلقین کرتے۔ ہر کام خلوصِ نیت سے کرنے کی تاکید فرماتے۔ کسی کو ذہنی اور جسمانی تکلیف نہ پہنچاتے۔ مالِ مشتبہ سے سخت پرہیز کرتے۔ سب کی بات کامل توجہ اور غور سے سُنتے۔ لباس اور کھانے پینے میں کسی نوع کا تکلّف نہ کرتے۔ سادہ لباس پہنتے اور سادہ کھانا کھاتے۔ چھوٹے پر شفقت فرماتے اور اپنے ہم عمر اور بڑوں کا احترام کرتے۔ بہت سے لوگ اُن سے فقہی مسائل پوچھنے آتے اور تحریری فتوے لینے کی غرض سے بھی حاضرِ خدمت ہوتے، سب کو تسلی بخش جواب دیتے اور قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں فتوے تحریر فرماتے۔ جو لوگ زبانی مسائل دریافت کرتے ان کو بھی نہایت اطمینان سے مسئلے کی نوعیت سمجھاتے، جب تک وہ مطمئن نہ ہو جاتا اور مسئلہ اچھی طرح ذہن نشین نہ ہو جاتا اُسے اُٹھنے نہ دیتے۔

ہر چھوٹا بڑا اُن سے بے تکلّفی سے بات کر سکتا اور بے جھجک اپنا مدعا بیان کر سکتا تھا، ہر شخص کے علم اور ذہن کے مطابق بات کرتے اور اُس کے مرتبہ و مقام کو ملحوظِ خاطر رکھتے۔ کسی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوتے، جس میں ریا اور سمعہ کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا جاتا، اپنے ذاتی مفاد کو ہرگز پیشِ نظر نہ رکھتے۔ اگر انھیں شبہ پڑ جاتا کہ فلاں مقام کے لوگ ان کی کوئی مالی اعانت کرنا چاہتے ہیں تو وہاں بالکل نہ جاتے اور جانے کا پروگرام طے بھی ہو چکا ہوتا تو منسوخ کر دیتے یا اس وقت تک ملتوی کر دیتے جب تک یہ شبہ دُور نہ ہو جاتا۔

مزاج کے نرم اور طبیعت کے دھیمے تھے کسی سے سخت کلامی نہ کرتے۔ ہر شخص

سے پیار اور محبت سے پیش آتے۔ بحث سے شدید نفرت تھی۔

فقہی مسلک

فقہی مسلک کے اعتبار سے اہلحدیث تھے اور اتباعِ سنّت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اہل حدیث کے مسائلِ مشہورہ آمین اور رفع یدین وغیرہ پر عامل تھے۔ فاتحہ خلف الامام کے قائل تھے۔ دیگر مسائل میں بھی اسی مسلک کو ترجیح دیتے اور فتوے میں کتاب وسنّت کو پیش نگاہ رکھتے۔

وعظ میں بدعات اور مروّجہ رسوم کی سخت مخالفت کرتے اور خالص کتاب و سنّت کے مسائل بیان فرماتے۔ مسئلۂ توحید نہایت عمدہ اور مؤثر انداز میں بیان کرتے۔

وصیّت

مولانا نے عازم بیت اللہ ہونے سے قبل اپنے بیٹوں کے لیے حسب ذیل وصیّت تحریر فرمائی:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ـــــ الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الذی لانبی بعدہ وعلی آلہ وصحبہ وسائر من بذل فی مرضیات اللہ جہدہ اما بعد۔ امروز دوشنبہ ۵ شوال ۱۲۸۵ھ ہجری مقدسہ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ فقیر عبداللہ المعروف بغلام رسول بن جناب فضلیت وسنگاہ رحیم بخش بن حافظ نظام الدین خادم بن حافظ فاضل کامل بہاءٔ الدین بن جامع کمالات حافظ محمد اکرم بن حافظ فاضل عصمت اللہ بن مصدر کمالات زبدہ اہل اللہ کامل التحریر جناب عبداللہ بن سکندر بن نور محمد بن پیر محمد محض بفضل الٰہی عازم زیارت حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً گردید۔ لہٰذا بہ فرزندی عبدالقادر کہ امروز نہ ۹ سالہ است وبعد تلاوت قرآن شریف وتحصیل صرف تا زرادی بوستان وگلستان می خواند ونور چشمی محمد عبدالعزیز کہ سہ ۳ ونیم سالہ است وصیت میکنم کہ از ہمہ امور علم دینی از تفسیر وحدیث وفقہ وسیر وتصوف مقدم دارند۔ وملاک الامر واساس الایمان یقین کنند وبہمگی ہمت باو متوجہ شوند۔ خصوصاً صحبت محدثین لازم شمارند کہ اہل حدیث اہل اللہ اند

بعد فراغ از علم دینیہ دست بیعت بشیخ کامل مکمل وہند۔ و دریں زمان مثل عبد اللہ غزنوی درقیاس ما احدے نیست صحبتش اکسیر است۔ وبحقیقت آنحضرت کامل مکمّل پیر است وعبد القادر ترجمہ قرآن ازلیشاں شروع کنند۔ وبسم اللہ عبد العزیز ازلیشاں شروع کنند کہ در عقیدۂ فقیر مثل جنید ونظیر حضرت بایزید است۔ لا یدرک الواصف المطری خصائصہٗ وان یک سالقاً فی کل ما وصفا۔ ہمیں بس گرچہ بس کلسند تماشم کہ در سلک خریدارانش باشم و می باید کہ بملحدین و زنادقہ وکسے کہ سرِ مو مخالف شریعت محمدیہ باشد مجلس نکنند وباولیاء اللہ وکمال صوفیہ حسن عقیدہ ثابت نمائند۔ امام شعرانی فرمودہ ایاک ولحوم الاولیاء فانہا مسمومۃ و شطحیات آں حضرت برمہما امکن برمحمل نیک فرود آرند۔ وا وقات خود را اولاً باداءِ صلوٰۃ درا وقات مستحبہ واقامت ارکان و واجبات وسنن ومستحبات بتقید جماعت و خشوع تمام معمور کنند وایمان خود را درست کنند وثانیاً بہ تلاوت قرآن و درود شریف و اذکار نور علیٰ نور نمائند۔ ولیس ــــ

گو بماندیم زندہ بردوزیم	دامنے کز فراق چاک شدہ
در بر دیم عذر ما بپذیر	اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

الغرض آپ مکہ معظمہ پہنچ گئے اور وہاں آپ نے ذیل کی غزل کعبہ شریف کے سامنے کھڑے ہو کر کہی۔

۱۲۸۸ھ

زراہِ دور بہ بیت الحرام می آیم	بصد نیاز و بصد احترام می آیم
گزشت عمرِ جوانی بحظِ نفسانی	سفید ریش بباب السلام می آیم
برائے عفو جرائم بہ توبہ مستغفر	بصد ندامت تا ایں مقام می آیم
کرم نما و گذر کن کہ نا سزا کردم	طفیلِ حضرت خیر الانام می آیم
بحضرتِ تو باستار کعبہ دست زدہ	باستغاثہ وطلب ہرام می آیم
زلال رحمت خود دہ کہ تا شوم سیراب	بسا کہ تشنہ لب و تلخ کام می آیم

وقوف موقف عرفات رانیم لائق | چو خواندۂ تو برحمت بکام می آیم
گر بحتم زجرائم بسعی درمیلین | پس از طواف بسوئے مقام می آیم
برائے رمیِ شیاطین رسیدہ برجمرہ | پے طواف بمسجد حرام می آیم
نمودہ حلق ز اخلاق بد بفضل خدا | بطلب رحمت رحماں مدام می آیم
گر کہ کیش منی در منا شود قرباں | اُمیدوار عنایت غلام می آیم

یہ وصیت مسطورہ بالا جو مولانا مرحوم نے اپنے بیٹوں (عبدالقادر اور عبدالعزیز) کے لیے تحریر فرمائی، فارسی زبان میں ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے۔

اما بعد۔ آج بروز پیر ۵ شوال ۱۲۸۸ھ کو یہ فقیر عبداللہ جو غلام رسول کے نام سے مشہور ہے، محض فضلِ خداوندی سے حرمین شریفین کی زیارت کا عزم کر رہا ہے۔ میرا بیٹا عبدالقادر جو کہ آج نو برس کا ہو چکا ہے اور قرآن شریف پڑھنے کے بعد علم صرف میں زرادی تک کتابیں پڑھ چکا ہے اور فارسی کی بوستان اور گلستان پڑھ رہا ہے، نورچشمی محمد عبدالعزیز جو کہ ساڑھے تین برس کا ہو گیا ہے، میں انھیں وصیت کرتا ہوں کہ علم دینی یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تصوف کے حصول کو تمام معاملات پر مقدم قرار دیں، اسی کو بنیادی کام اور اساسِ ایمان ٹھہرائیں اور سہرا عتبار سے اسی کو مرکزِ توجہ بنائیں۔ بالخصوص صحبت محدثین کو اپنے لیے لازم قرار دیں اور یقین رکھیں کہ اہل حدیث ہی اہل اللہ کا گروہ ہے۔ علم دین سے فراغت کے بعد کسی شیخ کامل و مکمل کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ میرے خیال میں مولانا عبداللہ غزنوی کے مرتبے کا اس زمانے میں کوئی اور شخص نہیں ہے۔ ان کی صحبت اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت عبداللہ غزنوی پیر کامل و مکمل ہیں۔ عبدالقادر درسِ قرآن مجید کے ترجمے کا آغاز اور عبدالعزیز اپنی تعلیم کا آغاز یعنی بسم اللہ انہی سے کریں، اس لیے کہ یہ فقیر یقین رکھتا ہے کہ وہ اس عہد میں مثلِ جنید اور نظیر حضرت بایزید ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی صفت کرنے والا ان کے اوصاف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے ہر وصف میں سلف صالح کا نمونہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں خود ان کے حلقۂ دامن سے وابستہ ہوں۔

ہمیں بس گرچہ کلد قماشم کہ در سلکِ خریدارانش باشم

اپنے بیٹوں کو وصیت کرتا ہوں کہ ملحدوں اور زندیقوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں اور کسی ایسے شخص کی مجلس اختیار نہ کریں جو شریعت محمدیہ کا کسی صورت میں بھی مخالف ہو۔ اولیاء اللہ اور باکمال صوفیاء سے ہمیشہ حسنِ عقیدت رکھیں ــــــ اپنے اوقات کو ادائے نماز، اقامتِ ارکانِ دین، واجبات وسنن اور مستحبات کی بجا آوری میں صرف کریں، جماعت کے پابند رہیں اور دلوں کو خشوع وخضوع سے معمور رکھیں۔ دوسری بات جس پر عامل رہنا ضروری ہے یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی تلاوت کو جزوِ زندگی بنائیں، اذکار و وظائف کو اپنا معمول ٹھہرائیں اور درود شریف کثرت سے پڑھا کریں۔ بس میری یہی وصیت ہے۔

گر بماندیم زندہ بردوزیم دامنے کز فراق چاک شدہ
ور بمردیم عذرِ ما بپذیر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

تصنیفات

مولانا غلام رسول ہر شعبۂ علم پر عبور رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق وفلسفہ، صرف ونحو، معانی وبیان، ادب وانشا اور علم کلام سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس دور کی مروّجہ زبانوں یعنی عربی اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ پنجابی ان کی مادری زبان تھی۔ انھوں نے فارسی اور پنجابی کو ذریعۂ تبلیغ بنایا اور ان زبانوں میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام درج ذیل ہیں:-

۱۔ **فتاویٰ مولوی غلام رسول**:- یہ ان کے فقہی نوعیت کے فتاوے ہیں جو مختلف لوگوں کے مسئولہ مسائل پر مشتمل ہیں، اس زمانے میں علمی زبان عام طور پر فارسی کو سمجھا جاتا تھا اور فقہی مسائل اور فتوے اسی زبان میں تحریر کیے جاتے تھے۔ یہ فتاوے بھی فارسی میں ہیں۔

۲۔ **رسالہ تراویح**:- یہ بھی فارسی میں ہے اور نمازِ تراویح سے متعلق ہے۔

۳۔ **حلیہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم**:- اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آنحضرت کا حلیہ مبارک بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ قصّہ حضرت بلالؓ :۔ یہ پنجابی نظم میں ہے اور اس میں مشہور صحابی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے واقعاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔ قصّہ سسّی پنّوں :۔ یہ بھی پنجابی نظم میں ہے اور اس میں سسّی پنّوں کے نام سے خالص رُوحانی اور علمی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

۶۔ سی حرفی :۔ یہ بھی پنجابی نظم میں ہے۔

۷۔ مجموعہ نماز :۔ یہ پنجابی میں مترجم نماز ہے

۸۔ تفسیر سورۂ فاتحہ :۔

۹۔ پنج باب :۔ یہ پنجابی نثر میں ہے اور پکّی روٹی کے انداز پر اس میں فقہی مسائل ضبطِ تحریر میں لاتے گئے ہیں۔

۱۰۔ پکّی روٹی :۔ یہ بھی فقہی مسائل پر مشتمل ہے اور پنجابی نثر میں ہے۔

ان کتابوں میں سے بعض کتابیں کئی مرتبہ چھپ چکی ہیں۔

شعروشاعری :۔

مولانا غلام رسُول فارسی اور پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے دادا حافظ نظام الدین خادم کا شمار بھی اپنے دور میں فارسی کے مشہور شعرا میں ہوتا تھا۔ مولانا غلام رسُول کے پنجابی اشعار میں بعض اُردو کے الفاظ بھی ہیں۔ حج بیت اللہ سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو روانگی کے وقت جو شعر کہے ان میں سے چند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

بحمد اللہ ہویا فضلِ الٰہی — فراغت حج بیت اللہ سے پائی
مدینہ کی طرف ہوئی تیاری — کیتی حجاج اُونٹوں پر تیاری
پہلے دن قافلہ ہو جمع سارا — کیتو نے فاطمہ دی وادی اُتارا
مدینہ طیبہ دی وا جو آئی — کلیجے عاشقاں دے ٹھنڈ پائی
وہ روضہ دُور سے نظری جو آیا — خدا اوہ نور دا جلوہ دکھایا،
ادب سے قافلے ہوئے پیادے — محبّت غیر سے دل صاف سادے
مُبارک شہر تھیں واؤں جو چلیاں — ہسے دل وکھڑے مانند کلیاں

صلوٰتاں وانگ بلبل دے پکاراں | دلوں محبوب دا حُلیہ چتاراں
کیتی اَج طالع بیدار یاری | اجو کی اس گھڑی پر جان واری
عجب وہ مسجدِ نبویؐ منوّر | عجب روضہ رسُول اللہ دا انور
نہ جھلن اکھیاں وہ دیکھ انوار | ہوون صدقے رسُول اللہؐ دے دربار
کہا ہُن جی نے کیا سامان کریے | پکارے عشق جان قربان کریے
مبارک روضہ مسجد دے کنارے | وہ سُورج وانگ دُوروں لاٹ مارے

اس نظم کا آخری شعر ہے :۔

غلام ایہہ عین میرا مُدعا ہے
شکستہ شیشہ دل کا صدا ہے

گھر سے عازمِ حرمین شریفین ہونے سے پہلے ان کے دل کی جو کیفیت تھی اور دیارِ رسُولؐ کی جو محبّت ان کے قلب و رُوح میں کروٹ لے رہی تھی اس کا اندازہ ان کے مندرجہ تحت پنجابی اشعار سے کیا جا سکتا ہے :۔

چلیں اس دیس نوں دے سار بانا | جتھے کیتا حبیبؐ اللہ ٹکانا
چلا شتر ہوواں قربان تیری | تیرے راہاں توں گھول جان میری
ہوئی رات جو روون نین میرے | کلیجے چھیک پاون وین میرے
رسُول اللہ دے کر کریا دا آتنا ر | الینبے مار بھڑکے شوق دیدار
مدینے میں پہنچا اِک وار میں نوں | حیاتی میں ہلا دلدار میں نوں
غبار اس راہ دا سُرمہ بناواں | ہوواں صدقے اگر اک جھات پاواں
جے پَر ہوون تے ماراں اُڈاری | دیکھاں روضہ جے طالع کرن یاری

صبا روضے رسُول اللہ دے جائیں | میرا احوال رو رو کے سُنائیں
کہیں بعد از ہزاراں بار صلوات | کروڑیں بار تسلیم و تحیات
جو اے محبوبِ رحمانی نگاہ کر | وچھوڑے سے جان آئی لباں پر

الٹے عشق سے جل بل گیا جی — کھو اس درد دا دارو گراں کی
خدا جانے جدوں کی جائیاں میں — میرے بابل تیرے لڑلائیاں میں

اس نظم کے یہ شعر ملاحظہ ہوں، کس قدر درد و سوز میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور اپنی کمزوریوں کا کس مؤثر انداز میں ذکر کیا گیا ہے :-

گناہاں نال مَیں نامہ سیاہ ہوں — لبا تقصیر مند و پُر گناہ ہوں
تغافل نال گذری عمر ساری — گیاں سیّاں، کھڑی رہیاں بچاری
کیا کرساں جو بھلکے کات منگسن — آ جلدی جنج بوہے آن ڈھوسن
جدوں ڈولی کہاراں آن چائی — اکیلے چھوڑ جاسن بھین بھائی
بیگانیاں نال ہے پردیس جاناں — نہیں پھر نت نت ایس دیس آناں
غلام ایہ پُر گناہ بے ساز و ساماں — پھڑا محکم رسول اللہ دا داماں

اسی مضمون کے چند فارسی اشعار پڑھیے :-

گویم بتو اے صبا پیامے — در وادیٔ عشق چند گامے
از ملک عجم اگر بر آئی — در ناحیۂ عرب در آئی
بادیدۂ زار و دل نگارے — در شہر مدینہ کن گزارے
بیں روضۂ پاک سرورِ دیں — آں مضجع خاتم النبیینؐ
بر دمیٔ بہ تن کشیدہ — در قبر شریف آرمیدہ

اِس نظم کا آخری شعر ہے :-

از حد شدہ درد انتظارم
بر راہِ تو دیدہ اشکبارم

مکہ معظمہ پہنچ کر آپ نے جو فارسی اشعار کہے ان میں سے چند یہ ہیں :-

---

۳۰؎ اپنے نام کی طرف اشارہ ہے کہ والدین نے میرا نام ہی غلام رسول رکھا ہے یعنی مجھے وقت پیدائش ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام بنا دیا گیا ہے۔

زِراہِ دور بہ بیت الحرام می آیم — بصد نیاز و بصد احترام می آیم
گزشت عمر جوانی بحظِ نفسانی — سفید ریش بباب السلام می آیم
برائے عفوِ جرائم بہ توبہ مستغفر — بصد ندامت تاایں مقام می آیم

مدینہ منورہ جانے کے بعد آپ نے جو فارسی اشعار کہے، وہ یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ ابتدا میں یہ الفاظ مرقوم ہیں۔ "بمدینہ منورہ بروضہ طیبہ گفتہ شد ۱۲۸۹ھ"

شکر خدا چہ وقتِ سعید است و بختیار — غنچہ مرادِ قلب شگفت از دم بہار
دیدم بچشمِ عشق مدینہ منورہ — ابیدم سزد کہ گوہرِ جاں را کنم نثار
یعنی شبِ وصال رسید است در حیات — شبِ قدرہا بافدائی یک ساعتش ہزار
ذوقش بجز حلاوتِ ایماں کجا چشید — کذاب مدعی کہ ازیں فیض برکنار
حقا کہ چہ دولتیست کہ شد دستیاب من — ور در زباں کنم چو عنا دل ہزار بار
استادہ باداب بحضورِ محمدی — صلواۃ ذاکیات و تحیات بے شمار
یارب صل علی الذی اخترتہ واجتبیتہ — وعلی تمامۃ آلہ وعلی صحابتہ الکبار
وھو النبی شفیعنا خیر البشر خیر الرسل — ھو رحمۃ للعالمین کالشمس فی وسط النہار
اے سرورِ دو عالم سلطان مرسلین — لس مجرمم شفاعتِ خود کن رفیق و یار
از جان و دل غلامِ رسولم مرا چہ غم — یک نیمہ نگاہ تر اام اُمیدوار

مولانا غلام رسول بلاشبہ اپنے دور کے جید عالم، نامور فقیہ، بہت بڑے صوفی، نہایت متقی اور پرہیزگار، مستجاب الدعوات اور ممتاز شاعر تھے۔ انھوں نے اگرچہ فارسی میں بھی شعر کہے، لیکن ان کا زیادہ کلام پنجابی میں ہے۔ نظم اور نثر میں اُنھوں نے پنجابی زبان کی بہت خدمت کی اور اپنے ماحول کے مطابق زیادہ تر اسی زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ فارسی میں اُنھوں نے فتوے تحریر فرمائے اور اس زمانے میں یہی رواج تھا۔ جو لوگ فقہی نوعیت کے مسائل دریافت کرتے تھے، ان کو فارسی میں جواب دیا جاتا تھا اور فارسی میں عربی عبارتیں بکثرت درج کی جاتی تھیں۔ مولانا کے فتاوے بھی اسی نوعیت کے ہیں اور ان میں عربی اور فارسی دونوں زبانیں مرقوم ہیں۔

ان کی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ تینوں زبانوں کے ادیب تھے۔ عربی کے بھی، فارسی کے بھی اور پنجابی کے بھی ——!

گزشتہ صفحات میں ان کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوتے بتایا گیا ہے کہ ان کی ایک کتاب کا نام "قصہ سسّی پنوں" ہے۔ یہ کتاب پنجابی نظم میں ہے اور سسّی پنّوں کے نام سے اس میں تصوف و روحانیت کا درس دیا گیا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے:-

بلوچا ظالماں سُن وَین میرے
کجا وا یار دا دو نَین میرے

ہر اعتبار سے یہ اُونچے درجے کا شعر ہے۔

وفات

قلعہ میہاں سنگھ میں مولانا غلام رسُول کی مسجد میں ایک حافظ صاحب رہتے تھے، جو گاؤں کے بچّوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے اور مسجد کے مؤذن تھے۔ ایک روز مولانا غلام رسُول خلافِ معمول اُن کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس دن مولانا کی عمر کے ۶۳ سال پورے ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ حافظ صاحب بہت متدین اور پرہیز گار تھے۔ مولانا نے ان سے فرمایا، حافظ صاحب! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، مجھ پر اللہ کا یہ خاص فضل رہا ہے کہ مجھ سے کسی ایسے عمل کا ارتکاب نہیں ہوا جو خلاف سنّت ہوا ور کوئی ایسا عمل ترک نہیں ہوا جو مسنون ہو۔ اب آخری سنّت باقی رہ گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ وہ بھی نصیب فرما دے تو زہے قسمت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پورے ۶۳ سال ہوئی ہے اور میری عمر بھی کل ۶۳ سال کی ہو جائے گی۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔

اتفاق سے دوسرے روز ساہیوال سے دو مہمان آگئے۔ مولانا نے نماز ظہر سے قبل اپنے بڑے لڑکے مولوی عبدالقادر سے فرمایا کہ "قطب الدین درویش کو ساتھ لے کر گھر جاؤ اور وہاں سے دانے اُٹھوا کر خراس پر لا رکھو تاکہ آٹا پس جائے ——" اس کے بعد ظہر کی اذان

ہوئی، آپ نے خود جماعت کرائی۔ نماز کے بعد دونوں مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت بالکل تندرست تھے، کسی قسم کی کوئی بیماری نہ تھی مہمانوں کو تلقین کرنا شروع کی۔ پہلے مولوی فضل الدین صاحب کو کلمے کا ذکر کرایا۔ ایک بار کلمے کی ضرب دی۔ دوسری بار ضرب دے رہے تھے کہ روحِ مبارک جسدِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر مہمان گھبرا گئے۔ مولوی فضل الدین صاحب جلدی سے باہر آئے اور مولانا کے بھائی حکیم غلام محمد سے کہا کہ مولوی صاحب کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ طبیب حاذق تھے۔ انھوں نے دیکھتے ہی فرمایا "مولوی صاحب وفات پا گئے ہیں"—— یہ خبر پہلے قلعہ میہاں سنگھ میں پھیلی، اس کے بعد آناً فاناً گرد و نواح کے دیہات میں پہنچ گئی۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے، متعدد طبیب بھی آ گئے۔ اطبا نے کہا کہ مولانا کی موت واقع نہیں ہوئی، ان کو سکتہ ہو گیا ہے۔ انھوں نے آپ کو رمی لگائی، لیکن حکیم غلام محمد بار بار یہی کہتے رہے کہ آپ وفات پا چکے ہیں۔

حکیم غلام محمد مرحوم نے تمام اطبا اور باقی لوگوں سے کہا کہ ہمارے خاندان میں یہی معاملہ چلا آ رہا ہے۔ ان کے والد مولوی رحیم بخش نے بحالتِ تندرستی نماز پڑھتے ہوئے سجدے میں جان دی۔ دادا صاحب حافظ نظام الدین خادم نے حالتِ رکوع میں وفات پائی۔ یہی معاملہ مولوی صاحب کو پیش آنا تھا جو آ گیا۔

مولانا غلام رسول جمعرات کو ظہر اور عصر کے درمیان فوت ہوئے اور جمعہ کے دن انھیں دفن کیا گیا۔ جنازے میں بے شمار لوگ جمع تھے—— یہ ۱۲۹۱ھ کا واقعہ ہے۔

اللہ اللہ! کتنے پاک باز تھے یہ لوگ، والدِ مکرم نے بارگاہِ الٰہی میں زمین پر پیشانی رکھ کر حالتِ سجدہ میں اللہ کے حضور حاضری دی۔ جدِ امجد نے اللہ کے دربار میں جھکتے ہوئے رکوع کی حالت میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی اور بیٹے اور پوتے نے کلمہ طیبہ پڑھتے اور اس کی تلقین کرتے ہوئے وفات پائی، اور ان کی یہ دعا اور تمنا

پوری ہوئی کہ ٹھیک ۶۳ سال میں یعنی عمرِ نبوت کو پہنچ کر اس دُنیائے فانی سے کوُچ کیا۔ اللہ نے ان کو ہمیشہ اپنے سایۂ عاطفت میں رکھا اور جو دُعا انھوں نے کی، اُسے شرفِ قبول حاصل ہوا۔ ان کی یہ آخری دُعا بھی قبول ہوئی اور اُنھوں نے ٹھیک ۶۳ سال عمر پائی۔ اللہ اُن کو اور اُن کے آبا و اجداد کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم و ادخلھم فی جنت الفردوس۔

اولاد و احفاد

مولانا غلام رسُول کے دو بیٹے تھے۔ بڑے مولوی عبدالقادر اور ان سے چھوٹے مولوی عبدالعزیز۔

مولوی عبدالقادر کے چار بیٹے تھے۔ عبدالمالک، عبدالرشید، محمد صادق۔ اور عبدالوکیل۔

مولوی عبدالعزیز کے بھی چار بیٹے تھے۔ عبدالواحد، محمد شفیع، محمد اشرف اور عبدالرحمٰن۔

یہ بالکل مختصر سا سلسلۂ اولاد ہے۔ ان سے آگے ان کی اولاد و احفاد کا سلسلہ ماشاءاللہ بہت وسیع ہے۔

۶۔ خلیفہ غلام رسُول لاہوری

لاہور کو ہمیشہ مرکزِ علما اور مجمع فضلا کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں جن عظیم شخصیتوں نے اس شہر میں جنم لیا، ان میں مولانا غلام رسُول بن مولانا غلام فرید لاہوری کا اسمِ گرامی لائقِ تذکرہ ہے۔ مولانا غلام رسول اپنے فضل و کمال اور نامور باپ مولانا غلام فرید کے مسند نشین ہونے کی بنا پر لوگوں میں خلیفہ غلام رسُول کے نام سے معروف تھے۔ حنفی المسلک تھے اور فقہ و اصول اور دیگر علومِ مروّجہ میں

مہارت رکھتے تھے۔ مشکل مسائل کے حل و کشود کے لیے اس دور کے علمائے لاہور انہی سے رجوع کرتے تھے۔ لاہور کی "مسجد موراں" جو پاپڑ منڈی میں واقع ہے، ۱۲۲۴ھ میں تعمیر ہوئی، اس مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا جس میں بہت سے طلبا حصولِ علم کرتے تھے، اس مدرسے کی مسندِ تدریس پر یہی مولانا غلام رسول لاہوری متمکّن تھے اور ان کے برادرِ صغیر مولانا غلام اللہ اس کارِ خیر میں ان کے معاون تھے۔ رائے بہادر کنہیا لال نے اپنی کتاب تاریخ لاہور میں ان دونوں بھائیوں کا ذکر عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "لاہور میں سکھی عہد میں مولوی خلیفہ غلام رسول اور خلیفہ غلام اللہ تھے۔ بڑا مدرسہ ان کا جاری تھا۔ ہزاروں طلب درویش دُور دُور ملکوں سے وہاں آکر تعلیم پاتے تھے۔ تمام زمانہ ان کا بہ دل و جان ادب کرتا تھا۔ ہنود و اہل اسلام سب ان کے شاگرد کہلاتے تھے"۔

خلیفہ غلام رسول کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا جن میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی کثیر تعداد میں شامل تھے اور ان سے مستفیض ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔

خلیفہ غلام رسول نے اپنے والد گرامی مولانا غلام فرید سے استفادہ کیا تھا اور اس عہد کے تمام علوم متداولہ پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ وہ پنجاب میں سکھوں کا دورِ حکومت تھا اور اس دور میں خلیفہ صاحب ممدوح نے بہترین علمی و تدریسی خدمات انجام دیں۔ بلاشبہ یہ جامع علوم نقلیہ و عقلیہ تھے۔

تصوّف کے سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔ ۱۲۵۰ھ میں وفات پائی۔[۳۱]

۷۔ مفتی غلام سُبحان بہاری

مفتی غلام سبحان بہاری اپنے عہد کے علامہ اور شیخ و فاضل بزرگ تھے اور

---

[۳۱] تاریخ لاہور ص ۴۷ — حدائق الحنفیہ ص ۴۷۲ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۴ — خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۳۹۰۔

دیارِ ہند کے علمائے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولد و منشا بہار تھا۔ مولانا معظم الدین اور دیگر علمائے عصر سے تحصیلِ علم کی۔ فراغت کے بعد اپنی علمی و فقہی قابلیت کی بنا پر مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مسندِ تدریس پر فائز کیے گئے۔ مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر وہاں کے افتا کا منصب ان کے سپرد کیا گیا۔ بعد ازاں کلکتہ اور بنگال کے قاضی القضاۃ کے عہدۂ جلیلہ پر متمکن ہوئے۔ یہ ایک بہت بڑا منصب تھا جس پر متعین ہونے کا انھیں فخر حاصل ہوا۔ فقہ اور دیگر علوم میں کامل دسترس رکھتے تھے، اور اپنی بوقلموں صلاحیتوں کی بنا پر ارباب حکومت اور اصحابِ دولت کی نظروں میں بہت عزت و احترام کے حامل تھے ـــــ بلاشبہ تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں یہ جیّد عالم و فقیہ تھے[۳۲]

۸ ـــ قاضی غلام علی ہاشمی سورتی

قاضی غلام علی ہاشمی سورتی کے والدِ ماجد کا نام قاضی جمال الدین اور جدِّ امجد کا اسمِ گرامی قاضی عبداللہ تھا۔ اس خاندان کے تمام ارکان تحقیق و کاوش کے دلدادہ اور فضل و کمال کے حامل تھے۔ صوبہ گجرات کے شہر سورت کی مسندِ افتا و قضا ان کو ورثے میں ملی تھی اور فقہ و کلام اور دوسرے علوم پر ان سب کو عبور و استحضار تھا۔ قاضی عبداللہ ہاشمی سورت کے مفتی اور قاضی تھے اور مختلف مسائل میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔ قاضی عبداللہ کے بعد ان کے بیٹے قاضی جمال الدین ہاشمی نے یہ منصب سنبھالا اور سورت کے قاضی اور مفتی ہوئے۔ ان کی وفات ۱۳۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۶ھ کو ہوئی۔ قاضی جمال الدین کے سفر آخرت پر روانہ ہونے کے بعد ان کے صاحب زادے قاضی غلام علی ہاشمی کو سورت کے منصبِ قضا و افتا پر متمکن ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

قاضی غلام علی ہاشمی اپنے عہد اور علاقے کے جلیل القدر فقیہ تھے اور فقہائے حنفیہ میں ان کو نہایت اعزاز و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سورت

۳۲ے نزہتہ الخواطر، ج ۷ ص ۳۵۴، ۳۵۵۔

اور اس کے نواح کے قاضی اور مفتی تھے۔ جو مشکل فقہی مسائل پیش آتے ان کی عقدہ کشائی کے لیے انہی کے باب علم پر دستک دی جاتی تھی۔

ان کی علمی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ فرائضِ افتا و قضا کی انجام دہی کے علاوہ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا اور بہت سے تشنگانِ علم ان کے چشمۂ فیض سے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔

اس ہندی عالم و فقیہ نے ۲۴ رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ کو اپنے آبائی شہر سورت میں وفات پائی۔[۳۳]

۹ ــــــ شیخ غلام علی مجددی دہلوی

برصغیر کے تیرھویں صدی ہجری کے علما و فقہا میں جنھوں نے زمرۂ صوفیا میں شہرت پائی، مولانا شاہ غلام علی دہلوی کا اسمِ گرامی سرِ فہرست ہے۔ وہ بجا طور پر شیخ الشیوخ اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ ان کا اصل وطن بٹالہ تھا جو مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور کا مشہور شہر ہے۔ مختلف اوقات میں یہ شہر اصحاب علم اور اربابِ فضیلت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ایک خاندان علوی سادات کا تھا، اس خاندان کے بزرگوں میں شاہ غلام علی کے والدِ ماجد شاہ عبداللطیف بٹالوی بہت مشہور تھے جو زہد و عبادت اور تقویٰ و قناعت میں عالی مرتبے پر فائز تھے۔ دنیا اور امورِ دنیا سے منقطع ہو کر جنگلوں کی تنہائی میں جا کر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے اور کئی کئی مہینے اسی عالم میں گزار دیتے۔ شاہ ناصر الدین قادری کے مرید تھے اور عوام و خواص میں بہت تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شاہ غلام علی نے اس صاحبِ تقویٰ باپ کے گھر ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۵ء) میں جنم لیا۔ شاہ غلام علی کے عمِ[۱] محترم بھی دینداری اور صالحیت کا پیکر تھے، جنھوں نے سرسید احمد خاں

---

[۳۳] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۵۷

کے بقول "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارت سراپا بشارت سے عبداللہ آپ کا نام رکھا" لیکن "غلام علی" کے نام سے مشہور ہوئے۔

شاہ غلام علی سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک بٹالہ اور اس کے گرد و نواح میں رہے اور وہیں کے اساتذہ سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ اس زمانے میں ان کے والد شاہ عبداللطیف کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہتا تھا اور وہ شاہ ناصرالدین قادری سے بیعت تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے فرزندِ دلبند کو بھی انہی کے حلقۂ بیعت میں شامل کر دیں۔ چنانچہ باپ کی خواہش کے مطابق ۱۱۷۴ھ میں اُنھوں نے دہلی کا قصد کیا لیکن جس دن وہ دہلی پہنچے اسی دن شاہ ناصرالدین قادری کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد والد بزرگوار نے سعادت مند بیٹے سے کہا کہ اب جس کی چاہیں بیعت کر لیں —— اس اثنا میں پورے چار سال مختلف بزرگوں کے آستانوں پر حاضر ہوتے رہے۔ اس وقت دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، شاہ غلام علی اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں کا درس لیا، اور سندِ فراغت سے بہرہ مند ہوئے۔ اس دوران میں حضرت شاہ رفیع الدین سے بھی استفادہ کیا۔ اب وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم رسمیہ کی تکمیل کر چکے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء) میں مرزا مظہر جانِ جاناں کے آستانۂ رشد و ہدایت پر پہنچے اور ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ اس وقت عمر کی بائیس منزلیں طے کر چکے تھے اور بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ مرزا صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور یہ شعر پڑھا۔ ؎

از برائے سجدۂ عشق آستانے یافتم
سرزمینے بود منظور آسمانے یافتم

(سجدۂ عشق کے لیے میں نے ایک آستان پا لیا، مجھے تو ایک سرزمین کی ضرورت تھی لیکن میں نے آسمان پا لیا۔)

بیعت کے بعد پندرہ سال مرشد کی مجلسِ ذکر و شغل میں بسر کیے اور مجاہدہ و ریاضت

کی مختلف منزلیں طے کیں، یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور صاحب ارشاد ہوئے۔ اُنھوں نے بیعت تو سلسلۂ قادریہ میں کی تھی، لیکن ذکر و اذکار اور شغل و اشغال طریقۂ نقشبندیہ مجدّدیہ میں جاری کیا اور تمام طرق تصوّف کی اجازت حاصل کی ـــ اپنے مرشد مرزا مظہر جان جاناں کی شہادت (۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء) کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے اور تمام صوفیائے عصر پر فوقیت لے گئے۔ تادم وفات پورے پندرہ سال مسندِ ارشاد پر متمکن رہے اور بے شمار لوگوں کو مستفیض فرمایا۔

شاہ غلام علی نہایت پابندِ سنّت اور متوکل علی اللہ تھے۔ اس دَور کے امرا اور بادشاہ چاہتے تھے کہ ان کی خدمت کریں اور خانقاہ کو مالی امداد دیں، لیکن شاہ صاحب نے ان کی یہ پیش کش کبھی قبول نہ فرمائی۔ ایک دفعہ والئ ٹونک نواب امیر محمد خاں نے انتہائی التجا سے ان کے اور خانقاہ کے درویشوں کے لیے وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ جواب میں ان کو یہ شعر لکھ بھیجا۔ ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقرر است

(ہم فقر و قناعت کی آبرو ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے، امیر خاں سے کہہ دو کہ روزی اللہ کے ہاں سے مقرر ہے)

ان کی ذات سے بے شمار لوگوں نے فیض پایا اور بہت سے ملکوں کے لاتعداد افراد نے حاضرِ خدمت ہو کر ان سے بیعت کی۔ ہندوستان کے علاوہ ترکی، شام، بغداد، مصر، چین، افغانستان، کردستان اور حبش کے لوگ ان کے آستانے پر حاضر ہوئے اور شرفِ ارادت حاصل کیا۔ وہ عوام و خواص کا مرکزِ عقیدت اور مرجعِ خلائق تھے۔ کہنا چاہیے:۔ ؎

چو کعبہ قبلۂ حاجت شد از دیارِ بعید
روند خلق بدیدارش از بسی فرسنگ

(چونکہ کعبہ مرکزِ حیات قرار پایا ہے، اس لیے لوگ دُور دُور کا سفر کر کے اس

کی زیارت کے لیے آتے ہیں)

ان کی خانقاہ میں ہر وقت کم و بیش پانچ سو فقیر اور درویش رہتے تھے جو اُن سے فیض حاصل کرتے تھے اور باوجودیکہ امداد کے لیے کہیں سے باقاعدہ ایک حبّہ بھی مقرّر نہ تھا، لیکن سب کے کھانے پینے اور لباس کا وہ خود ہی انتظام کرتے تھے، اور یہ تمام سلسلہ اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد سے چلتا تھا۔ فیاضی اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی سائل کو خالی ہاتھ نہیں لَوٹایا، جس نے جو مانگا دے دیا۔ جو اچھّی اور عمدہ چیز بطور تحفہ کہیں سے آتی، اس کو بیچ کر فقرا پر خرچ کر دیتے۔ جو موٹا کھسوٹا لباس خانقاہ کے درویشوں کو میسر ہوتا، وہی خود بھی پہنتے، جو کھانا عقیدت مند کھاتے، وہی آپ تناول فرماتے۔

خاک نشینی است سلیمانیم
ننگ بود افسرِ سلطانیم
ہست بسے سال کہ می پوشمش
کہنہ نہ شد جامۂ عُریانیم

(میری سُلیمانی خاک نشینی ہے۔ میرے لیے سُلطانی کا تاج باعث ننگ ہے۔
بہت مدّت سے میں لباس عُریانی پہن رہا ہوں، لیکن ابھی تک وہ لباس پُرانا نہیں ہوا۔ یعنی حرص و طمع اور فخر و غرُور سے میرا دل پاک ہو گیا ہے)

اگر کبھی اسبابِ مادّی اور سامانِ دُنیا کا ذکر آتا تو بیدلؔ کا یہ شعر پڑھتے۔

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ اسبابِ جہاں
ہر چہ ما داریم زاں ہم اکثرے درکار نیست

(اے بیدلؔ! حرص میں قناعت ہی نہیں ہے، ورنہ ہمارے پاس جو کچھ ہے اس کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جس کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یعنی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہماری ضرورت سے زائد ہیں)

ان کے شب و روز کا زیادہ حصّہ عالم بیداری میں گزرتا، بہت کم سوتے، زیادہ تر مصروفِ عبادت رہتے۔ نیند غالب آتی تو جا نماز پر ہی سو جاتے۔ خانقاہ میں بوریا

کا فرش اور بوریا ہی کا مصلّٰی تھا۔ وہیں چمڑے کا ایک تکیہ تھا، دن رات اسی مصلّے پر نشست رہتی اور تمام وقت عبادت میں بسر ہوتا۔ طالبین اردگرد حلقہ بنا کر بیٹھے رہتے۔ اگر کوئی شخص فرش کے لیے کہتا تو جواب میں سکندر لودی کے معاصر جمالی کے یہ شعر پڑھتے :-

لُنگکے زیر و لُنگکے بالا   نے غمِ دزد و نے غم کالا

گز کے بوریا و پوستکے   دلکے پُر ز دردِ دوستکے

ایں قدر بس بود جمالی را   عاشقِ رند لاابالی را

(ایک لُنگی نیچے اور ایک لُنگی اوپر یہی ہمارا لباس ہے، جس کے سبب نہ تو کسی چور کا ڈر ہے اور نہ کسی سامان کا غم ـــــــ

ایک گز بوریا اور پوستیں اور ایسا دل جو درد اور دوست کی آرزو سے پُر ہے ـــــ

جمالی کے لیے جو ایک عاشق اور رند لاابالی ہے، یہی بہت ہے)

انھوں نے احکامِ شریعت سے کبھی تجاوز نہ کیا، ہمیشہ امورِ سنّت کو پیشِ نظر رکھا، مالِ مشتبہ ہرگز قبول نہ کرتے، جو شخص خلافِ شرع اور خلافِ سنّت کوئی حرکت کرتا اس سے نہایت خفا ہوتے اور اس کا اپنے قریب آنا گوارا نہ کرتے۔ اس سے مخاطب ہو کر فرماتے :-

یا مرو با یار ارزق پیرہن

یا بکش برخانماں انگشت نیل

یا مکن با پیلباناں دوستی

یا بنا کن خانۂ درخورد پیل

(یا تو نیلے لباس والے دوست کے پاس نہ جا، یا پھر خاندان پر نیل کی انگلی پھیر دے ـــــ

یا تو مہاوتوں کے ساتھ دوستی نہ رکھ، یا پھر ہاتھی کے لائق اپنا گھر بنا۔)

مطلب یہ کہ ہمارے شریکِ مجلس ہونا چاہتے ہو یا ہماری صحبت و رفاقت میں آنے کا ارادہ ہے تو ہمارا رنگ اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ احکامِ شرع کی مخالفت بھی کرو اور ہمارے حلقے میں بھی بیٹھو۔ یہ دوعملی یہاں نہیں چلے گی۔

شاہ غلام علی نے اپنے اوقاتِ شب و روز کا ایک نقشہ بنا رکھا تھا جس پر وہ سختی سے عمل کرتے تھے۔ نمازِ فجر اوّل وقت میں ادا کرتے، اس کے بعد تلاوتِ قرآن مجید ہوتی، وہ قرآن کے حافظ تھے اور قرأت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اشراق تک حلقہ مریدین میں بیٹھتے اور صوفیا کے طریقے کے مطابق توجہ اور استغراق کا سلسلہ جاری رہتا۔ نمازِ اشراق سے فارغ ہوکر تفسیر اور حدیث کا درس دیتے۔ پھر تھوڑا سا کھانا کھا کر سنّتِ نبوی کے مطابق قیلولہ کرتے۔ بعد ازاں اوّلِ وقت نمازِ ظہر ادا کی جاتی۔ پھر طلبا و مریدین کو تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوّف کی کتابیں پڑھاتے۔ فقہی مسائل کی بھی وضاحت فرماتے، نمازِ عصر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ عصر کی نماز سے اوّل وقت میں فراغت کے بعد مریدین کا حلقہ قائم ہوتا۔ عشا کے بعد وظائف میں مشغول ہو جاتے اور اسی حالت میں نیند آ جاتی پھر تہجّد کے لیے اُٹھ جاتے۔ عقیدت مندوں کو بھی نمازِ تہجّد کی تاکید فرماتے۔

بلاشُبہ شاہ صاحب ممدوح تیرھویں صدی ہجری کے جید عالم، نامور صوفی، عظیم المرتبت فقیہ، عابد و زاہد اور صاحبِ فضل و کمال بزرگ تھے۔ ان کی وجہ سے دیارِ ہند کی رُوحانی دنیا میں بہت بڑا انقلاب رُونما ہوا، اور لوگوں کے قلب و ذہن کی دنیا متغیر ہوئی۔ اسی بنا پر ان کے عقیدت مند انھیں تیرھویں صدی کا مجدّد قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ تو بہت بڑی تعداد میں ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے ہی، دیگر اسلامی ممالک کے بھی بے شمار حضرات ان سے مستفیض ہوئے اور پھر انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں جا کر دینِ خالص کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیا۔

شاہ غلام علی نے شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی، لیکن دہلی میں ان کی خانقاہِ تصوّف شاہ عبدالعزیز کے حلقۂ درس کا مقابلہ کرتی تھی اور اُن کے اثر و رسُوخ کا دائرہ انتہائی وُسعت اختیار کر گیا تھا۔ ان میں بیک وقت دو مہتم بالشان اوصاف پائے جاتے تھے۔ یعنی طریقِ ولی اللّٰہی کا اعتدال و توازن اور علم و عرفان بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا، اور مجدّدِ الفِ ثانی کے جذبۂ احیائے دین،

ذوقِ تصوّف اور ولولۂ اتباعِ سنّت سے بھی پوری طرح بہرہ مند تھے۔ علوم عقلی و نقلی کے ماہر اور تبلیغ و اشاعتِ دین کے دلدادہ تھے۔

سر سیّد احمد خاں کے والدِ ماجد سیّد محمد متّقی مرحوم کے شاہ صاحب بہت کرم فرما تھے۔ سیّد احمد خاں کی ولادت کے وقت ان کے والد نے شاہ صاحب کو گھر تشریف لانے کے لیے عرض کیا، وہ آئے اور نومولود کے کان میں اذان دی اور سلسلۂ مجدّدیہ کے امام حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے نام پر بچّے کا نام احمد رکھا۔ سیّد احمد سے شاہ صاحب پوتوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ سیّد احمد بھی ان کا انتہائی احترام کرتے اور انھیں "دادا حضرت" کہتے تھے۔ سر سیّد نے "آثار الصنا دید" میں نہایت عقیدت و احترام سے ان کا ذکر کیا ہے اور ان کے اندازِ تبلیغ، اتباعِ سنّت اور علوِّ مرتبت کی عمدہ طریقے سے وضاحت کی ہے۔ ان کے والدِ ماجد، افرادِ خاندان اور خود سر سیّد سے ان کو جو محبّت و مودّت تھی اور پھر سر سیّد کا خاندان ان سے جو عقیدت و احترام رکھتا تھا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے سر سیّد لکھتے ہیں :-

"میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے نہایت اعتقاد تھا اور میرے والد ماجد اور میرے بڑے بھائی جناب احتشام الدولہ سید محمّد خاں بہادر مرحوم کو آپ ہی سے بیعت تھی، اور آپ کی میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ میرے والد ماجد بھی آپ کی صحبت کی برکت سے آزادہ مزاج اور وارستہ طبع تھے کبھی کبھی بموجب اس مصرع کے

کرم ہائے تو مارا گستاخ کرد

کوئی بات گستاخانہ عرض کرتے یا کوئی حرکت آپ کے خلافِ مرضی سرزد ہوتی تو آپ بارہا ارشاد فرماتے کہ اگرچہ میں نے اپنے تئیں عمِ زن و فرزند سے دور رکھا تھا، لیکن اللہ تعالٰی کی مرضی نہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت فرزندوں سے سوا دے دی۔ جو چاہو سو کہو اور جو چاہو سو کرو ـــــ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور

آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلّے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے۔ لڑکپن میں کچھ تمیز تو ہوتی نہیں، خصوصاً صغر سن میں جو چاہتا سو کہتا، جو چاہتا سو کرتا اور حرکاتِ بے تمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے۔
میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا، آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا۔۔۔ بہالہا سال تک آپ کی ذاتِ فیض آیات سے یہ عالم منوّر رہا۔[۳۴]"

شاہ صاحب کے تلامذہ اور مسترشدین کا حلقہ بہت وسیع تھا اور اس میں ہندوستان کے ہر علاقے اور اسلامی ملکوں کے اربابِ کمال شامل تھے۔ ان میں سے جن حضرات نے خاص طور سے شہرت پائی، ان میں سیّد اسماعیل مدنی، شیخ احمد کردی، شیخ خالد رومی، شیخ محمد جان باجوری، شیخ ابوسعید دہلوی، ان کے بیٹے مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا رؤف احمد رام پوری، مولانا بشارت اللہ بہرائچی اور سیّد ابوالقاسم حسینی واسطی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان تمام حضرات نے بے پناہ دینی و علمی خدمات انجام دیں۔ خالد رومی نے اپنے وطن ترکی واپس جا کر مرشد کے علم و تصوّف کو خوب پھیلایا اور تمام دولتِ عثمانیہ میں اس کی تبلیغ و اشاعت کی۔ وہ ترکی کے بلند پایہ علما میں سے تھے، عربی اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنے مرشد شاہ غلام علی کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے، ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے :-

خبر از من دہید آں شاہِ خوباں را بہ پنہانی
کہ عالم زندہ شد بارِ دگر از ابرِ نیسانی

(حسینوں کے اس بادشاہ کو میری طرف سے یہ خبر پوشیدہ طور پر پہنچا دو کہ ابرِ نیسانی کی بدولت دنیا ایک مرتبہ پھر زندہ ہو گئی ہے)

اس سے آگے چل کر کہتے ہیں :-

امام اولیا سیاحِ بیدائے خدا بینی ندیمِ کبریا، ملّاحِ دریائے خدادانی

---

[۳۴] آثار الصنادید، ص ۲۱۱

مہینِ راہنمایاں، شمعِ اولیائے دیں — دلیلِ پیشوایاں قبلۂ اعیانِ روحانی
چراغِ آفرینش، مہرِ برجِ دانش و بینش — کلیدِ گنجِ حکمت محرمِ اسرارِ سبحانی
امینِ قدس عبداللہ شہے کز التفاتِ او — دہد سنگِ سیاہ خاصیتِ لعلِ بدخشانی

ان اشعار کا ترتیب وار ترجمہ یہ ہے:۔

وہ اولیا کا امام اور خدا بینی کا ظاہر سیاح ہے۔ وہ کبریا کا ندیم اور پیشواؤں کے سمندر کا ملاح ہے۔

وہ راہنماؤں کا سردار اور تمام اولیائے دین کی شمع ہے۔ وہ حکمت کا رہبر اور رُوحانی بزرگوں کا قبلہ ہے۔

وہ خلقت کا چراغ اور دانش و بینش کے بُرج کا سُورج ہے۔ وہ حکمت کے خزانے کی چابی اور اسرارِ سبحانی کا محرم ہے۔

قدس کا امین یعنی عبداللہ ایک ایسا بادشاہ ہے جس کی عنایت و توجہ سے سنگِ سیاہ میں لعلِ بدخشانی کی خاصیت پیدا ہو گئی ہے۔

شاہ غلام علی کے زمانے کو سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے دورِ زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن علمی اور رُوحانی لحاظ سے یہ نہایت عروج کا زمانہ تھا۔ اس میں لاتعداد علما و مشائخ کے درس و تدریس اور تصوف و سلوک کے حلقے قائم تھے، جن کے اثر و رسوخ اور شہرت و قبولیت کے دائرے برِصغیر کی سرحدوں سے بھی آگے نکل گئے تھے اور بہت سے اسلامی ملکوں تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ دہلی کے افق پر اس وقت علم و معرفت کا جو شامیانہ تنا ہوا تھا، اس کے متعلق شیخ خالد رومی کہتے ہیں:

بہ دہلی ظلمت کفر است، گفتند و بہ دل گفتم
بہ ظلمت روا گر در جستجوئے آبِ حیوانی

یعنی مجھے بتایا گیا کہ دہلی میں کفر کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ اگر تجھے آبِ حیات کی ضرورت ہے تو پھر تاریکی ہی کی طرف چل۔

بہر حال شاہ غلام علی دہلوی دنیائے تصوف وطریقت کے بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ علومِ عقلی ونقلی کے بھی ماہر تھے۔ ان کے ملفوظات "درالمعارف" کے نام سے ان کے ایک مرید مولانا رؤف احمد رام پوری نے مرتب کیے جو دینی، تاریخی اور معاشرتی حیثیت سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر مروّجہ علوم کے ماہر تھے اور ان علوم کا باقاعدہ طلبا کو درس دیتے تھے۔ انھوں نے تمام عمر شادی نہیں کی، تجرد کی زندگی بسر کی، وظائف و اَوراد، تعلیم وتدریس اور تلامذہ و مریدین کی ذہنی و روحانی اور علمی تربیت ہی ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ اس عالمِ اجلّ اور ولیِ کامل نے ۱۲ ــــ صفر ۱۲۴۰ھ کو دہلی میں وفات پائی اور بہت بڑی تعداد میں لوگ ان کے جنازے میں شریک ہوئے[۵۳] اللھم برد مضجعہ ووسع مدخلہ۔

۱۰ ــــ مفتی غلام غوث گوپاموی

مفتی غلام غوث محمدی گوپاموی شیخ وفاضل اور علامۂ وقت تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے مشہور علما اور نامور فقہا میں گردانے جاتے تھے۔ درسِ نظامیہ کی مشہور کتاب سلم العلوم کے شارح قاضی مبارک گوپاموی کی اولاد سے تھے اور اپنے وسعتِ علم ومطالعہ کی بنا پر حلقۂ علما میں عزت و احترام کا مقام رکھتے تھے ــــ عمر کے ابتدائی دور ہی میں حصولِ علم کا شوق ان کے دل میں کروٹ لینے لگا تھا، چنانچہ صغر سنی ہی میں مدراس کا

---

[۵۳] آثار الصنادید ص ۲۰۷ تا ۲۱۲ ــــ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۵۳ تا ۱۵۵ ــــ نزھۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۶ تا ۳۵۸ ــــ رودِ کوثر ص ۶۴۹ تا ۶۵۷ ــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۵ ــــ علم وعمل ج اص ۲۶۰ ــــ خزینۃ الاصفیاء ج اص ۶۹۳ تا ۶۹۸ ــــ گلزار اولیا ص ۷۴ تا ۷۵؛

عزم کیا اور قاضی ارتضا علی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ قاضی صاحب ممدوح ان کے ہم وطن تھے اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے اور خوب استفادہ کیا۔ حصولِ علم سے فراغت کے بعد ان کی شہرتِ علمی مختلف علاقوں میں پہنچی تو انھیں علاقہ مدراس کے ایک شہر "گنتور" کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔ طویل عرصے تک یہ خدمت انجام دی۔ محکمۂ قضا کے ساتھ افتا کا منصب بھی ان کے سپرد ہوا، علاوہ ازیں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ گنتور اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں کو ان سے بہت فیض پہنچا۔

اسی اثنا میں بیمار پڑ گئے اور یہ بیماری ان کی زندگی کی آخری بیماری ثابت ہوئی۔ علاج کی غرض سے گنتور سے نکلے اور حیدر آباد (دکن) کو روانہ ہوئے۔ لیکن حیدر آباد سے چار میل کے فاصلے پر انتقال کر گئے۔ یہ ۱۲۳۲ھ کا واقعہ ہے۔[۳۶]

۱۱ــــ مولانا غلام فرید لاہوری

مولانا غلام فرید لاہوری فقہ و اصول اور دیگر علوم مروّجہ میں کامل درک رکھتے تھے۔ اس دورِ زوال میں اُنھوں نے بلدۂ لاہور میں نہایت علمی و تدریسی خدمات انجام دیں۔ علومِ ظاہری میں تو درجۂ کمال پر فائز تھے ہی، علومِ باطنی میں بھی اُس عہد میں اپنی مثال آپ تھے۔ عابد و زاہد اور ذاکر و شاغل عالمِ دین تھے۔ عمر بھر مشغولِ درس و تدریس رہے اور حالتِ گوشہ گیری میں خدمت علم و فن کی۔ اربابِ دنیا اور اصحابِ عز و جاہ سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ ان کا اصل کام طلبا کو تعلیم دینا یا مطالعۂ کتب میں مصروف رہنا اور یا پھر عبادتِ خداوندی تھا۔ اس کے علاوہ دوسری کسی چیز کو مرکزِ توجہ نہ قرار دیتے۔

---

۳۶ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۵ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۹

ان کے دو بیٹے بھی اس سلسلے میں انھی کے نقش قدم پر چلے۔ ایک خلیفہ غلام رسول اور دوسرے خلیفہ غلام اللہ — انھوں نے باپ کی روایات علمی و تدریسی کو زندہ رکھا اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی علمی خدمت انجام دیتے رہے۔ جس طرح باپ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم تھے، اسی طرح سعادت مند بیٹوں نے بھی بے شمار لوگوں کو علم کی راہ پر لگایا اور ان کی ذہنی و فکری تربیت کا فریضہ انجام دیا۔

یہ تمام حضرات فقہی نقطۂ نظر سے حنفی تھے۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح کے تمام حلقوں میں اپنے تدین و تقویٰ اور فضل و کمال کی وجہ سے اکرام و اعزاز کے مستحق گردانے جاتے تھے۔

مولانا غلام فرید لاہوری کا انتقال ۱۲۱۶ھ کو میں لاہور میں ہوا۔[۳۷]

۱۲ — مولانا غلام قادر گوپاموی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر گوپامئو کی مٹی بہت زرخیز رہی ہے۔ اس میں متعدد علما و فقہا نے جنم لیا اور بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد فاخر تھے جو اپنے عہد کے ممتاز اصحاب علم میں سے تھے۔ ان کے بیٹے مولانا عبدالحق گوپاموی تھے، جنھیں بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ پھر مولانا عبدالحق کے صاحب زادۂ گرامی قدر مولانا غلام قادر گوپاموی تھے جو علوم متداولہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ قاضی ارتضا علی گوپاموی کے شاگرد تھے، جن کا مدراس میں حلقۂ درس قائم تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا غلام قادر نے بھی مدراس کو اپنی تدریسی و تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور طویل عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ اس علاقے میں ان کی مساعی جمیلہ سے لوگوں نے خوب استفادہ کیا اور

---

[۳۷] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۵، ۱۵۶ — حدائق الحنفیہ ص ۴۶۲ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۵۹۔

کثیر تعداد میں اہلِ علم نے ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔

مولانا غلام قادر گوپاموی جہاں درس و تدریس میں ممتاز تھے وہاں تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی انھوں نے تگ و تاز کی اور فقہ و عقائد کے موضوع پر کئی رسالے لکھے لیکن افسوس ہے ان رسالوں کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ صرف یہی پتا چل سکا ہے کہ فقہی مسائل اور عقائد میں انھوں نے تصنیفی خدمات انجام دیں۔ اس عالمِ اجل نے ۴ ربیع الاوّل ۱۲۹۳ھ کو مدراس میں وفات پائی[۳۸]۔

۱۳۔ خلیفہ غلام اللہ لاہوری

خلیفہ غلام اللہ لاہوری اپنے عہد کے لاہور میں فاضلِ اجلّ اور عالمِ اکمل تھے۔ مولانا غلام فرید لاہوری کے فرزندِ نامدار اور خلیفہ غلام رسول لاہوری کے برادرِ صغیر تھے۔ ورع و تقویٰ، زہد و عبادت، درس و تدریس غرض طرزِ حیات کے تمام پہلوؤں میں اپنے والدِ عالی قدر اور برادرِ کبیر کا نقشِ حسین تھے۔ ان کا زمانہ لاہور میں سکھ حکومت کا زمانہ تھا اور ظاہر ہے اس نازک ترین زمانے میں تبلیغ دین اور ترویج اسلام کے لیے میدانِ عمل میں اترنا نہایت مشکل بلکہ بالفاظِ واضح اپنے آپ کو گوناگوں خطرات میں ڈالنا تھا، لیکن خلیفہ غلام اللہ نے نہایت حسن و خوبی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ ان کے مدرسے میں مختلف اوقات میں بے شمار تشنگانِ علم نے حاضری دی اور ان سے استفادہ کیا۔ اس مردِ خدا کی تدریسی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں لوگوں نے ان سے تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، صرف و نحو اور منطق و معانی وغیرہ علوم کی تحصیل کی اور مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس عہد کے پنجاب میں ان تینوں باپ بیٹوں کی تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کی دھوم تھی اور علما کا شاید ہی کوئی ایسا

---

[۳۸] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۹، ۳۶۰۔

خاندان ہو گا جو ان حضراتِ علما سے تعلقِ تلمذ اور علاقۂ نیازمندی نہ رکھتا ہو۔

خلیفہ غلام اللہ لاہوری کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ارکانِ حکومت سے قطعاً روابط نہ رکھتے تھے اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر لوگوں کی علمی اور ذہنی و رُوحانی تربیت کرتے تھے۔ کہنا چاہیے کہ اعلائے کلمۃ اللہ ان کا پیشہ اور اشاعتِ علمِ دین ان کا شیوہ تھا۔

اس عالم اجل نے ۱۲۷۲ھ کو جنّت کی راہ لی "مرجع الفضلا" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔[۳۹]

۱۴۱ ـــــ مفتی غلام محمّد لاہوری

مفتی غلام محمّد لاہوری کا چند پشتوں تک کا سلسلۂ نسب یہ ہے: مفتی غلام محمد بن مفتی رحیم اللہ بن مفتی رحمت اللہ بن مفتی محمد نقی ـــ یہ خاندان علم و ادراک میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ اس کا تعلق مشہور بزرگ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی سے تھا۔ مفتی غلام محمد کے اسلاف میں ایک بزرگ مخدوم مفتی محمد قریشی تھے جو "میاں کلاں" کے عرف سے معروف ہوئے اور جنھوں نے ۸۹۱ھ میں وفات پائی۔ سلطان بہلول لودھی نے ان کو لاہور کا مفتی مقرر کر دیا تھا اور وہ ملتان سے نقلِ مکانی کر کے لاہور آ گئے تھے۔ اپنی سکونت کے لیے اُنھوں نے موچی دروازے کے اندر ایک حویلی تعمیر کی اور ایک محلہ آباد کیا جو اس دودمانِ فضل کی وجہ سے "کوٹلی مفتیاں" کے نام سے موسوم ہوا۔

مفتی محمد قریشی عرف میاں کلاں اپنے دور کے عالم و فاضل اور ماہر علم فقہ تھے، اسی لیے ہندوستان کے بادشاہ بہلول لودھی نے ان کو لاہور کے منصبِ افتا پر

---

[۳۹] حدائق الحنفیہ ص ۴۷۶ ـــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۳

مامور کیا تھا۔ ان کے زمانے میں بھی اور ان کے بعد بھی کئی پشتوں تک لاہور میں افتا کا منصب اسی خاندان کے علما کے سپرد رہا اور انھوں نے اس منصب کے وقار کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا۔ اس خاندان میں بہت سے اُونچے درجے کے علما و فقہا پیدا ہوئے۔

مفتی غلام محمد نے اپنے والد مفتی رحیم اللہ سے اخذِ فیض کیا اور مولانا غلام رسول لاہوری کے حلقۂ درس میں شامل رہے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔

لاہور کے اس عالمِ دین او ر فقیہ نامدار نے ۹۔ ربیع الاوّل ۱۲۷۶ھ (۶ اکتوبر ۱۸۵۹ء) کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ " خورشید دین محمدؐ " سے سنِ وفات نکلتا ہے۔

مفتی غلام محمد کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں نے علم و فضل کے میدان میں بہت شہرت پائی۔

ایک بیٹے کا نام سیّد محمد لاہوری تھا۔ یہ عالم باعمل بزرگ تھے۔ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) کو حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ابھی کوٹ مٹھن پہنچے تھے کہ انتقال کر گئے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں: (۱) خلاصۃ المدارج (۲) فقہ محمدّی اور (۳) مخزن الفرائض۔

دوسرے بیٹے حافظ غلام احمد تھے جو ۱۲۹۰ھ میں فوت ہوئے۔

تیسرے بیٹے کا اسمِ گرامی مفتی غلام سرور لاہوری تھا۔ یہ فارسی، اُردو اور پنجابی کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں خزینۃ الاصفیا، حدیقۃ الاولیأ، مدینۃ الاولیا، بہارستانِ تاریخ، تاریخ مخزنِ پنجاب، مخزن حکمت، تحفۃ الابرار اور تحفۂ سروری وغیرہ شامل ہیں۔ یہ فارسی، اُردو اور پنجابی کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے نثر اور نظم میں خوب خدمت کی اور بہت نام پایا۔ اپنے دور کے یہ بلند پایہ عالم، ممتاز فقیہ، مشہور مؤرخ اور اچھے شاعر تھے۔

مفتی غلام سرور جون ۱۸۹۰ء (۱۳۰۷ھ) میں اپنے برادرزادہ مفتی جلال الدین بن سیّد محمد کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ میں

مبتلا ہو گئے اور دوران سفر میں ۲۴ ۔ ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ (۱۲ اگست ۱۸۹۰ء) کو وفات پا گئے ۔ مولانا غلام دستگیر قصوری ان کے رفیقِ سفر تھے ، انھوں نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور میدانِ بدر کے قریب بالاحسانی میں دفن کیے گئے ۔

۱۵ ـــ حافظ غلام محمّد قادری لاہوری

مولانا حافظ غلام محمّد قادری لاہوری "امام گنگوں" کے نام سے معروف تھے ، ان کا مختصر سا سلسلۂ نسب یہ ہے : حافظ غلام محمد بن حافظ محمد صدیق بن حافظ محمد حنیف بن محمد لطیف ۔ یہ تمام خاندان علم و عرفان کے زیور سے آراستہ تھا ۔ حافظ غلام محمد کے دادا حافظ محمد حنیف کابل سے ترکِ وطن کر کے پنجاب آئے تھے اور پھر مستقل طور پر لاہور میں سکونت پذیر ہو گئے تھے ۔ حافظ محمد حنیف بلاشبہ اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے لیکن اس خاندان کی شہرت کا اصل باعث حافظ محمّد صدیق ہوئے ۔ جو بلند پایہ مدرس ، نامور عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے ۔ حافظ صاحب ممدوح کا سال وفات ۱۱۹۳ھ ہے ۔ یہ لاہور کی مسجد وزیر خاں کے خطیب اور امام تھے۔[۱]

حافظ غلام محمد قادری اپنے عہد کے معروف عالم دین تھے ۔ فقہ و اصول اور دوسرے علومِ مروّجہ پر عبور رکھتے تھے اور مسجد وزیر خاں کی خطابت و امامت ان کے سپرد تھی ۔ اس مسجد میں ان کا سلسلۂ درس و تدریس بھی جاری تھا ۔ سکھوں نے اپنے دورِ حکومت میں بہت سی مسجدوں کو بارود خانے اور گھوڑوں کے اصطبل بنا لیا تھا ، لیکن حافظ غلام محمّد کی حکمتِ عملی کے باعث مسجد وزیر خاں ان کی دست برد

---

[۱] مولانا حافظ محمد صدیق لاہوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد پنجم حصہ دوم ص ۱۹۰ تا ۲۰۱ ۔

سے محفوظ رہی ۔ ان کی نیکی، نرم مزاجی اور فراوانی علم وفضل کی بدولت لاہور کے سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے، ارکان حکومت بھی ان کی تکریم بجالاتے تھے ۔ ان کا طرز زندگی کچھ ایسا تھا کہ سکھ حکمران بھی ان کی عزت کرتے تھے، یہاں تک کہ خود مہاراجہ رنجیت سنگھ ان کو ذاتی طور پر جانتا اور ان سے تکریم کے ساتھ پیش آتا تھا، اور اس دور میں یہ بہت بڑی بات تھی ۔

حافظ غلام محمد نہایت نرم دل اور نیک خو تھے، صوفیا کی مجالس میں حاضری دیتے، اہل اللہ سے مخلصانہ روابط رکھتے اور درویش صفت لوگوں سے محبت والفت کا برتاؤ کرتے تھے ۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ اونچے درجے کے خوش نویس تھے اور اجرت پر کتابت کرکے گزر بسر کرتے تھے ۔ اس آمدنی کا بڑا حصہ غربا و مساکین اور مستحقین میں بانٹ دیتے تھے ۔

ان کے زمانے میں مسجد وزیر خاں کا مدرسہ مرجع علما وطلبا تھا، طلبا کا وہ بہت خیال رکھتے اور ان کی ضروریات خود مہیا کرتے ۔ اگر کوئی طالب علم بیمار پڑ جاتا تو اس کا علاج کراتے اور اگر مالی پریشانی میں مبتلا ہوتا تو اس کی پریشانی کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ۔

فارسی کے وہ اچھے شاعر تھے اور پر تاثیر شعر کہتے تھے، غریب تخلص کرتے تھے ۔ ان کا وعظ بھی بہت مؤثر ہوتا تھا۔ صاحب تصنیف بھی تھے ان کی تصنیف شدہ ایک کتاب کا نام "شمس التوحید" اور دوسری کا "گنج مخفی" ہے ۔ جو فارسی نظم میں ہے ۔

لاہور کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی اور مسجد وزیر خاں کے باہر دفن کیے گئے[۱۴۱]

---

[۱۴۱] حدیقۃ الاولیا، ص ۳۶۴ ۔

۱۶۔۔۔۔ حافظ غلام محیّ الدّین بگوی

مولانا حافظ غلام محی الدین بگوی پنجاب کے جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ کئی پشتوں سے مرجع خلائق تھا اور اس کے تمام افراد علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی دولت سے مالا مال تھے۔ ان کے والد کا نامِ نامی حافظ نور حیات، دادا کا حافظ محمد شفا اور پردادا کا اسمِ گرامی حافظ نور محمد تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مشہور صحابی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

حافظ غلام محی الدین کے اسلاف میں ایک بزرگ مولانا عبدالرحمٰن بن صالح تھے جو آٹھویں صدی ہجری میں واردِ پنجاب ہوئے۔ پھر مولانا عبدالرحمٰن کی اولاد میں سے ایک بزرگ مولانا محمد ہاشم نے گیارھویں صدی ہجری میں دریائے جہلم کے کنارے موضع بگہ میں سکونت اختیار کی، جو بھیرہ کے قریب ضلع سرگودھا میں ہے۔

مولانا محمد ہاشم کے دو بیٹے تھے، ایک محمد صالح، دوسرے محمد یوسف۔ دونوں کو اللہ نے علم وعرفان اور زہد وورع کی نعمت سے نوازا تھا۔ مولانا محمد صالح کی اولاد نے قصبہ بھادریاں اور شاہ پور کو اپنا مسکن بنایا اور مولانا محمد یوسف کے اخلاف نے اپنے آبائی گاؤں بگہ میں اصلاح وارشاد اور درس وتدریس کا حلقہ قائم کیا۔ پھر آگے چل کر مولانا محمد یوسف کے جانشین مولانا میرداد بگوی اور مولانا میرداد کے صاحب زادے حافظ نور محمد بگوی اپنے عہد کے ممتاز عالم ہوئے جو مبلغ کتاب و سنّت تھے اور غیر شرعی رسوم ورواج کے شدید مخالف! حافظ نور محمد کے مسند نشین حافظ محمد شفا ہوئے جو شاہ زندہ کے عرف سے معروف تھے اور جنھوں نے ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی۔۔۔۔ مولانا حافظ غلام محی الدین انہی حافظ محمد شفا کے پوتے تھے اور والد کا اسمِ گرامی حافظ نور حیات تھا۔

حافظ غلام محی الدین بگوی اپنے دور کے جیّد عالم تھے۔ تفسیر وحدیث، فقہ وکلام،

اصول و معانی اور دیگر علوم متداولہ پر کامل عبور رکھتے تھے اور زہد و اتقا میں بے مثال تھے ــــ ماہِ محرم ۱۲۱۰ھ (۹۵-۱۷۹۵ء) کو اپنے آبائی گاؤں بگہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے بارے میں ایک عجیب و غریب واقعہ منقول ہے جو ان کے بالکل ابتدائی ایام حیات سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے راوی ان کے والد ماجد حافظ نور حیات ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن وہ تہجّد کے لیے اُٹھے تو از راہِ محبّت اپنے اس بچّے غلام محی الدین کو اُٹھا کر اپنے ساتھ ہی لے گئے اور دریائے جہلم کے کنارے جا پہنچے۔ کپڑا بچھا کر بچّے کو لٹا دیا اور خود وضو کرکے نوافل میں مشغول ہو گئے۔ اندھیری رات تھی اور بچّہ قدرے فاصلے پر تھا۔ کچھ دیر بعد انھیں خیال گزرا کہ ایسا نہ ہو کوئی درندہ آجائے اور بچّے کو اذیت پہنچائے، بچّے کو اپنے پاس ہی لٹانا چاہیے۔ اس خیال سے جب وہ بچّے کو اُٹھانے گئے تو دیکھا کہ ایک مبارک صورت سفید ریش بزرگ بچّے کو گود میں لیے بیٹھے ہیں۔ باپ نے بزرگ سے درخواست کی کہ اس بچّے کے لیے دُعا فرمائیں کہ یہ باعمل عالم ہو۔ بزرگ نے جواب دیا کہ یہ ازل ہی سے باعمل عالم ہے اور اس سے لوگوں کو بہت فیض پہنچے گا۔ یہ الفاظ کہہ کر وہ بزرگ آنکھوں سے غائب ہو گئے۔

مولانا غلام محی الدین کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بچپن ہی میں عام لڑکوں کے ساتھ نہ کھیل کود میں شریک ہوتے اور نہ ان کی ہنگامہ آرائی میں کوئی حصّہ لیتے تھے، زیادہ تر خاموش رہتے اور اپنے ہم عمروں کو بھی خاموش رہنے کی تلقین کرتے۔ اس لب و لہجے سے بات کرتے کہ لڑکے ان سے مرعوب ہو جاتے۔

جب چار برس چار ماہ کے ہوئے تو والد نے ان کو مسجد میں لے جا کر حافظ حسن کے سپرد کر دیا جو بچّوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے۔ حافظ حسن کی اپنی روایت ہے کہ قرآن شریف پڑھاتے وقت وہ بچّوں پر بہت سختی کرتے تھے اور جو بچّے سبق یاد نہ کر پاتے یا پڑھنے میں سستی کرتے اُنھیں سخت سزا دی جاتی تھی لیکن غلام محی الدین نے ان کو اس کا کبھی موقع نہیں دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اُنھیں بعض دفعہ خیال ہوتا تھا کہ

اس بچّے کو سبق نہیں آتا ہوگا، مگر جب سُنا اس نے صحیح صحیح سُنا دیا۔ اس طرح اُنھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں قرآن شریف پڑھ لیا۔ عالمِ طفولیت ہی میں نہایت ذہین تھے۔

غلام محی الدین نے قرآن پڑھ تو لیا تھا لیکن حفظ نہیں کیا تھا۔ آواز بہت اچھی تھی۔ قرآن مجید ختم کرنے کے بعد پہلا رمضان آیا تو لوگوں نے ان کے والد حافظ نور حیات سے کہا کہ غلام محی الدین سے نوافل میں قرآن سُننا چاہیے۔ والد نے بیٹے سے پوچھا تم قرآن شریف سُنا سکو گے؟ عرض کیا کہ اگر آپ روزانہ میرے ساتھ ایک پارے کا دَور کر لیا کریں تو سُنا سکوں گا۔ چنانچہ یہ سلسلہ شروع کر دیا گیا اور اسی رمضان میں پورا قرآن حفظ کر لیا اور سُنا بھی دیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ "آپ پورے دن میں ایک پارہ حفظ کرتے تھے؟" بولے "نہیں! چاشت کے وقت تک ایک پارہ حفظ ہو جاتا تھا"۔

قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد علوم متداولہ کے حصول کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور اپنے چھوٹے بھائی احمد الدین کو ساتھ لے کر دہلی جانے کا قصد کیا۔ احمد الدین کی عمر اس وقت صرف آٹھ سال تھی اور وہ قرآن مجید کا دسواں پارہ حفظ کر رہے تھے، مگر دہلی کی تیاری اور وہاں پہنچنے تک اُنھوں نے پورا قرآن حفظ کر لیا۔[۹۴]

دہلی اس زمانے میں مرکزِ علم و علما تھا اور بہت سے اصحاب کا سلسلۂ درس وہاں جاری تھا۔ دونوں بھائیوں نے مختلف حضراتِ علما سے حصولِ علم کیا مگر حدیث کا درس حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی سے لیا اور سندِ حدیث حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حاصل کی۔ یہاں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ جب مولانا غلام محی الدین حدیث کی کتابیں ختم کر چکے تو ان کے اُستادِ محترم شاہ محمد اسحاق

---

[۹۴] مولانا حافظ احمد الدین کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے پاک و ہند، تیرھویں صدی ہجری جلد اوّل از صفحہ ۸۸ تا ۹۱۔

اپنے اس عزیز شاگرد کو حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے گئے اور سندِ حدیث عطا فرمانے کی درخواست کی۔ شاہ عبدالعزیز نے حدیث اور علم حدیث سے متعلق ان سے متعدد سوالات پوچھے، جن کے اُنھوں نے صحیح صحیح جواب دیے۔ شاہ صاحب بہت خوش ہوئے اور سندِ حدیث عنایت فرما کر ان کے لیے دُعا فرمائی اور فرمایا۔ "ان شاء اللہ تعالیٰ آپ سے بڑا فیض ہوگا" ——— اور نصیحت کی کہ "جب تم وطن واپس جاؤ تو ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے تفرقہ پڑے۔"

قیامِ دہلی کے زمانے میں شاہ غلام علی مجدّدی دہلوی سے بیعت ہوئے اور ان کی صحبت سے استفاضہ کیا۔

علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد اپنے وطن (بگہ) آئے۔ ان کے والد ماجد حافظ نور حیات وفات پا چکے تھے۔ پنجاب میں سکھوں کا دورِ حکومت تھا۔ مولانا غلام محی الدین کی علمی شہرت گرد و نواح میں پہنچ چکی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر فقیر عزیزالدین کو ان کے علم و فضل کا پتا چلا تو وہ بگہ گئے، مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں بگہ سے لاہور تشریف لانے پر زور دیا۔ چنانچہ وہ لاہور آ گئے اور بازار حکیماں کی لال مسجد میں مسندِ درس بچھائی۔ تقریباً تیس سال اس مسجد میں ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔ اس اثنا میں بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا — لاہور ہی میں وہ مرض استرخا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پھر اپنے گاؤں بگہ تشریف لے گئے۔ قیامِ بگہ کے زمانے میں تیرہ چودہ سال اس مرض میں مبتلا رہے، مگر حالتِ مرض میں بھی تعلیم و تدریس کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں پنجاب کے معروف بزرگ مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ) کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔

مولانا غلام محی الدین بگوی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، صرف و نحو، علم کلام، منطق و فلسفہ اور معانی و بیان وغیرہ تمام علوم مروجہ میں مہارت رکھتے تھے اور فقہی فتووں کے لیے کثیر تعداد میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔ نہایت

متقی، پرہیزگار، متحمل مزاج اور کثیر الدرس وکثیر المطالعہ عالم تھے۔ترویج علم اور اشاعتِ دین کا سلسلہ اب بھی کسی نہ کسی انداز میں اس خاندان میں جاری ہے۔

مولانا غلام محی الدین نے دوشنبہ کی شب ۳۰ شوال ۱۲۷۳ھ (۲۲ رجون ۱۸۵۷ء) کو اپنے آبائی گاؤں بگہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے "غورشید عالم" کے الفاظ سے سنِ وفات نکلتا ہے[۴۳]

۱۷ـــــ مفتی غلام مصطفیٰ بردوانی

مفتی غلام مصطفیٰ بردوانی اپنے عصر اور علاقے کے شیخ وفاضل بزرگ تھے اور فنونِ حکمیہ وعلوم عقلیہ پر بالخصوص عبور رکھتے تھے۔علم فقہ میں بھی انھیں درک حاصل تھا، بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی کے لائق شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، بحرالعلوم کے علاوہ اس دور کے دیگر اساتذہ سے بھی اُنھوں نے اخذِ علم کیا۔چونکہ علمِ فقہ میں ماہر تھے اس لیے تکمیل تعلیم کے بعد انھیں شہر "اٹاوہ" کا مفتی مقرر کر دیا گیا تھا۔طویل عرصے تک اس شہر کے منصبِ افتا پر فائز رہے اور اس باب میں بہت شہرت پائی۔پھر اٹاوہ سے ان کا تبادلہ "بیربھوم" میں کر دیا گیا جو بنگال میں ہے۔

مفتی غلام مصطفیٰ بردوانی فارسی کے بہت اچھے شاعر بھی تھے، فارسی کا ایک دیوان ان سے یادگار ہے[۴۴]

۱۸ـــــ مولانا غلام ناصر رام پوری

مولانا غلام ناصر کے والد کا نام محمد اکرم اور جدِّ امجد کا اسمِ گرامی محمد اسلم تھا۔اصلاً

---

[۴۳] حدائق الحنفیہ ص ۴۷۶ تا ۴۷۷ ــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۷، ۱۵۸۔

[۴۴] نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۶۱۔

خراسان کے رہنے والے تھے۔ان کے اسلاف میں سے کوئی بزرگ ہندوستان آئے اور یوپی کے شہر رام پور میں اقامت گزیں ہوئے۔اس زمانے میں رام پور کو ایک مسلمان ریاست کی حیثیت حاصل تھی اور بہت سے علما و فضلا اس ریاست میں موجود تھے۔

مولانا غلام ناصر کی ولادت اور تربیت رام پور میں ہوئی اور وہاں کے اساتذہ سے شرفِ شاگردی حاصل کیا۔تعلیم سے فراغ کے بعد جبل پور کے عہدۂ قضا پر فائز ہوئے۔عرصۂ دراز تک اس منصب پر فائز رہے۔

نہایت حلیم الطبع، متواضع، خوب رو، عمدہ کلام اور بلند اخلاق تھے۔شاعر بھی تھے اور بہت اچھے شعر کہتے تھے۔علم فقہ میں تو درک رکھتے ہی تھے، اس کے علاوہ ریاضی میں بھی کامل دسترس تھی۔دیگر علوم مروّجہ پر بھی گہری نظر تھی۔غرض تیرھویں صدی ہجری کے یہ ہندی عالم و فقیہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے اور تمام متداولہ اصنافِ علم سے ان کو گہرا ربط و تعلق تھا۔

اس جلیل القدر فقیہ نے ۹ شعبان ۱۲۵۹ھ کو رام پور میں وفات پائی۔[۴۵]

۱۹۔۔۔۔قاضی غلام یحییٰ بہاری

قاضی غلام یحییٰ بہاری فقہ و اصول کے ممتاز و ماہر علما میں سے تھے اور صاحبِ فضل و کمال اور شیخ عصر تھے۔کلکتہ کے منصبِ قاضی القضاۃ پر متمکن تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں فقہ کی بلند پایہ کتاب ہدایہ کا فارسی ترجمہ کیا۔یہ ترجمہ لارڈ ہیسٹنگ کے زمانے میں مولوی تاج الدین بنگالی، میر محمد یٰسین ایرانی اور مولوی شریعت اللہ سنبھلی کی مدد سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔پھر اس فارسی ترجمے کے حصۂ معاملات کو کپتان ہملٹن نے انگریزی

---

[۴۵] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۶۲ بحوالہ یادگار انتخاب۔

میں منتقل کیا جو تین جلدوں پر مشتمل ہے لیکن انگریزی ترجمے میں متعدد مقامات پر بہت سی فاش غلطیاں تھیں لن اغلاط سے اس زمانے کے ہندوستان کے چیف جسٹس جان ہربرٹ ہارنگٹن کو مطلع کیا گیا تو انھوں نے ۱۲۲۱ھ میں ترجمے کی نظر ثانی اور تصحیح کے لیے اس عہد کے نامور عالم و فقیہ مولانا محمد راشد بردوانی کی خدمات حاصل کیں۔ انھوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے ترجمے کی تصحیح اور تنقیح و تہذیب کا فرض انجام دیا۔[۴۶]

بلاشبہ قاضی غلام یحییٰ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم اور نامور فقیہ تھے جو ایک طرف کلکتہ کے قاضی القضاۃ تھے تو دوسری طرف انھوں نے ہدایہ کو عربی سے فارسی زبان کے قالب میں ڈھالا۔ ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتا نہیں چل سکا۔

چند دیگر فقہائے کرام

ان حضرات کے علاوہ جن کا گزشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے، حرف غ میں تین ایسے فقہائے کرام بھی ہیں جن کے بارے میں نہ تو یہ معلوم ہو سکا ہے کہ کوئی ان کی فقہی نوعیت کی کتاب تھی، نہ یہ پتا چل سکا ہے کہ وہ کہیں منصب قضا پر فائز رہے، نہ اس امر کا سراغ مل سکا ہے کہ کسی جگہ ان کو عہدۂ افتا پر متمکن کیا گیا ہو اور نہ ان کے زیادہ حالات میسّر آسکے ہیں۔ بس اتنا علم ہوا ہے کہ یہ فقیہ تھے۔ ان کے متعلق جو کچھ پتا چل سکا ہے وہ درج ذیل ہے:۔

۱۔ مولانا غضنفر لکھنوی:۔

مولانا حیدر انصاری فرنگی محلی کے بیٹے اور مولانا محمد مبین کے پوتے تھے۔ فرنگی محل (لکھنؤ) کے نامور عالم اور فقیہ تھے۔ بہت اچھے واعظ اور مبلغ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے چچا مولانا محمد معین اور مفتی ظہور اللہ انصاری لکھنوی سے

۴۶؎ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۶۴۔

حصولِ علم کیا۔ کافی عرصہ ان کے حلقۂ شاگردی میں رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تدریس و تذکیر میں مشغول ہو گئے۔ اپنے والد محترم مولانا حیدر انصاری کے ساتھ حج بیت اللہ کیا اور ان کے ساتھ حیدر آباد گئے۔ پھر لکھنؤ گئے اور شادی کی بعد ازاں پھر حیدر آباد (دکن) کا عزم کیا اور وہیں ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔

۲۔ مولانا غلام احمد سورتی:

مولانا غلام احمد بن غلام محمد بن ولی اللہ سورتی گجراتی اپنے دور کے مشہور شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ صوبہ گجرات کے شہر سورت میں پیدا ہوئے، ان کے والد مولانا غلام محمد سورتی جلیل القدر عالم تھے۔ بیٹے نے انہی سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھیں پھر تمام عمر درس و افادۂ طلبا میں مشغول رہے۔ فقہائے حنفیہ میں عزت واحترام کے مالک تھے۔ ۲۹ ربیع الاوّل ۱۲۷۶ھ کو وفات پائی اور اپنے والد کے قریب سورت میں دفن کیے گئے۔

۳۔ سیّد غلام نبی حیدر آبادی:

سیّد غلام نبی بن غلام سرور حسینی حیدر آبادی اپنے وقت کے شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ مولد و منشا حیدر آباد (دکن) ہے۔ اپنے عہد کے اساتذہ سے کسبِ علم کیا اور والد کی وفات کے بعد حیدر آباد کی مسجد میں خطیب مقرر ہوئے۔ اس علاقے کے محدّث و فقیہ تھے۔ نہایت باہمّت سخی اور صاحبِ مجد و شرف تھے۔ ۱۲۵۲ھ کو حیدر آباد (دکن) میں انتقال کیا۔

ف

۲۰۔ مولانا فضل رسول عثمانی بدایونی

مولانا فضل رسول بدایونی عثمانی مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور اپنے علاقے اور عہد کے جیّد عالم تھے۔ ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور بعض درسی کتابیں اپنے والد مکرم مولانا عبدالمجید عثمانی بدایونی سے پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے، وہاں مولانا نور الحق انصاری لکھنوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شریک ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ درسی کتابوں کی تکمیل کے بعد دھول پور کا قصد کیا۔ وہاں حکیم پیر علی موہانی سے علمِ طب کی کتابیں پڑھیں۔ دھول پور میں مطب بھی کھولا اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ پھر ان کے والد مولانا عبدالحمید نے انھیں بدایوں بلالیا، کچھ مدت وہاں رہنے کے بعد بنارس چلے گئے۔ بنارس میں لوگوں کے علاج معالجے کا سلسلہ شروع کیا، وہاں مدتِ مدید تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر بدایوں آگئے اور وہاں اپنے والدِ گرامی سے اخذِ طریقت کیا۔ بعد ازاں حجازِ مقدس گئے اور حج و زیارت سے بہرہ مند ہوئے۔ وہاں شیخ عبداللہ سراج مکّی اور مولانا محمّد عابد سندھی مدنی سے سندِ حدیث حاصل کی۔

اس کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور عرصے تک اپنے شہر میں رہے۔ بعد ازاں پھر قصدِ حجاز کیا اور حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر بغداد کو روانہ ہوئے۔ وہاں سیّد علی نقیب اشراف سے اخذِ طریقت کیا۔ بغداد سے پھر ہندوستان کی راہ لی۔ حیدرآباد (دکن) اس زمانے میں مرکزِ علم و علما تھا، وہاں انھیں نہایت قدر و منزلت حاصل تھی اور اس نواح میں کثرت سے جانتے تھے۔ حیدرآباد کے امرائے دولت ان سے خاص تعلقِ خاطر رکھتے، اپنی مجالس میں جگہ دیتے اور ان کی

مالی خدمت کرتے تھے۔

مولانا فضل رسول بدایونی بہت بڑے فقیہ اور مجادلہ و مناظرہ میں مشہور تھے۔ اپنے مسلک اور نقطۂ نظر میں سخت متعصّب تھے۔ علما سے مخاصمت اور بحث و جدل میں بہت تیز تھے۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی تکفیر کرتے تھے اور انھوں نے بدعات و رسوم کی جو تردید کی ہے، اُس کو غلط قرار دیتے تھے۔ بعض مسائل کی وضاحت کے سلسلے میں حضرت مجدّد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کو بھی ہدفِ تنقید بنا لیتے اور اس ضمن میں بہت آگے نکل جاتے۔

مولانا فضل رسول بدایونی متعدد کتابوں کے مصنف اور محشّی تھے، جن میں یہ کتابیں شامل ہیں:۔

البوارق المحمدیہ، تصحیح المسائل، سیف الجبار، فوز المومنین، تلخیص الحق، المعتقد المنتقد، احقاق الحق، کتاب الصلوٰۃ۔ کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے فصوص الحکم کی شرح بھی لکھی۔ علاوہ ازیں فلسفہ و منطق کی بعض درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔

مولانا فضل رسول بدایونی انگریزی حکومت کی ملازمت بھی کرتے رہے۔ پہلے مفتیٔ عدالت اور پھر کلکٹری میں سر رشتہ دار کا منصب عطا ہوا۔ اس زمانے میں ضلع بدایوں کا صدر مقام سہسوان تھا۔ بنارس میں راجہ انوپ سنگھ کے ہاں سلسلۂ ملازمت میں منسلک رہے۔ کچھ عرصہ بریلی میں مطب کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جب بدایوں پر انگریزوں کا نظم و نسق باقی نہ رہا تو چند روز وہاں کا انتظام کیا اور سرکاری عملے کی حفاظت کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں وہ انگریزوں کے حامی تھے، جب انگریزوں کا بدایوں پر تسلّط نہ رہا تو اُنھوں نے ان کے مال و جان کو بچانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:۔

> بدایوں میں انگریزی حکومت ختم ہو جانے کے بعد عجیب افراتفری رہی مگر مولوی فضل رسول بدایونی نے کچھ انتظام برقرار رکھا اور لوگوں کی جان و مال بچانے کی کوشش کی۔" جبیب الاخبار" بدایوں مورخہ ۲۵ رجون ۱۸۵۷ء مطابق ۳ ذیقعدہ

۱۲۷۳ھ رقم طراز ہے :۔

چونکہ مقدس عالم اور صوفی مولوی فضل رسول نے اعلیٰ انتظامات کیے، لہٰذا کوئی ناقابلِ مدافعت خاص واقعہ وقوع پذیر نہ ہوا۔ انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر لٹیروں اور غارت گروں کی غارت گری سے لوگوں کو بچانے میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا اور سرکاری آدمیوں کی حفاظت اور امن کے لیے پوری کوشش کی۔[1]

اس سے آگے لکھتے ہیں :۔

سرکاری ملازم بہاری لال سب ڈپٹی انسپکٹر ساکن بدایوں جو اس زمانے میں وہیں تھا، لکھتا ہے :۔ حقیقت میں کھٹک کے ٹھاکروں اور شیر علی نے موضع کھیڑا انزا دہ کے مسلمان چودھریوں کو ساتھ ملا کر چاہا کہ شہر بدایوں کے شرفا کو لوٹ لیں اور اپنے خبط کی تسکین کا سامان فراہم کریں۔ لیکن مولوی فضل رسول کے بہترین انتظام نے بدایوں کو اس مصیبت سے بچالیا۔ مولوی مذکور ان نیک سیرت اور ولی سیرت لوگوں میں سے ہے، جو آج کل نایاب ہیں۔[2]

۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے انگریزوں کی برملا حمایت کی، مگر بعض لوگ اس کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری تحریر کرتے ہیں :۔

مولانا فضل رسول بدایونی کے سوانح نگار نے اس واقعہ پر کشف و کرامات کا پردہ ڈالا ہے، ورنہ حقیقت ظاہر ہے۔[3]

ردِّ وہابیت میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی۔ ان کے والد مولانا عبدالحمید بدایونی عثمانی نے بھی رَدِّ وہابیت میں ایک رسالہ تصنیف کیا۔ فقہ اور فلسفہ و حکمت کے

---

[1] جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۱۴۰۔
[2] ایضاً ص ۱۴۰، ۱۴۱۔ بحوالہ فریڈم سٹرگل، ج ۵ ص ۳۱۸
[3] ایضاً ص ۱۴۱۔

نامور علما میں سے تھے۔ دُنیا اور دنیا داروں سے خاص طور سے تعلق تھا۔ آخر عمر میں بینائی جواب دے گئی تھی۔ اپنے والدِ محترم سے خرقۂ خلافت پہنا، ان کے سجادہ نشین ہوئے اور سلسلۂ بیعت جاری کیا ـــــ وہ ترکی بھی گئے اور سلطان ترکی کے مہمان ہوئے۔

انگریزوں کی حمایت کے صلے میں اُنھوں نے مراد آباد کے کمشنر سے اپنی موروثی جائداد کا معافی نامہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ لیکن ان تمام امور کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ ہے کہ وہ ہمیشہ تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور بحث و مناظرہ میں مشغول رہے۔ متعدد علمانے ان سے استفادہ کیا، جن میں مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا سخاوت علی جون پوری مفتی اسد اللہ الٰہ آبادی اور مولانا عنایت رسُول چریاکوٹی شامل ہیں۔

ہندوستان کے اس عالم و فقیہ نے ستتّر برس عمر پائی اور پنج شنبہ کے روز ۳۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۹ھ کو فوت ہوئے۔ بدایوں میں دفن کیے گئے۔[۴۵]

۲۱ ـــــ مولانا فیاض علی عظیم آبادی

مولانا فیاض علی عظیم آبادی مجاہد علما اور سربکف فقہا میں سے تھے۔ مجاہدین کے اس نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جو عظیم آباد (پٹنہ) میں مقیم تھا۔ والد کا نام الٰہی بخش اور جدِّ امجد کا اسمِ گرامی ہدایت علی تھا۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے عم محترم حضرت جعفر طیّار رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے، اس لیے جعفری کی نسبت سے مشہور تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ عظیم آبادی تھے، جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد اور انگریزی حکومت کی مخالفت کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرایا۔ عظیم آباد (پٹنہ) کے پہلے مقدمۂ بغاوت میں گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا اور رمضان کی آخری تاریخ ۱۲۸۱ھ (۲۷ رفروری ۱۸۶۵ء) کو سزا کا حکم صادر ہوا۔ پہلے ضبطی جائداد اور پھانسی

---

[۴۵] تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ص ۱۶۳، ۱۶۴ ـــــ تذکرہ علمائے ہند (اُردو ترجمہ) ص ۳۸۰ تا ۳۸۳ ـــــ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۷۷، ۳۷۸ ـــــ قاموس المشاہیر ج ۲ ص ۱۲۷۔

کی سزا کا فیصلہ سُنایا گیا۔ پھر پھانسی کی سزا کو حبسِ دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو کالے پانی پہنچے اور وہیں ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ (۲۱ نومبر ۱۸۸۱ء) کو وفات پائی۔

مولانا فیاض علی عظیم آبادی، مولانا احمد اللہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ درسی کتابیں مولانا احمد اللہ سے پڑھیں۔ حدیث اور فقہ کی تعلیم مولانا ولایت علی عظیم آبادی سے حاصل کی۔ مولانا ولایت علی بھی اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور نامور مجاہد تھے۔ حدیث کی سند انہی سے لی۔ ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی اور عرصے تک ذکر و اذکار اور تدریس و تذکیر میں مشغول رہے۔ فنِ سپہ گری بھی سیکھا اور اس میں مہارت تام حاصل کی۔ ۱۸۴۶ء میں مولانا ولایت علی کے ساتھ جہاد کے لیے سرحد گئے اور جنگِ دُب کے بعد انہی کے ساتھ واپس آئے۔ جنگِ امبیلہ میں بھی شریک تھے۔ مجاہدین میں ان کا نام بصیر الدین تھا۔ تذکیر و موعظت میں بہت مشہور تھے۔ نہایت مؤثر وعظ کہتے تھے۔ بے شمار علما اور عوام نے ان سے فیض حاصل کیا۔ تبلیغِ جہاد کے سلسلے میں صوبہ بنگال ان کی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔

سرحد سے واپس آکر عظیم آباد (پٹنہ) میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو دعوتِ جہاد بھی دیتے تھے اور سرحد جاکر انگریزی حکومت کے ساتھ جنگ کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں انھیں مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے وزیر اور دستِ راست سمجھا جاتا تھا۔

دوبارہ مستقل طور سے مع اہل و عیال کے ہجرت کر کے سرحد چلے گئے تھے۔ مال و متاع، گھر کے سامان اور مویشی وغیرہ سب چیزوں سے دست بردار ہو گئے تھے ــــ شاہ محمد حسین ننموہیہ کی دوسری صاحب زادی سے نکاح ہوا۔ اولاد سے محروم تھے۔ بڑے بھائی مولانا احمد اللہ کے فرزند مولانا اشرف علی کو متبنّٰی بنا لیا تھا۔ علاقہ سرحد میں غالباً گلونولوڑی میں وفات پائی[۵]۔

---

[۵] نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۸۰ ــ سرگزشتِ مجاہدین ص ۳۷۳، ۳۷۴۔

ان کے متبنیٰ مولانا اشرف علی جو مولانا احمد اللہ کے فرزند تھے، ان کے ساتھ ہی سرحد چلے گئے تھے۔ مولانا فیاض علی کی وفات کے بعد وطن واپس آگئے تھے۔ بعد میں عبدالقدیر نام رکھا اور مختلف علوم و فنون حاصل کیے۔ بنارس کالج میں ریاضی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے "اودھ اخبار"، لکھنؤ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ کچھ مدت بہاول پور میں قیام کیا اور ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ سابقہ سرگرم سیاسی زندگی تمام عمر ان کے لیے سخت پریشانی کا باعث بنی رہی۔ خاندان کے باقی افراد کی طرح بہت باہمت اور صاحب عزم و استقلال تھے۔ ۲ ـــــ شوال ۱۳۲۶ھ (۲۸ ـــــ اکتوبر ۱۹۰۸ء) کو وفات پائی۔[۱]

چند دیگر فقہائے کرام

ان کے علاوہ حرف ف میں چند دیگر فقہائے کرام بھی شامل ہیں، جن کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:۔

۱۔ مولانا فخر الدین ویلوری

علاقہ مدراس کے شہر ویلور کے رہنے والے تھے۔ ممتاز عالم اور فقیہ تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ ہمیشہ تعلیم و تدریس کو اپنا مشغلۂ حیات بنائے رکھا۔ کثیر الدرس والافادہ تھے۔ خلقِ کثیر نے ان سے فیض حاصل کیا۔ (تاریخ نوائط)

۲۔ مولانا فرحت حسین عظیم آبادی

والد کا نام فتح علی اور دادا کا وارث علی تھا۔ خاندانی لحاظ سے ہاشمی زبیری تھے۔ اپنے دور کے عالم، محدث اور فقیہ تھے۔ نیکی اور تقوے میں بہت مشہور تھے۔ ۱۲۲۶ھ میں عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولانا فتح علی عظیم آبادی سے علم حاصل کیا۔ شیخ محمد واعظ اور اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی عظیم آبادی سے بھی استفادہ کیا۔ سندِ حدیث مولانا ولایت علی سے لی۔ اخذِ طریقت سید احمد شہید بریلوی سے کیا۔

---

[۱] سرگزشت مجاہدین، ص ۳۷۴، ۳۷۵۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی جگہ مسندِ درس پر فائز ہوئے۔ موعظت و تذکیر کا فریضہ بھی خوب انجام دیا۔ اس کے بعد جہاد کے لیے سرحد گئے۔ بے شمار علما و مشائخ نے ان سے فیض حاصل کیا۔ اس عالم و فقیہ نے صرف اڑتالیس سال عمر پائی اور ۱۲۷۴ھ کو فوت ہوئے۔

۳۔ قاضی فضل الرحمٰن قرشی بردوانی

بردوان (بنگال) میں پیدا ہوئے۔ اپنے عصر اور علاقے کے بہت بڑے شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ مولانا امین اللہ عظیم آبادی اور اپنے بڑے بھائی قاضی غلام سبحان قرشی بردوانی سے علم حاصل کیا۔ دیگر علما سے بھی مستفید ہوتے۔ علم سے فارغ ہونے کے بعد بنگال کے قاضی مقرر ہوئے۔ بعد ازاں انگریزی حکومت نے انھیں ہندوستان کا قاضی القضاۃ بنا دیا تھا۔ عرصے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ مسلکاً حنفی تھے۔

۴۔ مفتی فضل اللہ امروہوی

والد کا اسم گرامی سیّد سردار احمد حسینی رضوی تھا۔ امروہہ میں پیدا ہوئے اور اپنے دور کے مشہور اساتذہ سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ اصول و فقہ اور دیگر علوم میں ماہر اور شیخ مانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ٹونک گئے۔ ٹونک میں نواب محمد علی خاں نے ان سے علم حاصل کیا اور پھر ٹونک کا منصب افتا اُن کے سپرد کیا گیا۔

۵۔ سیّد فقیہ اللہ سندیلوی

والد کا اسم گرامی اصلح الدین اور دادا کا علاؤ الدین تھا۔ حسینی سیّد تھے۔ فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ ۱۲۰۳ھ کو سندیلہ میں ولادت ہوئی اور علما کی ایک جماعت سے استفادہ کیا، جن میں شیخ احمد بخش سندیلوی، مولانا محمد ہادی دلوی، مولانا غلام حسین بنگالی، مولانا محمد اسلم بلگرامی، مولانا نورالحق لکھنوی، مولانا محمد حیدر لکھنوی، مولانا سراج الحق لکھنوی، مفتی محمد اصغر لکھنوی اور سیّد جعفر علی کسمنڈوی شامل ہیں۔ پھر تدریس و تذکیر کا سلسلہ شروع کیا اور بہت سے لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ۲۲ صفر ۱۲۵۹ھ کو سندیلہ میں وفات پائی۔

ق

۲۲ — مولانا قطب الدین دہلوی

مولانا قطب الدین دہلوی کے والدِ گرامی کا نام محی الدین تھا۔ شیخ وعالم، محدّث وفقیہ اور صاحبِ صلاح وتقوی بزرگ تھے، حنفی المسلک تھے اور کبارِ فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علم فقہ پر عبور میں شہرت رکھتے تھے۔ ۱۲۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا محمد اسحاق دہلوی سے حدیث وفقہ کی کتابیں پڑھیں اور طویل عرصے تک ان کی صحبت و رفاقت میں رہنے کا شرف حاصل کیا۔ تفسیر وحدیث، فقہ واُصول اور دیگر علوم میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ جامع معقول و منقول اور حاویِ فروع و اُصول تھے۔ مسائلِ فقہی پر گہری نظر تھی اور بڑی بڑی کتابوں کی عبارتیں حفظ تھیں۔ ان کے حلقۂ درس میں بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا اور ان کے فتوے کو دلائل کے اعتبار سے خاص اہمیت دی گئی۔ یگانۂ علم وفضل اور ماہرِ فقہ واُصول ہونے کے ساتھ ساتھ زہد وعبادت اور عفت وقناعت میں بھی منفرد حیثیت کے حامل تھے۔ اپنے مسلکِ فقہی میں تعصب کی حد تک متشدد تھے اور حنفیت سے اختلاف اور تقلید کا انکار کرنے والوں کے شدید مخالف تھے۔ مولانا سیّد نذیر حسین دہلوی ان کے ہم عصر تھے اور بعض مسائلِ فقہی میں وہ سیّد صاحب ممدوح کی سخت مخالفت کرتے تھے۔

مولانا قطب الدین دہلوی کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مولوی فقیر محمد جہلمی حدائق الحنفیہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۷۶ھ میں وہ دہلی میں ان کی زیارت سے تو بہرہ ور ہوئے، لیکن افسوس ہے کہ ان سے استفادے کا موقع نہ ملا۔

ان کو "نواب قطب الدین خاں" کہا جاتا ہے اور ان کا شمار رؤسائے دہلی میں ہوتا تھا، اس لیے کہ اجداد واکابر کا ہمیشہ مغل حکومت سے تعلق رہا اور وہ سلطنتِ مغلیہ میں اچھے خاصے مناصب پر فائز رہے۔ اسی بنا پر آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر

ان کا احترام کرتا اور عزت سے پیش آتا تھا۔ باقی عمال حکومت کے نزدیک بھی انھیں مستحق تکریم سمجھا جاتا تھا۔

مولانا موصوف بے شمار صفات سے متصف تھے۔ ان میں ایک صفت یہ تھی کہ وعظ و تذکیر اور تبلیغِ دین کا انتہائی جذبہ رکھتے تھے اور ہر چوتھے دن باقاعدہ مجلسِ وعظ منعقد کرتے تھے۔

وہ بہت بڑے مصنف، مترجم اور مفسر بھی تھے۔ اُنھوں نے زیادہ کتابیں اور رسالے اُردو میں تصنیف کیے۔ اس طرح اُنھوں نے اُردو زبان کی خدمت بھی کی اور عام لوگوں کے فائدے کے لیے ان میں ضروری مسائل بھی بیان کر دیے۔ ان کی تصنیفات و تراجم میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں جو حدیث و فقہ سے متعلق ہیں۔

۱۔ **جامع التفاسیر**:۔ یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے جو اُردو زبان میں ہے اور دو جلدوں میں ہے۔

۲۔ **مظاہر حق**:۔ یہ مشکوٰۃ کا اُردو ترجمہ ہے جو چار جلدوں میں ہے۔ عام فہم اور شستہ ترجمہ ہے۔

۳۔ **ظفر الجمیل**:۔ یہ اُردو میں حصن حصین کا ترجمہ ہے۔

۴۔ **مظہر جمیل**

۵۔ **مجمع الخیر**،

۶۔ جامع الحسنات (۷) خلاصہ جامع صغیر (۸) ہادی الناظرین (۹) تحفۂ سلطان (۱۰) معدن الجواہر (۱۱) وظیفہ مسنونہ (۱۲) تحفۃ الزوجین (۱۳) احکام الاضحیہ (۱۴) فلاح دارین (۱۵) تنویر الحق (۱۶) توفیر الحق (۱۷) تحفۃ العرب والعجم (۱۸) احکام العیدین (۱۹) رسالۂ مناسک (۲۰) خلاصۃ النصائح (۲۱) گلزار جنت (۲۲) تنبیہ النسا (۲۳) حقیقۃ الایمان (۲۴) زاد المعاد (۲۵) تذکرۃ الصیام (۲۶) تذکرۃ الربا (۲۷) آداب الصالحین (۲۸) طب نبوی۔

وہ کئی مرتبہ حج بیت اللہ کے لیے گئے اور بعض علمائے حجاز سے سندِ حدیث

حاصل کی۔ آخری مرتبہ ۱۲۸۹ھ میں سعادتِ حج سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اسی سال مکہ مکرمہ میں وفات پائی[1]

۲۳۔ سیّد قطب الہدیٰ بریلوی

سیّد قطب الہدیٰ ابن سیّد محمد واضح بن سیّد محمد صابر بن سیّد آیت اللہ بن سیّد علم اللہ حسنی حسینی بریلوی ـــــ ماہرین معقول و منقول میں سے تھے اور اپنے زمانے میں حدیث و فقہ، علوم عربیہ، انشاپردازی اور حسنِ خط میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور علما و فضلا کی گود میں پرورش پائی۔ ابتدا میں اپنے والد سیّد محمد واضح بریلوی سے استفادہ کیا۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں علامہ تفضل حسین کشمیری اور دیگر علما سے حصول علم کیا۔ بعدازاں عازم دہلی ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حدیث و فقہ کی تکمیل کی اور اُن کے کتب خانے کی متعدد بہترین کتابوں کی کتابت کی۔ شاہ عبدالقادر دہلوی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان سے سند لی۔ قرأت بھی انہی سے سیکھی۔ شیخ غلام علی دہلوی سے اخذِ طریقت کیا اور مدت تک اُن سے منسلک رہے اور معارف و لطائف سے بہرۂ وافر حاصل کیا۔ پھر اپنے وطن رائے بریلی آئے اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔

نہایت قوی حافظہ، انتہائی ذہین، متبع کتاب و سُنّت، قامع شرک و بدعت اور شائق کتابت تھے۔ خط انتہائی عمدہ تھا۔

سیّد قطب الہدیٰ نے صحیح بخاری، جامع ترمذی، عین العلم اور سفر السعادہ پر تعلیقات و حواشی تحریر کیے۔ نیز "الجانب الشرقی فی کفر فرعون الغرقی" کے نام سے

---

[1] آثار الصنادید ص ۲۷۶، ۲۷۷ ـــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۹ ـــ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۸ ـــ داستان تاریخ اردو ص ۱۸۱ تا ۱۸۳ ـــ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۸۷، ۳۸۸ ـــ مفید المفتی ص ۱۴۴۔

کفرِ فرعون سے متعلق ایک رسالہ تصنیف کیا ـــــ اس عالم وفقیہ نے صرف بیالیس برس عمر پائی اور ۱۹ ـــــ ربیع الثانی ۱۲۲۶ھ کو انتقال کیا۔[۲]

۲۴ ـــــ مفتی قوام الدین کشمیری

خطۂ کشمیر کے مشاہیر علما وفقہا میں مفتی قوام الدین کا اسمِ گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے :۔ قوام الدین بن سعد الدین بن معز الدین بن امان اللہ ـــــ یہ تمام حضرات اصحابِ علم وفضل تھے اور وادیٔ کشمیر میں عزّت واکرام کے مالک تھے۔ مفتی قوام الدین کی ولادت اس علمی گھرانے میں ۴ ـــــ شعبان ۱۱۵۲ھ کو ہوئی اور کشمیر ہی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ہوش سنبھالا تو حصولِ علم کی طرف متوجہ ہوئے اور شیخ رحمت اللہ، شیخ عبداللہ، ملا مقیم اور اخوند نورالہدیٰ ٹوپی گر کے حلقہائے درس میں شامل ہوئے۔ ذہانت وفطانت کا یہ عالم تھا کہ صغر سنی ہی میں علوم وفنون سے فارغ ہو گئے تھے اور کشمیر کے ممتاز فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔

مفتی صاحب ممدوح نے قرأت وتجوید بھی سیکھی اور اس کے لیے میر قاری تلمیذ شیخ القرا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اجازہ لیا۔ حدیث کی سند شیخ ابوالحسن سندھی مدنی کے تلمیذِ رشید حاجی عبدالولی طرخانی سے حاصل کی۔ نیز حاجی نعمت اللہ توشہوری اور مولانا امان اللہ شہید کے شاگرد محمد محسن پلچپری سے بھی استفادہ کیا۔ یہ وہی مولانا امان اللہ شہید ہیں جو صاحبِ ترجمہ مفتی ممدوح کے پردادا تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سیّد محمد امین اویسی کی خانقاہ میں ہنگامۂ درس جاری کیا اور طویل عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں بے شمار

---

[۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۹ ـــــ نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۳۸۹۔

علما وطلبا نے ان سے کسب علم کیا اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ رفتہ رفتہ کشمیر کی مسندِ قضا ان کے سپرد ہوئی اور شیخ الاسلام کا منصب پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے علاقۂ کشمیر میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا اور افتاء و تدریس کی قلمرو کے تنہا مالک تھے۔ چوبیس سال تک کشمیر کے قاضی اور مفتی رہے اور نہایت عالمانہ اور فقیہانہ اسلوب میں یہ نازک خدمت انجام دی۔

مفتی قوام الدین نے شاہ زین العابدین قادری، میاں زکریا لاہوری، شیخ الاسلام احمد اکملی اور خواجہ عبدالرحیم بیچکیان سے بھی استفاضہ کیا اور مدت تک ان کی صحبت میں رہے۔ ایک کتاب "صحائف سلطانی" ان کی تصنیف ہے جو ساٹھ علوم پر محیط ہے۔ کشمیر کے اس عالم وفقیہ نے ۹ ذیقعدہ ۱۲۱۹ھ کو وفات پائی[۳]۔

---

[۳] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۰ — حدائق الحنفیہ ص ۴۶۳، ۴۶۴ — نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۱۔

ک

۲۵ — مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری

مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری کا مختصر شجرہ نامہ یہ ہے :- کرامت علی بن امام بخش بن جار اللہ بن گل محمد بن محمد دائم صدیقی جون پوری ——— ۱؍ دہ ۷ — محرم ۱۲۱۵ھ (۱۱— جون ۱۸۰۰ء) کو جون پور کے محلہ ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب پینتیس واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ علوم درسیہ کی بعض کتابیں مولانا احمد علی چریا کوٹی سے، بعض مولانا احمد اللہ انامی سے اور بعض مولانا قدرت اللہ ردولوی سے پڑھیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ ان کے اسلاف جون پور کی اسلامی سلطنت کے دور سے وہاں کی جامع مسجد اور عیدین کے منصب امامت وخطابت پر فائز تھے اور اس نواح میں عزت و احترام کے مالک تھے۔ یہ خاندان جون پور کے محلہ ٹولہ میں آباد تھا، اس محلے میں اب بھی اہلِ علم سکونت پذیر ہیں۔

حصولِ علم کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا کرامت علی کا تعلق امیر المومنین سید احمد شہید سے پیدا ہوا، اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سید صاحب نے ان کو دعوت و تبلیغ پر مامور فرمایا۔ اس لیے کہ یہ بہت اچھے واعظ تھے اور نہایت مؤثر تقریر کرتے تھے، ابتدا میں جون پور اور اس کے گرد و نواح میں اشاعتِ دین اور ردِّ بدعات کا فریضہ انجام دیتے رہے، اس کے بعد بنگال چلے گئے اور تمام زندگی دعوت و تبلیغ میں بسر کر دی۔ بنگال کے مسلمان اس زمانے میں بہت سی خلافِ اسلام رسوم میں مبتلا تھے، با پردہ لباس نہ عورتیں پہنتی تھیں نہ مرد ——— ان کے نام بھی ہندوؤں جیسے تھے، مولانا کرامت علی نے ان سے نہایت محبت وتلطف کا سلوک کیا، بہت نرمی اور پیار سے ان کو اپنے قریب کیا اور اس سلسلے میں قریہ قریہ گھومے اور وعظ وتقریر کا سلسلہ جاری

رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ ان سے مانوس ہو گئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے آپ کو شریعت کے رنگ میں رنگ لیا۔ پورے بنگال میں ان کی دعوتِ دین کا غلغلہ بلند ہوا، اور دیہات و قصبات اور بلاد و امصار کے لاکھوں افراد بدعات و رسوم کو ترک کر کے احکامِ اسلام کی پابندی کرنے اور توحیدِ خالص کو ماننے لگے۔

مولانا کرامت علی نے پچاس سال سے زائد عرصے تک خدمتِ دین کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ بنگال میں جگہ جگہ درس گاہیں قائم کیں، مسجدیں تعمیر کرائیں اور مبلغین و علما کی ایک بڑی جماعت ان کی کوششوں سے وہاں پیدا ہو گئی۔ وہ عموماً کشتی پر سفر کرتے اور طلبا و علما ان کے ساتھ رہتے، اثنائے سفر میں درس و تدریس کا کام برابر جاری رہتا۔

بنگال کے لوگ جو ابتدا میں ان سے دُور بھاگتے تھے، ان کی دعوتِ حق کی وجہ سے ان کو انتہائی معزز و محترم قرار دینے لگے، وہ ان کو اپنے لیے اللہ کی بہت بڑی نعمت گردانتے تھے، کیونکہ انھی کی تبلیغِ دین اور ترویجِ اسلام کے باعث انھیں راہِ ہدایت نصیب ہوئی تھی۔

مولانا ممدوح جہاں درس و تدریس، ورع و تقویٰ اور پابندیٔ شرع میں بے مثال تھے، وہاں کثرتِ تصانیف میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے اشاعتِ اسلام، مسائلِ فقہ اور تصوّف و سلوک سے متعلق بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:۔

(۱) مفتاح الجنۃ (۲) زینۃ المصلی (۳) دعواتِ مسنونہ (۴) قرۃ العیون (۵) تزکیۂ نسواں (۶) زاد التقویٰ (۷) راحتِ رُوح (۸) نورٌ علیٰ نور (۹) فیضِ عام (۱۰) تزکیۃ العقائد (۱۱) مراد المریدین (۱۲) قوت الایمان (۱۳) نسیم الحرمین (۱۴) احقاق الحق (۱۵) تنویر القلوب (۱۶) حق الیقین (۱۷) قول الحق (۱۸) مرأۃ الحق (۱۹) رفیق السالکین (۲۰) عکازۃ المؤمنین لبطر المعاندین (۲۱) براہین قطعیہ فی مولد خیر البریہ (۲۲) کرامۃ الحرمین فی ازالۃ شبہۃ الفریقین (۲۳) ملخص القول الامین (۲۴)

اطمینان القلوب (۲۵) ہدایۃ الرافقین (۲۶) برہان الاخوان (۲۷) مخارج الحروف (۲۸) زینۃ القاری (۲۹) شرح جزری اُردو (۳۰) شرح شاطبی (۳۱) ترجمہ اُردو مشکوٰۃ جلد اوّل (۳۲) ترجمہ شمائل ترمذی (۳۳) فتح باب صبیان (۳۴) کوکب دری (۳۵) نور الہدیٰ (۳۶) حجت قاطعہ (۳۷) مکاشفات رحمت (۳۸) دافع الوساوس (۳۹) مصباح الظلام (۴۰) رسالہ بیعت (۴۱) قامع المبتدعین (۴۲) استقامت (۴۳) رد بدعت (۴۴) قوّتِ رُوح (۴۵) سبیل الرشاد (۴۶) القول الثابت (۴۷) رسالہ محمودیہ۔

ان کتب و رسائل کے علاوہ بھی اُنھوں مختلف مسائل کے بارے میں چند چھوٹے بڑے رسالے تحریر کیے۔

وہ بہت اچھے قاری اور تجوید کے ماہر تھے۔ قرآن مجید نہایت خوش الحانی سے پڑھتے۔ قرأت و تجوید انھوں نے اس وقت پڑھی جب وہ حج کے لیے گئے۔ اس ضمن میں سیّد ابراہیم مدنی اور سیّد محمد اسکندرانی کی شاگردی کی۔

صاحب نزہۃ الخواطر سیّد عبدالحیٔ حسنی لکھتے ہیں کہ وہ فقہ و اصول اور قرأت و تجوید کے ماہر تو تھے، لیکن علمِ حدیث سے زیادہ باخبر نہ تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔ وکان قلیل الخبرۃ بالحدیث (یعنی حدیث کا کم علم رکھتے تھے۔)

بہرحال ان کا شمار اکابر فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ بنگال اور ڈھاکہ وغیرہ میں اُن کی تبلیغ سے گھر گھر اسلام پہنچا اور وسیع پیمانے پر دین کی اشاعت ہوئی۔ خط نہایت عمدہ تھا اور خطِ نسخ و نستعلیق اور طغریٰ میں بے مثال تھے۔ ایک دانۂ چاول یا چنے پر پوری سورۂ اخلاص لکھ دیتے تھے۔

سخاوت وجود کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ پاس ہوتا فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتے، انتہائی صاحبِ ہمت اور سیر چشم تھے۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا اصل مرکز بنگال کا علاقہ تھا اور وہیں کے ایک شہر رنگ پور میں انتقال کیا۔ جمعہ کے روز صبح صادق کے

وقت ۳ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ (۳۱ مئی ۱۸۷۳ء) کو وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔[1]

مولانا کرامت علی کے دو بیٹے تھے، ایک مولانا حافظ احمد اور دوسرے مولانا عبدالاول۔ دونوں علم و فضل میں ممتاز تھے۔ ان کے بھتیجے کا نام مولوی محمد محسن تھا، وہ بھی وقت کے جیّد عالم تھے۔

۲۶۔ مولانا کرامت علی اسرائیلی دہلوی

مولانا کرامت علی کے والد گرامی کا نام مولانا حیات علی تھا۔ یہ حضرات "اسرائیلی" کی نسبت سے معروف تھے۔ مسلکاً شافعی تھے اور دہلی کے کبار علما و فقہا میں گردانے جاتے تھے۔ مولد و منشا دہلی ہے۔ اس زمانے میں دہلی کو علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا فضل امام خیرآبادی اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کی مسانِد تدریس آراستہ تھیں۔ مولانا کرامت علی نے وقت کے ان تمام سرچشموں سے رجوع کیا اور اپنی علمی پیاس بجھائی۔ ان کے علاوہ وہ مولانا محمد اسحاق دہلوی سے مستفید ہوئے۔ شاہ رفیع الدین سے علومِ دینیہ کی تحصیل کی۔ مولانا فضل امام خیرآبادی سے منقولات کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا محمد اسماعیل سے کچھ عرصہ حدیث کا درس لیا اور پھر شاہ محمد اسحاق سے سندِ حدیث لی۔ حصولِ علم سے فارغ ہونے کے بعد دہلی میں خود سلسلۂ تدریس شروع کیا اور مدّت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اپنے دور کے ممتاز عالم اور نامور فقیہ تھے۔ استحضارِ مسائل اور فتویٰ نویسی میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ نہایت

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۱، ۱۷۲ ــ تجلی نور ج ۲ ص ۱۳۵، ۱۳۶ ــ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۷۹، ۷۸۰ ــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۴، ۳۹۵ ــ مفید المفتی ص ۱۴۴، ۱۴۵ ــ جماعت مجاہدین ص ۲۹۳

ذہین و فطین بزرگ تھے۔

ایک وقت آیا کہ دہلی میں ان کی معاشی حالت بہت بگڑ گئی اور وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ مجبوراً ترکِ وطن کر کے حیدر آباد (دکن) کو روانہ ہوئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ حیدر آباد اس زمانے میں اہلِ علم کی قدر و منزلت کے لیے مشہور تھا اور وہاں کے حکام و امرا اُن سے بہت تکریم سے پیش آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مقامات کے متعدد ارباب علم اور اصحاب فقہ نے اس کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ مولانا کرامت علی بھی دہلی سے کوچ کر کے مع اہل و عیال کے وہاں پہنچے اور عزت و اکرام کے مستحق قرار پائے۔ حیدر آباد کے عدل و قضا کا محکمہ اُن کے سپرد ہوا، اور اس خدمت کے صلے میں ہزار روپے سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ پورے بیس سال اس منصب پر فائز رہے اور نہایت محنت و دیانت سے یہ خدمت انجام دی۔ یہ اہم منصب اس زمانے میں اسی شخص کو تفویض کیا جاتا تھا جو حدیث و فقہ میں مہارت رکھتا ہو، اور مولانا ممدوح بجا طور پر اس صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔

عربی علوم اور زبان پر عبور کا یہ عالم تھا کہ "السیرۃ الاحمدیہ" کے نام سے عربی میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کی۔ اس عالم کبیر نے ۱۲۷۷ھ کو حیدر آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے[1]۔

۲۷ــــــ مولانا کرم الٰہی لاہوری

بلدۂ لاہور علم و فضل کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا ہے۔ اس میں بے شمار علما پیدا ہوئے، متعدد مشائخ نے اس سرزمین میں جنم لیا، بہت سے محدثین اس کی خاک سے اُبھرے اور چار دانگ عالم میں مشہور ہوئے۔ لاتعداد فقہا نے اس میں مسندِ تدریس بچھائی اور لوگوں کی کثیر تعداد کو فیض پہنچایا۔ لاہور کو یہ شرف بھی حاصل

---

[1] آثار الصنادید ص ۲۹۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۹۵، ۳۹۶۔ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲، ص ۴۱۵۔

ہے کہ اس میں برصغیر کے مختلف بلاد و قصبات سے اہل علم تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ان کے فیض صحبت اور ملازمت و انسلاک سے ایک دنیا مستفید ہوئی۔ علاوہ ازیں یہ سعادت بھی اس شہر کو حاصل ہوئی کہ متعدد بزرگان دین دیگر ممالک سے رخت سفر باندھ کر اس میں وارد ہوئے اور اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے لوگوں کے قلب و ذہن کو منور کرتے رہے۔

تیرھویں صدی ہجری میں جن اصحاب علم اور اصحاب فقہ نے لاہور میں پرورش پائی، ان میں مولانا کرم الہٰی لاہوری کا اسم گرامی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اپنے عہد کے جلیل القدر عالم اور نامور شیخ تھے۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح کے اکابر فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فقہ کے علاوہ صرف و نحو، معانی و بیان، منطق و فلسفہ اور اصول و کلام کے جیّد عالم تھے۔ ان کی تمام زندگی درس و افادہ میں گزری۔ اپنے زمانے میں انھوں نے خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں "حدائق الحنفیہ" کے فاضل مصنف مولوی فقیر محمد جہلمی بھی شامل ہیں۔ مولوی فقیر محمد نے برصغیر کے مختلف مقامات میں متعدد علما سے حصول علم کیا۔ انھوں نے دہلی میں صدر الصدور مفتی صدر الدین خان سے بھی استفادہ کیا اور ان کے "درس میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر قراۃً وسماعاً کتب درسیہ و متداولہ کا عبور کیا۔" اس کے بعد "اواخر ۱۲۷۷ھ میں وہاں سے مراجعت کر کے اپنے وطن مالوفہ میں" آئے لیکن کچھ عرصے کے بعد لاہور چلے گئے، "جہاں فاضل جلیل القدر، فقیہ فرید الدہر مولوی کرم الہٰی صاحب متوفی ۱۲۸۲ھ سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا۔"

بہر حال مولانا کرم الہٰی لاہوری فحول علمائے فقہ میں سے تھے۔ انھوں نے ۱۲۸۲ھ میں انتقال کیا۔[۳]

---

[۳] حدائق الحنفیہ ص ۴۹۵ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۳

۲۸ــــ مولانا کرم اللہ دہلوی

مولانا کرم اللہ دہلوی کے والد کا نام نامی عبد اللہ تھا۔ عبد اللہ دراصل ہندو تھے، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے متاثر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور عبد اللہ نام رکھا گیا۔۔ عبد اللہ کے بیٹے کرم اللہ تھے، جنھوں نے شاہ عبد العزیز، شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین دہلوی (تینوں بھائیوں) سے کسب علم کیا اور مدت تک ان بزرگوں کی صحبت و رفاقت میں رہے، ان سے تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی مکمل تعلیم حاصل کی اور اپنے زمانے کے بلند مرتبت علما میں شمار کیے گئے۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد اس دور کے مشہور روحانی بزرگ شیخ غلام علی دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے سلسلۂ نقشبندیہ میں سلوک وطریقت کی منزلیں طے کیں۔ اس طرح ظاہری اور باطنی علوم میں درجۂ کمال کو پہنچے۔

اس کے بعد ۱۲۴۳ھ میں ارضِ حجاز کو روانہ ہوئے اور حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد سورت گئے اور کچھ عرصہ سورت میں رہے۔ اس اثنا میں بہت سے علما و مشائخ اور عوام و خواص نے ان سے استفاضہ کیا۔ وہاں سے دہلی آئے اور ایک مدت تک دہلی میں اقامت اختیار کی۔ بعد ازاں پھر عازم حرمین ہوئے، لیکن جب سورت پہنچے تو سرطان کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور وہیں رک گئے۔

دہلی کے اس عالم و فقیہ نے ۲۷ــــ شعبان ۱۲۵۲ھ کو مرضِ سرطان سے سورت میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے[۵۴]۔

---

[۵۴] حدائق الحنفیہ ص ۴۷۳، ۴۷۴ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۴۔
تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۲۔

۲۹ ـــــ مولانا کریم اللہ فاروقی

مولانا کریم اللہ کے والد کا اسمِ گرامی لُطف اللہ تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے، نسباً فاروقی اور مسلکاً حنفی تھے ـــ دہلی کے علمائے احناف اور فقہائے عظام میں خاص عزّت و شہرت کے مالک تھے۔ ان کا شمار ان حضرات میں ہوتا تھا جو کثرتِ درس و افادہ میں مشہور تھے۔ وقت کے فحول علما و محدثین سے استفادہ کیا اور علم و فضل کے اُونچے مرتبے کو پہنچے۔ ان کے اساتذہ کرام میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا رشید الدین خاں دہلوی اور مولانا محمد کاظم دہلوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضرات سے تمام علوم مروّجہ و رسمیہ کی تکمیل کی۔

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد سیّد آل احمد مارہروی عرف اچھّے میاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اخذِ طریقت کیا اور ایک عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ بعدازاں دہلی کو مراجعت کی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس اثنا میں ان سے بے شمار علما و مشائخ نے استفادہ و استفاضہ کیا۔

مولانا کریم اللہ بہت سے اوصاف کے حامل تھے۔ عالم و فقیہ، محدث و مدرس، قانع اور عابد و زاہد تھے۔ دنیا اور اہلِ دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور ہر طرف سے منقطع ہو کر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔

دہلی کے اس باعمل عالم و فقیہ نے نوّے سال عمر پا کر ۴ ـــ شوال ۱۲۹۱ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔[۵]

---

[۵] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۲ ـــــ آثار الصنادید ص ۲۷۹ ـــــ نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۳۹۸، ۳۹۹

ل

۳۰ــــــ مولانا لطف علی راجگیری

مولانا لُطف علی بن رجب علی راجگیری، ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر راجگیر کے رہنے والے تھے۔ وقت کے شیخ و عالم اور محدّث و فقیہ تھے۔ نہایت نیک اور باعمل بزرگ تھے۔ ۱۲۴۵ھ یا ۱۲۴۷ھ میں ولادت ہوئی۔ کچھ ہوش سنبھالا تو حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ اس کے لیے متعدد علاقوں اور شہروں کا سفر کیا اور اس دور کے جیّد اساتذہ سے مختلف علوم و فنون حاصل کیے۔ مثلاً مفتی نعمت اللّٰہ لکھنوی، مفتی واجد علی بنارسی، مولانا نور الحسن کاندھلوی، مفتی صدر الدین خاں دہلوی اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے کتبِ درسیہ پڑھیں۔ اس زمانے میں دہلی میں میاں سید نذیر حسین دہلوی کا سلسلۂ درسِ حدیث جاری تھا، مولانا لطف علی مذکورہ سب علماء سے حصولِ علم کے بعد میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور سند و اجازہ سے مفتخر ہوئے۔ اس کے بعد اپنے شہر راجگیر گئے۔ اس وقت وہ پینتیس سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ راجگیر میں اُنھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں اُنھوں نے قرآن مجید بھی حفظ کیا۔

ایک مدّت کے بعد اُنھوں نے پھر تحصیلِ علم کو اپنا مشغلہ ٹھہرایا۔ سہارن پور میں اس وقت مولانا احمد علی سہارن پوری درسِ حدیث دیتے تھے، یہ ان کے ہاں گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے اور علمِ حدیث میں ان سے استفادہ کیا۔ پھر عازمِ مراد آباد ہوئے، وہاں سیّد عالم علی حسینی نگینوی سے اکتسابِ علم کیا۔

اس طرح کئی سال حصولِ علم میں بسر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ عظیم آباد (پٹنہ) گئے اور وہاں سلسلۂ تدریس کا آغاز کیا۔ کافی عرصہ وہاں گزارا۔ پھر حجاز [illegible]

اور حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔ اس عہد میں مدینہ منورہ میں شیخ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی مقیم تھے اور طلبا کو حدیث کا درس دیتے تھے، مولانا لطف علی ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے۔ اس کے بعد ہندوستان واپس آئے اور ٹونک میں اقامت اختیار کی۔ وہاں کی مسندِ تدریس پر فائز ہوئے اور ایک سال کچھ مہینے وہاں مقیم رہے ۔۔۔ وہاں سے چلے اور اثنائے سفر میں بنارس پہنچے تو بیماری نے آگھیرا، اور وہیں وفات پا گئے۔

مولانا لطف علی راجگیری کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ اوائلِ عمر میں منطق و فلسفہ سے زیادہ دلچسپی تھی، ان علوم میں مہارت پیدا ہوئی تو تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد حدیث اور فقہ کو مرکزِ التفات ٹھہرایا اور ان علوم میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ بہت سے علما و طلبا کو حدیث اور فقہ کا درس دیا اور نہایت محنت سے یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔

ان میں بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ علم و فضل کے ساتھ ساتھ حلم، نرمی، متانت، صدق و صلاح اور ظاہر و باطن کی صفائی میں بے نظیر تھے۔ ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا۔ ۱۸ ۔۔۔ شوال ۱۲۹۶ھ کو دورانِ سفر بنارس میں وفات پائی[1]۔

۱۳۱ ۔۔۔ مولانا لطف اللہ لکھنوی

مولانا لطف اللہ بن عبداللہ لکھنوی اپنے علاقے اور عہد کے علامہ، بہت بڑے فاضل اور نامور شیخ تھے۔ اس زمانے کے مشہور علما میں ان کا شمار ہوتا تھا ۔۔۔ اصلاً یوپی کے ایک مقام غازی پور کے نواح میں "زمانیہ" کے رہنے والے تھے۔ مولد و منشا زمانیہ ہی تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصولِ علم کے لیے گھر سے نکلے اور لکھنؤ جا پہنچے۔ پھر وہیں سکونت اختیار کر لی اور لکھنوی کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ زیادہ تر

---

[1] نزہتہ الخواطر، ج ۷، ص ۴۰۱، ۴۰۲۔ بحوالہ تذکرۃ النبلا۔

کتب درسیہ مولوی ولی اللہ لکھنوی سے اور بعض مرزا حسن علی محدّث شافعی سے پڑھیں نہایت ذکی، سریع الادراک اور قوی حافظہ تھے بحث وجدال میں انتہائی تیز تھے۔ مسلکاً حنفی تھے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد لکھنؤ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی۔ بہت سے علما نے اُن سے استفادہ کیا۔ اُنھوں نے مناظرانہ انداز کی کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں :-

۱۔ اوتاد الحدید لمنکر الاجتہاد والتقلید :- یہ کتاب ایک مقدمہ، چار اوتاد اور خاتمے پر محیط ہے۔ اس میں شیخ عبدالحق نیوتنی بنارسی کی تردید کی گئی ہے۔

۲۔ لمعات الثقلین فی اثبات حدیث الاقتداء بالشیخین :- ایک مقدّمہ، ذیل، تین لمعات اور خاتمے پر مشتمل ہے۔

۳۔ صولۃ الاسد علیٰ اعداء التعدد :- یہ ایک رسالہ ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ ایک شہر کے مختلف مقامات میں نماز جمعہ پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ رسالہ اُنھوں نے مولانا محبوب علی سنبھلی کے ایک رسالے "ھدایۃ الجمعۃ" کے جواب میں لکھا، جس میں مولانا محبوب علی نے تحریر کیا تھا کہ ایک شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ پڑھنا چاہیے، مختلف مقامات میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں۔

۴۔ مظہر العجائب :- یہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس میں شیعہ کا رَدّ کیا گیا ہے۔

۵۔ القبقاب :-

۶۔ طعن السنان :-

اس کے علاوہ انھوں نے بعض اور رسائل بھی قلم بند کیے۔

مولانا عبد اللہ لکھنوی نے ماہِ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی[1]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۰۲ : ۳۰۳

۴

۳۲ــــــــ سیّد مجاہد الدین حُسینی بالاپوری

ہندوستان کے علاقہ برار میں جن اصحاب تصوف اور ارباب طریقت فقہا نے جنم لیا، ان میں مولانا سیّد مجاہد الدین بن معصوم حسینی بالاپوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سیّد ممدوح کا شمار مشائخ نقشبندیہ میں ہوتا تھا اور تیرھویں صدی ہجری میں دیارِ ہند کے ممتاز فقیہ اور شیخ تھے۔ بالاپور میں جو علاقہ برار میں واقع ہے، ۱۱۵۸ھ کو پیدا ہوئے اور کچھ ہوش سنبھالا تو مولانا شمس الدین بالاپوری کے حلقہ درس میں شرکت کی۔ مولانا شمس الدین اس علاقے کے نامور عالم تھے۔ مجاہد الدین نے ان سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اورنگ آباد کا رُخ کیا اور سیّد نورالہدیٰ حسینی اورنگ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے باقی کتب درسیہ کی تکمیل کی اور کافی عرصے تک اُن سے منسلک رہے۔ اورنگ آباد ہی کے ایک بزرگ سید نورالہدیٰ حسینی کے والد مکرم سیّد قمر الدین حسینی کا سلسلۂ طریقت جاری تھا، فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس میں شامل ہو گئے اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ عرصے تک اُن سے فیض یاب ہوتے رہے۔

اورنگ آباد میں انھوں نے سیّد نورالہدیٰ اور سیّد قمر الدین دونوں باپ بیٹے سے استفادہ اور استفاضہ کیا۔ سیّد نورالہدیٰ سے علوم رسمیہ کی تعلیم حاصل کی اور سیّد قمر الدین کے حضور تصوّف و طریقت کی منزلیں طے کیں۔ اس کے لیے کئی سال اورنگ آباد میں بسر کیے اور تعلیم و تربیت کے بہت سے مرحلوں کو عبور کیا۔

اس کے بعد اپنے وطن بالاپور واپس آئے اور اپنے والد ماجد سیّد معصوم حسینی بالاپوری سے جو اس دور کے عالم اور صوفی تھے، اخذ طریقت کیا۔ عرصے تک ان کی صحبت میں رہے اور سلوک و طریقت کے بلند مقام پر فائز ہوئے۔ بالاپور ہی میں درس و

افادے کا سلسلہ شروع کیا اور طویل مدّت تک وہاں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس اثنا میں ان سے بہت سے علما وطلبا نے علم حاصل کیا۔

بعد ازاں ۱۲۳۳ھ میں حیدر آباد کو روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو حلقۂ علما اور طبقہ امرا میں نہایت عزّت واحترام کے مستحق گردانے گئے۔ اس زمانے میں حیدر آباد (دکن) کا حکمران سکندر جاہ تھا، اُس نے اُن کی بہت پذیرائی کی اور دو گاؤں بطور جاگیر عطا کیے۔

سیّد مجاہدالدین حسینی بالاپوری بلاشُبہ جیّد عالم، ممتاز صوفی اور نامور فقیہ تھے، اپنے دور اور علاقے میں بڑی شہرت اور عزّت کے مالک تھے۔ جمعرات کے روز ۲۰۔ رجب ۱۲۳۵ھ کو فوت ہوئے۔ بالاپور میں مدفون ہیں[1]۔

۳۳ ـــــ مولانا محبوب علی سنبھلی

ہندوستان کا صوبہ یو پی جو اب "اتر پردیش" کے نام سے موسوم ہے، ہمیشہ علما وفضلا کا مرکز رہا ہے۔ اس کے تمام بلاد وقصبات اور دیہات میں اہلِ علم کی بہت بڑی جماعت مصروفِ تدریس وتصنیف بھی رہی اور تصوّف وطریقت میں بھی اس نے ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ اس میں بے شمار مشائخ پیدا ہوئے جنھوں نے مختلف مقامات پر سجادۂ مشیخت آراستہ کیا اور لاتعداد لوگوں کو رُوحانی فیض پہنچایا۔ مدرسین نے لاکھوں طلبا کو علم کی دولت سے بہرہ مند کیا اور مصنفین نے ہر موضوع سے متعلق کتابیں لکھیں اور تحریر کے ذریعے ہر طبقۂ فکر کے اَن گنت افراد کو مستفید فرمایا۔ یو پی کے علاقوں میں ایک شہر کا نام "سنبھل" ہے، علمی لحاظ سے کسی زمانے میں یہ نہایت زرخیز شہر تھا اور اس کے گرد ونواح میں بہت سے اربابِ فضل سکونت پذیر تھے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر کے ایک عالم مولانا محبوب علی تھے جو حنفی المسلک

---

[1] محبوب ذی المنن، ج ۲ ص ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۰۴، ۴۰۵۔

تھے اور فقہائے احناف میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ سنبھل سے وہ رام پور گئے اور پھر ۱۲۶۰ھ میں لکھنؤ میں وارد ہوئے۔ وہاں چند روز شیخ پیر محمد لکھنوی کے مدرسے میں قیام کیا۔ وعظ و تذکیر ان کا مشغلہ تھا۔ مولانا لطف اللہ لکھنوی (متوفی جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ) ان کے حریف تھے۔ نماز جمعہ کے بارے میں مولانا لطف اللہ کا موقف یہ تھا کہ ایک شہر میں متعدد مقامات پر نماز جمعہ پڑھی جاسکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مولانا محبوب علی سنبھلی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایک شہر میں ایک ہی مقام پر جمعہ ادا کرنا چاہیے، چنانچہ اس موضوع پر ایک رسالہ تصنیف کیا، جس کا نام "ہدایۃ الجمعہ" رکھا۔ اس میں انھوں نے ثابت کیا کہ ایک شہر کے متعدد مقامات میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں، بلکہ تین مقامات میں جمعہ پڑھنا مکروہ ہے اور اس میں کراہت تحریمی لازم آتی ہے۔ مولانا لطف اللہ نے اس کے جواب میں "صولۃ الاسد علیٰ اعداء التعدد" کے نام سے رسالہ تحریر کیا اور اس میں اُنھوں نے مولانا محبوب علی کے نقطۂ نظر کی تردید کی۔

مولانا محبوب علی سنبھلی سخت مزاج عالم تھے۔ اُنھوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تفسیر عزیزی کو بھی ہدف تنقید ٹھہرایا اور "ما اھل لغیر اللہ" کے مسئلے میں شاہ صاحب نے جو انداز اختیار کیا ہے، اس کو غلط قرار دیا۔ وہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی کی مشہور کتاب "تقویۃ الایمان" کے مندرجات کو بھی صحیح نہ سمجھتے تھے۔

مولانا محبوب علی اگرچہ اپنے دَور کے فقیہ اور عالم تھے، تاہم ان کے عہد کے بہت سے فقہا و علما ان کے افکار و خیالات سے نہ صرف متفق نہ تھے بلکہ ان کی تردید کرتے تھے ــــ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا پتا بھی نہیں چل سکا اور ان کی علمی سرگرمیوں کا بھی اس سے زیادہ علم نہیں ہوسکا۔[۲]

۲ے نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۰۷؎

۳۴ ـــــ شیخ محسن ترہٹی

شیخ محسن بن یحییٰ بکری تیمی ترہٹی فُرینی، تیرھویں صدی ہجری کے کبار شیوخ وعلما اور نامور محدثین و فقہا میں سے تھے۔ ترُہٹ کے قریب ایک مقام فُرَینہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم صدر رکن الدین ترہٹی سے حاصل کی۔ پھر شریف عبدالغنی مفتی سارنی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ جواد سلہٹی اور فقیہ محمد بکری کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں شیخ محمد سعید بن واعظ علی عظیم آبادی سے کسب علم کیا۔ ان سب حضرات سے علم نحو اور علوم عربیہ کی تحصیل کی۔ پھر کان پور کا عزم کیا، وہاں شیخ سلامت اللہ صدیقی بدایونی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور تقریباً دو سال ان کی خدمت میں رہے، ان سے صحیح بخاری کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ اس کے بعد مولانا فضل امام خیرآبادی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بعض علوم کی کتابیں پڑھیں۔ پھر مفتی واجد علی بن ابراہیم بن عمر فاروقی بنارسی سے اکتساب علم کیا۔

جب وہ مندرجہ بالا علما سے حصولِ علم کر چکے تو اللہ نے انھیں توفیق حج مرحمت فرمائی اور ارضِ حجاز کو روانہ ہوئے۔ حج بیت اللہ کیا اور مدینہ منورہ کو تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے مشہور محدث و فقیہ شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جو قمری حساب سے ۱۲۷۳ھ میں رُونما ہوا تھا، ترک وطن کر کے مدینہ منورہ میں جا بسے تھے، اور وہاں سلسلۂ درس حدیث جاری کر دیا تھا۔ مدینہ منورہ میں ہندوستان اور دیگر ممالک کے بے شمار علما و طلبا نے ان سے علم حدیث پڑھا اور ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ شیخ محسن ترہٹی بھی ان کی خدمت میں گئے اور اُن سے علم حدیث پڑھا۔

شیخ محسن ترہٹی نے ایک کتاب "الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی"

سپردِ قلم کی۔ یہ رجال کے سلسلے میں حوالے کی کتاب ہے اور نہایت عمدہ اور شان دار کتاب ہے۔ اس کتاب کی تصنیف سے وہ بدھ کے روز، عشا کے وقت ۱۹۔ رجب ۱۲۸۰ھ کو فارغ ہوئے۔ یہ کتاب انھوں نے مدینہ منورہ میں مکمل کی[۳]

۳۵ ــــــ قاضی محمد مغربی

قاضی محمد بن ابو محمد انصاری مغربی اصلاً تلمسان کے رہنے والے تھے، اور مسلکاً مالکی تھے۔ اپنے وطن میں قرآن مجید حفظ کیا اور علم حدیث کی تکمیل کی۔ قرأت بھی وہیں پڑھی۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ گئے، وہاں علم فقہ میں عبور حاصل کیا، پھر عازم ہند ہوئے اور لکھنؤ میں قیام کیا۔ اس عہد میں لکھنؤ میں درسِ نظامیہ کے بانی مولانا نظام الدین انصاری سہالوی کا غلغلۂ درس بلند تھا، اس میں شریک ہوئے اور مولانا ممدوح سے فقہ، اصولِ فقہ، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی کتابیں مکمل کیں۔ پھر دہلی کو روانہ ہوئے اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ دہلی سے نجیب آباد کا عزم کیا اور کافی مدت وہاں سکونت اختیار کیے رکھی۔ نجیب آباد سے مدراس روانہ ہوئے اور وہاں کی مسندِ افتا ان کے سپرد کی گئی۔

قاضی محمد مغربی جلیل القدر عالم، ممتاز فقیہ اور حافظِ حدیث تھے۔ قرأت سبعہ پر عبور رکھتے تھے۔ کتبِ حدیث میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ الفاظ اور معانی نوکِ زبان تھے۔ نہایت ذہین اور عالی دماغ تھے۔ اللہ پر توکل کا یہ حال کہ لوگوں نے ان سے کہا، اپنی اولاد نواب کے حوالے کر دیں۔ فرمایا: واللہ! میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ اپنی اولاد کو صرف اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ: وعلی اللہ فلیتوکل المتوکلون۔

ان کی اولاد علم و فضل اور امارت و ریاست میں بلند مرتبے کو پہنچی اور

---

[۳] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۰۷، ۴۰۸۔

دیارِ ہند میں ان کے خاندان کے افراد نے بڑی عزت حاصل کی۔

ارضِ ہند کے اس مالکی فقیہ و عالم نے ۱۳ ——— محرم ۱۲۰۱ھ کو وفات پائی ہے۔

۳۶ ——— سیّد محمّد سُورتی

ارضِ ہند میں سورت وہ شہر ہے جس کو بے شمار علما و فضلا کے مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جب سے یہ سرزمین اسلام سے آشنا ہوئی ہے سورت اور گجرات وغیرہ میں بہت سے اربابِ فضیلت پیدا ہوئے اور متعدد اصحابِ کمال نے مختلف مقامات سے یہاں آکر سکونت اختیار کی۔ اس بلدۂ علم کے علما میں ایک شخص سیّد محمد بن ابو محمد حسینی تھے جو تیرھویں صدی ہجری میں اس نواح کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ سورت اور اس علاقے کے دیگر مقامات میں نہایت شہرت رکھتے اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

ان کے زمانے میں اُچ کے ایک عالم سیّد محمد بن عبدالرزاق حسینی اُچی، سورت میں سکونت پذیر تھے، سیّد محمد حسینی سورتی نے انھی سے اخذ علم کیا اور اپنے شہر اور علاقے کے مشاہیر علما و فقہا میں گردانے گئے ——— وہ ہندوستان میں انگریزوں کا دور تھا اور انگریزی حکومت کے محکمۂ عدلیہ میں باقاعدہ مفتی مقرر تھے جو عدالتوں میں پیش ہونے والے دینی اور شرعی معاملات میں فتویٰ جاری کرتے تھے اور پھر اُن کے فتوے کی روشنی میں فیصلے صادر ہوتے تھے۔ سورت میں بھی محکمۂ افتا قائم تھا۔ صاحبِ ترجمہ سیّد محمد حسینی چونکہ فقہ اور دیگر علوم میں کامل دسترس رکھتے تھے، اس لیے ان کو افتا کا منصب تفویض کیا گیا، جس پر یہ طویل عرصے تک متعین رہے۔

ہے نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۰۹

افتا کی خدمات کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا، جس میں بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

سورت کے اس جیّد عالم و فقیہ نے غرہ ذلیقعدہ ۱۲۲۸ھ میں وفات پائی۔[۵]

۳۷ — مولانا محمد حیدر آبادی

گزشتہ دور میں حیدر آباد (دکن) کو علما و فقہا کے مرکز اور مشائخ و اتقیا کے مسکن کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کے حکمران اہل علم کی بے حد تعظیم کرتے اور ان کو انتہائی لائق اکرام قرار دیتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے نقل مکانی کر کے بہت سے علما حیدر آباد میں جا آباد ہوئے تھے اور امرائے حیدر آباد ان سے بدرجہ غایت احترام کا برتاؤ کرتے تھے۔ علما کی خاصی بڑی تعداد ایسی تھی جو علاقۂ دکن سے تعلق رکھتی تھی اور وہاں کے حکمران ان کے ساتھ بھی نہایت تکریم سے پیش آتے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے مقامی علما میں مولانا محمد بن عزّت حیدر آبادی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ وہ اپنے عہد کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ اُنھیں ان کے فضل و کمال کی بنا پر ریاست کی طرف سے نواب محی الدولہ محمد یار خاں بہادر کا خطاب ملا تھا۔ وہ دکن کے صدر الصدور اور دولت آصفیہ کے محتسب تھے۔ یہ مناصب ان کی علمی اور فقہی قابلیت کی وجہ سے عطا کیے گئے تھے۔

وہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی اور حاکم دکن کے نزدیک انتہائی عزّت و احترام کے مستحق گردانے گئے۔ امرائے مملکت اور دیگر تمام لوگ ان کی بہت تکریم کرتے تھے۔ علما و مشائخ کے حلقوں میں بھی ان کو نہایت

---

[۵] نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۴۱۱ بحوالۂ حدیقۂ سورت

احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اہلِ علم کی کثیر جماعت ان کے گرد جمع ہوگئی تھی۔ وہ اس درجے سخاوت وجودت کا مظاہرہ کرتے کہ علما و مشائخ کو بڑی بڑی رقوم و صلات سے نوازتے۔

خراجی زمین کے متعدد قطعات ان کے پاس تھے جو ان کی اولاد و احفاد کو بھی منتقل ہوئے۔ علم و عمل، غنا و سخاوت اور مال و دولت میں ان کی طرح ان کی اولاد نے بھی بڑی شہرت پائی۔

مولانا محمد حیدر آبادی نے ۲۷ — ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ کو حیدر آباد (دکن) میں وفات پائی۔[۶]

۳۸ — مولانا محمد تھانوی

مولانا محمد بن احمد اللہ فاروقی تھانوی مشہور علما و فقہا میں سے تھے۔ مولد و منشا تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) ہے۔ پہلے مولانا عبدالرحیم تھانوی اور شیخ قلندر بخش جلال آبادی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے متعدد درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر عازم دہلی ہوئے، وہاں مولانا مملوک علی نانوتوی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے فلسفہ و منطق کی تکمیل کی۔ اس زمانے میں دہلی میں مولانا محمد اسحاق دہلوی کا ہنگامۂ درسِ حدیث زوروں پر تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر علمِ حدیث میں عبور حاصل کیا۔

مولانا محمد تھانوی نہایت ذکی، سریع الادراک، قوی الحفظ اور نرم مزاج و نرم کلام تھے۔ ابتدائے عمر ہی سے اصحابِ تقویٰ اور بزرگانِ دین سے تعلق رکھتے تھے۔ صغر سنی ہی میں سید احمد شہید بریلوی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے تھے۔ جب جوانی کو پہنچے تو شیخ نور محمد جھنجھانوی سے اخذِ طریقت کیا۔

---

[۶] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۲ بحوالہ مہر جہاں تاب

بعدازاں ٹونک گئے اور وہاں کی مسندِ تدریس پر فائز ہوئے، مدّتِ مدید تک وہاں درس وافادہ میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں بہت سے علما وفضلا نے ان سے استفادہ کیا۔ پھر اپنے وطن تھانہ بھون واپس آگئے اور تمام عمر تذکیر و تلقین اور دعوت وارشاد میں صَرف کر دی۔

مولانا ممدوح متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں :۔ دلائل الاذکار فی اثبات الجہر بالاسرار، القسطاس فی اثر ابن عباس، ارشادِ محمّدی، اثباتِ ذکر بالجہر، مکاتیبِ محمّدیہ، المناظر المحمدیہ، تفضیل الختنین، تعلیقات علیٰ شرح عقائد۔

تھانہ بھون کے اس عالم وفقیہ نے ۱۲۹٦ھ میں انتقال کیا اور چھیاسٹھ برس عمر پائی[۷]۔

۳۰۹ — مولانا محمد شاہ جہان پوری

مولانا محمد افغانی شاہ جہان پوری کا اصل نام محمد زمان خان تھا اور انھیں محمد زمان خان شہید کہا جاتا ہے (جیسا کہ آگے بتایا جائے گا) ان کو شہید کر دیا گیا تھا۔ باپ کا نام اکبر تھا۔ ۳ — ذلیقعدہ ۱۲۴۲ھ کو شاہ جہان پور میں پیدا ہوئے اور کچھ بڑے ہوئے تو وہیں کے علما سے حصولِ علم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر کان پور گئے اور وہاں مولانا سلامت اللہ صدیقی بدایونی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتبِ درسیہ پڑھیں۔ بعدازاں حیدرآباد جا کر شیخ کرامت علی دہلوی اسرائیلی سے جو شافعی المسلک عالم تھے، کتبِ حدیث کا درس لیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حیدرآباد (دکن) ہی میں سکونت اختیار کر لی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ وسعتِ علم وفضل کی بنا پر تھوڑے ہی

---

[۷] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۲، ۴۱۳

عرصے میں حیدر آباد اور اس کے گردو نواح میں اُن کی شہرت پھیل گئی۔ والئ دکن نواب ناصرالدولہ تک ان کے فضل و کمال کا شہرہ پہنچا تو اس نے ان کو طلب کیا اور اپنے بیٹے افضل الدولہ کا معلم مقرر کر دیا۔ افضل الدولہ فوت ہو گیا تو اس کے بیٹے محبوب علی خاں کے معلّم بنا دیے گئے۔ اسی اثنا میں سفر حجاز پر روانہ ہوئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ دمشق، شام، بیت المقدس، نجف، طف (کربلا) بغداد اور بعض دیگر اسلامی بلاد و امصار کا سفر کیا۔

نہایت عابد و زاہد، ایثار پیشہ، جواد اور متوکل علی اللہ تھے۔ تمام عمر شادی نہیں کی، تجرد کی زندگی بسر کرتے رہے۔ طلبا کو درس دیتے اور درویشانہ زندگی گزارتے تھے۔ طلبا کے لباس، ان کی سکونت اور اکل و شرب کی خود ہی کفالت کرتے تھے۔ جب طلبا تعلیم سے فارغ ہو جاتے تو امرا و حکام سے سفارش کر کے ان کی ملازمت وغیرہ کا بھی انتظام کرتے۔

متعدد کتابوں کے مصنّف تھے، ان کی تصنیفات میں ایک کتاب خیر المواعظ ہے جو دو جلدوں میں ہے اور حدیث کے موضوع پر ہے۔ ایک بستان الجن اور ایک کتاب الرحلہ ہے۔ ایک اور کتاب ہدیۃ المہدویہ ہے جو فرقہ مہدویہ کے سیّد محمد جون پوری کے متبعین کی تردید میں ہے۔ یہی کتاب ان کی شہادت کا باعث بنی۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو حیدر آباد کے فرقہ مہدویہ کے لوگ مشتعل ہو گئے اور ان کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ ان میں سے ایک آدمی غضب ناک ہو کر آیا اور ان پر حملہ کر کے انھیں قتل کر دیا۔ یہ حادثہ نماز مغرب کے بعد اس وقت پیش آیا جب وہ اپنے معمول کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے، قاتل نے زور سے خنجر مارا، اور اُن کے خون کے چھینٹے قرآن کی اس آیت پر جا گرے:۔ "فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ"، یہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۰۳ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:۔ سو دیکھیے ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔

ان کی شہادت منگل کے روز ۶۔ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کو حیدر آباد (دکن) میں ہوئی اور اپنے مدرسے کے احاطے میں دفن کیے گئے۔[۵۸]

۴۰۔ سیّد محمّد لکھنوی

دیارِ ہند کے تیرھویں صدی ہجری کے شیعہ علما و فقہا میں سیّد محمد بن دلدار علی حسینی نقوی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ وہ اپنے عہد کے علامہ، شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ شیعہ کے مجتہد اور امام تھے۔ ان کے اسلاف نصیر آباد کے رہنے والے تھے اور بعد کو لکھنؤ آ گئے تھے، اس لیے یہ نصیر آبادی بھی کہلائے اور لکھنوی بھی۔!

سیّد محمّد ۱۷۔ صفر ۱۱۹۹ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے والدِ گرامی سیّد دلدار علی کے بڑے بھائی سے حصولِ علم کیا۔ طویل عرصے تک ان کے حلقۂ شاگردی میں رہے اور تقریباً انیس سال کی عمر میں علومِ متعارفہ کی تکمیل سے فارغ ہوتے۔ پھر خود درس و تدریس کی تیاری شروع کی، جس کی اُن کے والد سیّد دلدار علی نے ۱۲۱۸ھ میں اجازت دی۔ مسندِ تدریس پر فائز ہونے کے بعد ان سے ان کے بھائیوں سیّد حسین، سیّد علی اور بہت سے علما نے استفادہ کیا۔

سیّد محمد نقوی لکھنوی اپنے عہد کے علومِ رسمیہ میں مہارت رکھتے تھے اور فقہ و اُصول اور کلام میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اپنے علم و فضل کی بنا پر بادشاہانِ اودھ کے نزدیک بڑی عزوجاہ کے مالک تھے۔ بالخصوص امجد علی شاہ ان کو نہایت لائقِ احترام گردانتا تھا۔ اس نے ان کو سلطان العلما کے لقب سے نوازا اور مملکت اودھ کا منصبِ افتا ان کے سپرد کیا۔ وہ اُن کے گھر جا کر اُن سے ملاقات کرتا، اُن کی صحبت میں بیٹھتا، اُن سے استفادہ کرتا اور نہایت

---

۵۸ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۸ تا ۱۹۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۳، ۴۱۴۔

تواضع اور انکسار سے پیش آتا۔

سیّد محمدؒ نقوی لکھنوی اپنے عہد میں شیعہ کے مجتہد اور امام تھے۔ شیعہ فقہ میں ان کو عبور حاصل تھا اور تمام اہم مسائل کے حل و کشود کے لیے اس دور کے شیعہ حضرات انہی سے رجوع کرتے تھے۔ عوام و خواص شیعہ میں ان کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

بہت سی کتابوں کے مصنّف تھے، جن میں یہ کتابیں شامل ہیں:۔

اصل الاصُول:۔ یہ کتاب سیّد مرتضیٰ اخباری کی تردید میں ہے، جنھوں نے ان کے والد سیّد دلدار علی نقوی کی کتاب اساس الاصول پر نقض وارد کیا۔

سیّد علی طباطبائی کی شرح الصغیر پر تعلیقات۔

ملّا حمد اللہ سندیلوی کی شرح سلم پر تعلیقات۔

الصمصام القاطع:۔ یہ کتاب مذہب اہل سنّت کے ابطال میں اور اس بات کے اثبات میں ہے کہ وہ اہل بیت سے عداوت رکھتے ہیں۔

طعن الرماح:۔ یہ فدک اور قرطاس کی بحث سے متعلق ہے۔

ایک کتاب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تحفہ اثنا عشریہ کی اس بحث کے جواب میں ہے جو انھوں نے مسئلہ امامت کے بارے میں کی ہے۔

الضربۃ الحیدریہ فی رد الشوکۃ العمریہ:۔ یہ کتاب مولانا رشید الدین خان دہلوی کی الشوکۃ العمریہ کے رد میں ہے۔

شہرا لخلافۃ:۔ یہ اس بات کے اثبات میں ہے کہ خلافت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے لیے مثمر تھی۔

العجالۃ النافعہ:۔ یہ علم کلام اور اصُول دین سے متعلق ہے۔

سم الفار:۔ اہل سنّت کے رَدّ میں۔

البرق الخاطف:۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں۔

ایک رسالہ نماز جمعہ سے متعلق ہے۔

عاملی کی زبدۃ الاصول کی شرح :- یہ نامکمل رہی۔

الفوائد النصیریہ :- یہ زکوٰۃ اور خمس وغیرہ کے موضوع سے متعلق ہے۔ یہ کتاب اُنھوں نے محمد علی شاہ کے نام پر موسوم کی جو اس کتاب کی تصنیف کے وقت نصیر الدولہ کے لقب سے ملقب تھا۔

کشف الغطاء :- یہ کتاب ایک شیعہ عالم سید بار علی نصیر آبادی کے رَدّ میں ہے جنھوں نے ان کے والد سید دلدار علی نقوی کی تصنیفات پر اعتراضات وارد کیے تھے۔

گوہر شاہوار :- اس میں قرآن مجید اور اہل بیت کے درمیان مفاضلت ثابت کی گئی ہے۔

السبع المثانی :- قرأت سے متعلق۔

احیاء الاجتہاد :- اصُول فقہ کے موضوع پر۔

ایک کتاب پاؤں پر مسح کے مسئلے سے متعلق ہے۔

اس شیعہ عالم و مجتہد نے ۱۲۸۴ھ کو وفات پائی [۵۹]

۱۴۱ ــــــ مفتی محمّد بردوانی

علاقۂ بنگال میں جن علما و فقہا نے شہرت اور ناموری حاصل کی، ان میں مفتی محمد بن ضیاء الدین بردوانی کا اِسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ یہ فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور سرزمینِ بنگال کے ایک مقام بردوان کے رہنے والے تھے، اسی لیے ان کو محمد راشد بردوانی کہا جاتا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ اور دیگر مدارس میں تعلیم حاصل کی اور علوم و فنون میں ممتاز قرار پائے ــــ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کلکتے کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ میں " مولوی " کے منصب سے سرفراز ہوئے جو

---

[۵۹] نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۵، ۴۱۶ ؎

اس زمانے میں عدلیہ کا ایک اونچا منصب تھا اور جو انہی حضرات کو تفویض کیا جاتا تھا جو فقہ اور دیگر علوم سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ اس کے بعد کلکتہ کے عہدۂ افتا پر فائز ہوئے اور اس میں خوب کامیاب رہے اور اسی لیے مفتی مشہور ہوئے۔

مفتی محمد بردوانی نے ۱۲۲۱ھ میں فقہ کی انتہائی کتاب ہدایہ کے فارسی ترجمے کی تصحیح کے فرائض انجام دیے اور یہ خدمت اُنھوں نے ہندوستان کے وائسرائے سر جارج ہلر و بارلو کے زمانے میں ہندوستان کے چیف جسٹس جان ہربرٹ ہارنگٹن کے حکم سے انجام دی۔ ہدایہ کے جس فارسی ترجمے کی اُنھوں نے تصحیح کی وہ کلکتے کے سابق قاضی القضاۃ غلام یحییٰ خاں بہاری نے کیا تھا۔

بہر حال مفتی محمد بردوانی ارض بنگال کے نامور فقیہ اور معروف عالم تھے۔ اپنے علم و فضل کی بنا پر ملک کے علمائے دین اور انگریز حکمرانوں کے نزدیک بہت عزّت و احترام رکھتے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے اِس فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا[1]۔

۴۲ ــــــ مولانا سیّد محمد غزنوی

مولانا سیّد محمد غزنوی حضرت سیّد عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند تھے! اپنے دور کے شیخ عالم اور محدث تھے۔ ان کے والد گرامی حضرت عبداللہ غزنوی کے حالات "فقہائے پاک و ہند (تیرھویں صدی ہجری) کی دوسری جلد میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس ضمن میں کہیں کہیں سیّد محمد غزنوی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

سیّد عبداللہ غزنوی کو اعلائے کلمۃ الحق اور اشاعتِ توحید و سنّت کی پاداش میں اس زمانے کے والیٔ افغانستان نے اپنے ملک سے نکال کر پشاور کی طرف دھکیل دیا تھا۔ اس وقت خاندان کے جو لوگ ان کے ساتھ تھے، ان میں

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۷

صاحب ترجمہ مولانا سیّد محمد غزنوی بھی شامل تھے۔ اہل حق کا یہ قافلہ مختلف مقامات سے ہوتا ہوا مشرقی پنجاب کے شہر امرت سر میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ اس کے تمام افراد تدین و تقویٰ میں بے مثال تھے۔

مولانا محمد بن عبداللہ غزنوی کا تذکرہ سیّد عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر کی ساتویں جلد میں مولانا شمس الحق ڈیانوی کی قلمی کتاب تذکرۃ النبلاء کے حوالے سے کیا ہے اور ان کے فضل و کمال، اتقا، زہد و عبادت اور تدین و نجابت کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کے ان اوصاف سے وہی شخص انکار کر سکتا ہے، جس کے دل میں ان کے خلاف بغض و کدورت کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہو۔

سیّد محمد غزنوی، افغانستان کے شہر غزنہ کے نواح میں ایک قریہ "صاحب زادگان" میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تربیت کی منزلیں وہیں طے کیں۔ ان کے والد ماجد حضرت عبداللہ غزنوی جو نیکی اور علمی رفعت میں ممتاز تھے، اپنے اس بیٹے سے نہایت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ انھوں نے ان کو مختلف علوم کی درسی کتابیں پڑھائیں۔ اس کے بعد یہ لوگ افغانستان سے ہجرت کر کے وارد ہند ہوئے اور امرت سر کو اپنا مسکن ٹھہرایا تو مولانا محمد غزنوی نے دہلی کا عزم کیا۔ وہاں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کا سلسلۂ درس حدیث جاری تھا، اس میں شامل ہوئے، ان سے علم حدیث پڑھا اور اپنے تمام اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد امرت سر آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

مولانا ممدوح کا شمار اللہ کے برگزیدہ بندوں میں ہوتا ہے، وہ ان حضرات میں سے تھے جو مخالفین کی طرف سے اللہ کی راہ میں تکلیفوں اور اذیتوں میں مبتلا کیے گئے اور احیائے سنّت کے سلسلے میں جنھیں ترکِ وطن کرنا پڑا۔ سیّد عبدالحی حسنی ان کا تذکرہ کرتے ہوئے نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں:-

وھو اکبر ان ینبه علی سبر خله مثلی

کہ ان کی ذاتِ گرامی اِس سے کہیں بلند ہے کہ میرے جیسا کوئی شخص ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کرے۔

اُنھوں نے تفسیر جامع البیان پر حاشیہ لکھا، جس کی علما نے نہایت تحسین کی۔ بلاشبہ مولانا مرحوم تیرھویں صدی ہجری کے مشہور مفسر، محدث اور فقیہ تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ ذیقعدہ ۱۲۹۶ھ کو امرت سر میں فوت ہوئے[۱]۔

۴۳ ـــــ قاضی محمد خاں رام پوری

ہندوستان کے شہر رام پور کے فقہائے احناف میں قاضی محمد خاں بن عرفان رام پوری اپنے عصر اور علاقے کے بہت مشہور اور نامور فقیہ تھے اور ان کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز فضلا اور شیوخ میں ہوتا تھا۔ ان کے والد ملا عرفان خراسان کے باشندے تھے، وہاں سے ہندوستان آئے اور بحر العلوم عبد العلی انصاری فرنگی محلی سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد رام پور میں سکونت اختیار کی اور فقہ و اصول میں کئی عمدہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے بیٹے قاضی محمد خاں کا مولد و منشا رام پور ہے۔ اپنے والد ملا عرفان، مفتی شرف الدین رام پوری، ملا حسن لکھنوی اور بحر العلوم علامہ عبد العلی فرنگی محلی سے علم حاصل کیا۔ حصولِ علم سے فارغ ہوئے تو اپنے شہر رام پور میں مسندِ درس آراستہ کی۔ اس زمانے میں رام پور کو علما و فضلا کے مسکن کی حیثیت حاصل تھی۔ قیام رام پور کے زمانے میں بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

رام پور سے ٹونک گئے اور ٹونک میں اس وقت متعدد اہل علم فروکش تھے۔ وہاں ان سے امیر ٹونک نواب وزیر الدولہ نے علم حاصل کیا، اور بھی کئی لوگ

---

[۱] نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۱۸۰،۴۱۸۰ بحوالہ تذکرہ النبلا۔

مستفید ہوئے۔ نواب وزیر الدولہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر انھیں ٹونک کے محکمۂ قضا پر متعین کیا۔ پھر وہیں اقامت گزیں ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔

ان کے ایک بھائی قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری تھے، وہ بھی فقہ و اصول کے جیّد عالم تھے، لیکن فقہی نوعیت کے اختلافی مسائل میں نہایت متعصب حنفی تھے۔ اس کے برعکس قاضی محمد خاں نرم مزاج تھے۔ اگرچہ مسلکاً یہ بھی حنفی تھے لیکن مسائل کی وضاحت و تبیین میں کسی نوع کے تعصّب کا اظہار نہ کرتے۔ اپنی بات مثبت انداز میں بیان فرماتے۔ خوش مزاج اور بلند اخلاق عالم تھے۔ کسی کا دل دکھانا اور مخاطب کو ذہنی یا قلبی تکلیف پہنچانا ان کی فطرت میں داخل نہ تھا۔

افسوس ہے تیرھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کی ولادت اور وفات کی تاریخ کا علم نہ ہو سکا۔[۱۲]

۴۴ ـــــ مرزا محمد کشمیری

مرزا محمد بن عنایت احمد کشمیری دہلوی، شیعہ عالم تھے۔ اپنے وقت کے شیخ اور فاضل تھے۔ اصلاً کشمیری تھے، ان کے اسلاف میں سے کوئی بزرگ دہلی جا بسے تھے۔ پھر دہلوی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مولد و منشا دہلی ہے۔ عالمِ طفولیت ہی میں حصولِ علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ ان کے زمانے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، دہلی کی مسندِ تدریس پر متمکن تھے، یہ بھی ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ علمِ فقہ کے لیے سیّد رحم علی دہلوی کی خدمت میں گئے، ان سے فقہ کی تمام کتابیں درساً درساً پڑھیں۔ علمِ طب اس دور کے معروف طبیب حکیم شریف دہلوی سے حاصل کیا اور کافی عرصے تک ان سے استفادہ کرتے رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور بہت سے علما و طلبا کو مستفید کیا۔

۱۲ے نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۴۱۸، ۴۱۹

علم کلام اور مجادلہ و مناظرہ میں نہایت تیز تھے اور اس سلسلے میں سب سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ۔ فن طب میں بھی کامل تھے اور علاج کے لیے دُور دراز سے لوگ ان کی خدمت میں آتے تھے ۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے ، بہت سی اہم کتابوں کی تلخیص بھی کی ۔ ان کی تصنیفات و تلخیصات میں یہ کتابیں قابلِ ذکر ہیں ۔

۱ ۔ النزھۃ : اس میں اپنے استاد شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ کے پانچ ابواب کی تردید کی گئی ہے ۔

۲ ۔ عاملی کے رسالہ الوجیزہ کی شرح ۔

۳ ۔ تنبیہ اہل الکمال والانصاف علی اختلال رجال اہل الخلاف : ۔ اس میں کتب صحاح ستہ کے ان رجال کی نشان دہی کی گئی ہے ، جو کذب ، وضع ، ضعف ، خروج ، ناصبیت ، ارجا اور قدریت سے متہم ہیں ۔

۴ ۔ ایک رسالہ تعصبات اہل سنّت کے بارے میں ہے ۔

۵ ۔ سمعانی کی مشہور کتاب "الانساب" کا انتخاب ۔

۶ ۔ علی متقی کی کنز العمال کے اُس حصّے کا انتخاب جو ان کے نزدیک امامت حضرت علی ، امامت اولادِ علی اور صحابہ کے معاملات پر دلالت کناں ہے ۔

۷ ۔ رویت الٰہی سے متعلق ایک رسالہ ۔

۸ ۔ حافظ ابن حجر کی فتح الباری شرح صحیح بخاری کی تلخیص ۔

۹ ۔ قسطلانی کی ارشاد الساری کی تلخیص ۔

۱۰ ۔ تلخیص الجمع بین الصحیحین ، حمیدی ۔

۱۱ ۔ تلخیص جامع الاصول ۔

۱۲ ۔ تلخیص الاستیعاب ، ابن عبد البر ۔

۱۳ ۔ تلخیص حلیۃ الاولیا ، ابو نعیم ۔

۱۴ ۔ تلخیص مسند امام احمد بن حنبل ۔

۱۵ ۔ تلخیص فتاویٰ عالمگیری ۔

۱۶ ۔ تلخیص تاریخ الرسل والملوک، طبری ۔

۱۷ ۔ تلخیص الخمیس فی احوال النفس النفیس ۔

۱۸ ۔ تلخیص شرح المقاصد، تفتازانی ۔

۱۹ ۔ تلخیص الملل والنحل، شہرستانی ۔

۲۰ ۔ تلخیص کتاب السیاسۃ والامامۃ، دینوری ۔

۲۱ ۔ تلخیص شرح المواقف، جرجانی ۔

اس کے علاوہ متعدد تصنیفات و تلخیصات ان کی علمی خدمت میں شامل ہیں۔

بلاشبہ تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں یہ ممتاز شیعہ عالم و فقیہ تھے اور ان کی علمی خدمات کا دائرہ وسیع تھا۔ تصنیف، تلخیص، تدریس، طبابت، خلافیات میں وسعتِ نظر اور جدل و مناظرہ میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی اور ہر میدان میں اپنی مثال آپ تھے۔

ایک روایت کے مطابق اس نامور شیعہ عالم نے ۱۲۳۵ھ کو اور ایک روایت کے مطابق ۱۲۲۵ھ کو وفات پائی۔[۱۳]

۴۵ ـــــ مولانا محمد کشمیری

وادیٔ کشمیر میں تیرھویں صدی ہجری میں جن اصحابِ علم اور اربابِ فقہ نے پورے برِ صغیر میں شہرت حاصل کی اور اپنے علم و فضل کا لوہا منوایا، ان میں مولانا محمد بن محمود بن رحمت اللہ منفی کشمیری خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سید عبدالسلام اندرابی کی اولاد سے تھے اور بعض حلقوں میں محمد اکبر ہادی کے نام سے معروف تھے۔ ۱۱۵۳ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے جدِ امجد رحمت اللہ کشمیری سے اخذِ علم کیا۔

---

۱۳ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۹، ۴۲۰۔

قرأت و تجوید کے لیے اپنے خسر قاری محمد اسحاق کی خدمت میں حاضری دی اور اس موضوع سے متعلق ان سے خوب استفادہ کیا۔ علوم و فنون میں شیخ محمد اشرف کشمیری کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے۔

ان کے آباو اجداد اور خاندان کے تمام افراد اصحابِ علم و فضل تھے اور سب کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے مسندِ تدریس کو زینت بخشی اور بے شمار لوگوں کو فیض پہنچایا۔ کشمیر میں بہت سے علما و فضلا نے جنم لیا اور ہر ایک نے اپنی بساط اور قابلیت کے مطابق تبلیغ اسلام اور ترویج علم کی۔ صاحبِ ترجمہ مولانا محمد کشمیری نے بھی اس ضمن میں بہترین خدمات انجام دیں اور متعدد حضرات نے ان سے اکتسابِ علم اور اخذِ فیض کیا۔

کشمیر کے اس ممتاز عالم و فقیہ نے ۱۷۔ ربیع الاوّل ۱۲۴۳ھ کو وفات پائی۔[۱۴]

۴۶۔ مولانا محمد رفیقی کشمیری

خطۂ کشمیر کے ایک اور عالم و فقیہ مولانا محمد بن مصطفیٰ بن معین الدین رفیقی کشمیری تھے، جن کی کنیت ابوالرضا تھی۔ ۱۱۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور والدہ کے جدِ امجد عبداللہ بسوی اور ماموں علامہ نورالہدیٰ ٹوپی گر سے تحصیل علم کی۔ تفسیر، حدیث اور فقہ میں ماہر کامل تھے۔ علم حدیث اپنے عمِ بزرگوار اور والدِ ماجد سے پڑھا۔ خاندان کے سب لوگ علم و فضل سے بہرہ ور تھے اور معقول و منقول میں عبور رکھتے تھے۔ صاحبِ ترجمہ مولانا محمد رفیقی بھی ان اوصاف سے متصف تھے۔ صوفی مشرب فقیہ اور متبع کتاب و سنّت تھے۔ ان کے خسر مولانا محمد اشرف بھی عالمِ دین اور

---

[۱۴] تاریخ کشمیر ص — نزہتہ الخواطر، ج ۷ ص ۴۲۱

تصوّف و سلوک کے دلدادہ تھے، چنانچہ اُنھوں نے انہی سے اخذِ تصوّف کیا اور تصوّف کی کتاب عوارف المعارف بھی انہی سے پڑھی۔ تصوّف و طریقت کے موضوع پر چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔

ان کا سلسلۂ تدریس بھی جاری تھا، جس سے علاقۂ کشمیر کے متعدد علما و فضلا نے استفادہ کیا۔ ان میں بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ جدل و مناظرے سے کنارہ کش رہتے اور نہایت متانت اور سنجیدگی سے علمی خدمات انجام دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے عوام و خواص ان کا بے حد احترام کرتے اور ان کی خدمات گوناگوں کی توصیف کرتے تھے۔

خطۂ کشمیر کے اس جیّد عالم، نامور فقیہ اور ممتاز صوفی نے چہار شنبہ کے روز ۱۶۔۔۔ جمادی الاخری ۱۲۱۸ھ کو اس دُنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کا سفر کیا۔[۱۵]

۴۷۔۔۔۔ سیّد محمدؒ پھلواروی

ہندوستان کے صوبہ بہار کا شہر پھلواری کئی سو سال سے علم و فضل اور طریقت و سلوک میں مشہور ہے۔ یہ شہر بے شمار علما کا مسکن، متعدد فقہا کا مولد اور بہت سے صوفیا و مشائخ کا مرجع رہا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر میں جن علما و فقہا نے جنم لیا ان میں سیّد محمد بن نعمت اللہ بن مجیب اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی کا اسمِ گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ترتیب کے اعتبار سے یہ اپنے والد کے پانچویں بیٹے تھے۔ ۱۰ صفر۔۔۔ ۱۱۹۸ھ کو پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ گھر میں علم کی نہر جاری تھی اور تصوّف کا زور تھا۔

---

[۱۵] حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۷، ۴۶۸۔۔۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۷۔۔۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۱، ۴۲۲۔

یعنی علوم ظاہری اور باطنی دونوں سے خاندان کے تمام افراد بہرہ ور تھے۔ باپ سیّد نعمت اللہ نے اپنے بیٹے کی خوب تربیت کی اور جیّد اساتذہ سے ان کے حصولِ علم کا اہتمام کیا — اس وقت پھلواری میں شیخ احمدی بن وحید الحق جعفری کا ہنگامۂ درس جاری تھا، ان سے اُنھوں نے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور اپنے والدِ مکرم سے اخذ طریقت کیا اور عرصۂ دراز تک اُن سے فیض حاصل کرتے رہے۔
ان کے والد سیّد نعمت اللہ اپنے دور کے معروف صوفی اور عالم تھے، ان کا حلقۂ فیض بہت وسیع تھا۔ لائق بیٹے نے باپ ہی سے اخذِ فیض کیا اور تمام علوم مرّوجہ اور تصوّف و طریقت میں عالی مرتبے کو پہنچے۔
پھلواری کے اس عالم وفقیہ اور صوفی نے ۳ — ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ کو پھلواری میں وفات پائی اور اپنے بھائی سیّد ابوالحیات پھلواروی کے قریب دفن ہوئے۔[۱۶]

۴۸ — مفتی محمّدی عظیم آبادی

ہندوستان کے شہر پٹنہ کو جو صوبہ بہار کا دارالخلافہ ہے، کسی زمانے میں عظیم آباد کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس شہر سے برِّصغیر کی بے شمار علمی، عملی اور سیاسی یادیں وابستہ ہیں۔ گذشتہ صدی میں اس کی خاک سے بہت سی جلیل القدر شخصیتوں نے جنم لیا اور بے انتہا خدمات انجام دیں۔ عمل کے ہر میدان میں اُنھوں نے اپنے جھنڈے گاڑے اور ہر گوشۂ زندگی میں شہرت کے بامِ عروج کو پہنچے۔ انھی بزرگوں میں ایک بزرگ مفتی محمّدی بن معصوم عظیم آبادی تھے، جو تیرھویں صدی ہجری کے معروف شیخ، بہت بڑے عالم اور ممتاز فقیہ تھے۔ اُنھوں نے اس دور کے مشہور عالم شیخ احمدی بن وحید الحق جعفری پھلواروی کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیا، طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے اور ہر شعبۂ علم میں درجۂ کمال کو

---

[۱۶] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۲۲، بحوالہ شجرہ شیخ بدرالدین۔

کو پہنچے۔ علوم سے فراغت کے بعد مسندِ افتا پر فائز ہوتے اور یہ خدمت حسن و خوبی سے انجام دی۔ اس کے علاوہ درس و افادے کا سلسلہ بھی جاری کیا اور متعدد حضرات نے اِن سے علم حاصل کیا۔

مفتی محمدی عظیم آبادی ۲۷۔ ربیع الاوّل ۱۲۶۹ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے[۱]۔

۴۹ ــــ مولانا محمد آفاق دہلوی

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی کے اخلاف میں تیرھویں صدی ہجری کے بزرگوں میں مولانا محمد آفاق دہلوی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ محمد آفاق بن احسان اللہ بن محمد اظہر بن محمد نقی بن عبدالاحد فاروقی۔ اپنے زمانے کے شیخ، عارف باللہ، عالم، صوفی المشرب فقیہ اور طریقۂ مجددیہ کے امام تھے۔ ۱۱۶۰ھ میں ولادت ہوئی اور شیخ ضیاء اللہ کشمیری سے اخذ طریقت کیا۔ علوم مروّجہ کی تحصیل اس عہد کے جیّد علما سے کی۔ فقیر منش اور متبع سنّت رسول ؐ تھے۔ طبیعت میں مسکنت اور شکستگی کا اس قدر غلبہ تھا کہ خود کو دیوار کے نقش و نگار کی مانند سمجھتے اور فرماتے کہ جس طرح دیوار اور اس کے نقش و نگار کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اسی طرح اس دنیا میں انسان کو بھی پائیداری نصیب نہیں۔ وہ بھی ختم ہونے والا ہے۔ علم کے غرور اور تعلی سے بالکل پاک تھے۔ مسائل فقہ پر کامل عبور تھا۔ بہت سے اکابر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، جن میں مولانا فضل الرحمن محدث مراد آبادی کا نام نامی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اپنے مرشد خواجہ ضیاء اللہ کشمیری کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے اور خلقِ کثیر کو روحانی اور باطنی فیض پہنچایا۔ علماء مشائخ اور عوام و خواص کے

---

[۱] نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۴۲۳ بحوالہ تاریخ الکملا۔

حلقے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔
ایک زمانے میں افغانستان گئے اور وہاں اس درجے مستحق تکریم قرار پائے کہ وہاں کے حکمران زمان شاہ نے ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ کابل اور دوسرے بلاد و قصبات کے بہت سے لوگ ان سے بیعت ہوئے۔
ان صوفی مزاج فقیہ نے بدھ کے روز ۷۔ محرم ۱۲۵۱ھ کو نمازِ مغرب کے بعد اِس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت فرمائی اور جمعرات کو دہلی کے محلہ مغل پورہ میں دفن کیے گئے۔ ۹۱ سال کی عمر پائی[۸۱]

۵۰ — شاہ محمد اسحاق دہلوی

دیارِ ہند کی عظیم المرتبت شخصیتوں میں حضرت مولانا محمد اسحاق دہلوی کا اسم گرامی صفحاتِ تاریخ میں ہمیشہ نقش رہے گا۔ وہ شیخِ وقت، امامِ عصر، عالم اجلّ، محدّثِ عالی قدر اور فقیہِ نامدار تھے۔ زہد و تقویٰ، اتباعِ سنّت اور ورع و عبادت میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے نواسے اور خلیفہ تھے۔ نسباً فاروقی تھے۔ مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ محمد اسحاق بن محمد افضل بن احمد بن محمد بن اسماعیل بن منصور بن احمد بن محمد بن قوام الدین فاروقی دہلوی۔
شاہ عبدالعزیز دہلوی کی دو صاحب زادیاں تھیں۔ ایک مولانا عبدالحی بڑھانوی کے عقد میں آئیں اور ایک مولانا محمد افضل فاروقی دہلوی کے نکاح میں ــــ مولانا محمد افضل کی زوجۂ محترمہ سے صاحب ترجمہ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق ظہور میں آئے جو آگے چل کر علم و عمل اور فضل و کمال میں فریدالدہر قرار پائے۔

---

[۸۱] آثار الصنادید، ص ۲۱۷ ــ تذکرہ اولیائے دہلی ص ۱۳۵ ــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۲۳۔

مولانا محمد اسحاق کی ولادت ۸ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ اور ایک روایت کے مطابق ۸ ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ کو دہلی میں ہوئی۔ نشوونما اور تربیت اپنے جلیل القدر نانا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی نگرانی میں پائی۔ کتب صرف اور کافیہ تک علم نحو کی کتابیں مولانا عبدالحی بڑھانوی سے پڑھیں۔ باقی درسی کتابوں کی تکمیل شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے حلقۂ درس میں کی۔ علم حدیث کے لیے ان دونوں بزرگوں کے علاوہ شاہ عبدالعزیز کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہہ کیا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد حدیث کی سند ان سے لی۔ شاہ عبدالعزیز کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے اس نواسے پر انتہائی شفقت فرماتے اور اسے بیٹے کی حیثیت دیتے تھے۔ کتابوں، مسودوں اور متاعِ علمی کی صورت میں جو کچھ بھی ان کے پاس تھا، نواسے کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر شاہ صاحب کی وفات کے بعد یہی ان کی مسند پر بیٹھے اور شائقین علم حدیث کی کثیر تعداد کو مستفید فرمایا۔ شاہ صاحب نے اپنی زندگی ہی میں ان کو تدریس علم حدیث پر مامور فرما دیا تھا، چنانچہ پورے بیس سال انھوں نے شاہ صاحب کے سامنے اور ان کی نگرانی میں یہ اہم خدمت انجام دی۔

اس محدث جلیل نے ۱۲۴۰ھ میں ارضِ حجاز کا عزم کیا اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ اس زمانے میں مکہ مکرمہ میں شیخ عمر بن عبدالکریم (متوفی ۱۲۴۷ھ) کا سلسلۂ درس حدیث جاری تھا، ان سے ۱۲۴۱ھ میں سندِ حدیث لی۔

بعد ازاں اپنے وطن ہندوستان کو مراجعت فرمائی اور پہلے کی طرح دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مسندِ درس حدیث پر رونق افروز ہوئے۔ حج سے واپسی کے بعد پورے سولہ سال یہ عظیم الشان خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں بے شمار حضرات نے ان سے استفادہ کیا اور حصولِ علم حدیث سے مشرف ہوئے۔ پھر ۱۲۵۸ھ میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد یعقوب اور دیگر افراد خانہ کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ کے لیے رختِ سفر

باندھا اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کرلی۔

اس زمانے میں مغلوں کا آخری حکمران بہادر شاہ ظفر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ اس کی بادشاہت برائے نام تھی، اصل حکومت انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی۔ بہادر شاہ، اس کے امرا و وزرا، دہلی کے علما اور وہاں کے سرکردہ لوگوں نے ان کو ہجرت کرنے سے روکنے کی کوشش کی اور دہلی میں سکونت پذیر رہنے پر زور دیا، لیکن وہ نہیں مانے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان پر عملاً انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور شاہ عبدالعزیز ایک فتوے کے ذریعے اس ملک کو دار الحرب قرار دے چکے تھے۔ پھر شعائر اسلام میں اضمحلال و ضعف واقع ہو چکا تھا، بدعات میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور رسوم کفر نئی نئی شکلوں میں سامنے آرہی تھیں۔ ان حالات میں ان کے لیے اس ملک میں سکونت اختیار کیے رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مع اہل و عیال کے دہلی سے کوچ کیا اور مکہ معظمہ جا کر متوطن ہو گئے۔

مولانا ممدوح علمی اعتبار سے ہندوستان کی آبرو اور فضل و کمال میں اپنی مثال آپ تھے۔ نہایت متبع سنت، انتہائی پرہیزگار، فرشتہ سیرت، بلند اخلاق اور عمدہ کردار تھے۔ قامع بدعت اور داعی سنت نبوی ﷺ تھے۔ زبدۃ المحدثین اور فخر علمائے دین تھے۔ دن رات تدریس حدیث اور عبادت الٰہی میں مصروف رہتے۔ نیکی اور تدین کا یہ عالم تھا کہ شاہ عبدالعزیز نے ان کو اپنا امام جماعت مقرر کر رکھا تھا اور وہ عین سنت کے مطابق نماز پڑھاتے تھے۔

شاہ صاحب اپنے بلند مرتبت بھتیجے مولانا محمد اسماعیل اور عالی قدر نواسے مولانا شاہ محمد اسحاق سے بدرجہ غایت مشفقانہ برتاؤ کرتے اور انھیں دیکھ کر قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرماتے:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ۔[19]

(یعنی سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے [ابراہیم: ۳۹])

---

[19] الحیات بعد الممات ص ۴۶

شاہ صاحب نواسے کے زہد و عبادت پر انتہائی خوش ہوتے اور عالمِ مسرت میں فرمایا کرتے: میری تقریر اسماعیل نے اور تحریر رشید الدین نے لے لی اور تقوی اسحاق کے حصے میں آیا۔[۲۰]

دستِ سخا اس قدر وسیع تھا کہ جو کچھ پاس ہوتا مستحقین اور اہلِ حوائج میں تقسیم فرما دیتے۔ ہندوستان میں بھی یہی حال رہا اور سرزمینِ حجاز میں بھی غربا و مساکین اور بیوہ عورتوں کی امداد فرماتے رہے۔ ہندوستان سے جانے والے حجاج کی ضرورتیں پوری کرتے اور اُن کو اپنے ہاں مہمان ٹھہراتے۔ نہایت متوکل علی اللہ تھے۔ دنیا کے مال و دولت سے کبھی تعلق نہ رکھا۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ قابلِ بیان ہے جو ارواح ثلاثہ میں مرقوم ہے اور وہ یہ ہے:-

تحصیل سکندر آباد میں ایک بہت بڑا گاؤں "حسن پور" تھا۔ کسی زمانے میں یہ گاؤں مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کی ملکیت تھا۔ یہ دونوں بھائی انتہا درجے کے سخی اور فراخ حوصلہ تھے اور اسی وجہ سے اکثر تنگ دست رہتے تھے۔ تنگ دستی کی وجہ سے بعض دفعہ ملول و مغموم بھی ہو جاتے تھے۔ واقعہ کے راوی مولانا مظفر حسین بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ دونوں بھائی نہایت ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہیں۔ سوچا کہ خوشی کی وجہ پوچھوں، لیکن جرأت نہ ہوئی۔ بالآخر مولانا محمد اسحاق سے پوچھ ہی لیا۔ متعجبانہ لہجے میں فرمایا: "تمھیں نہیں معلوم"؟ عرض کیا "نہیں، مجھے کچھ علم نہیں۔" فرمایا "ہمارا گاؤں حسن پور ضبط ہو گیا ہے، یہ خوشی اسی کی ہے۔ جب تک گاؤں ہمارے قبضے میں تھا، اللہ پر پورا توکل نہ تھا، اب صرف اسی پر توکل اور اسی پر بھروسہ ہے۔"[۲۱]

شانِ عزیمت اور توکلِ الٰہی کی یہ بہت بڑی مثال ہے۔ اس مادی دور میں

---

[۲۰] الحیات بعد الممات ص ۴۷

[۲۱] ارواح ثلاثہ ص ۱۲۳

اس قسم کی مثال پیش کرنا ناممکن ہے۔

مولانا کوئی مقرر یا خطیب نہ تھے، لیکن کلمۂ حق کہنے میں انتہائی جری اور پُرجوش تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک انگریز پادری دلّی آیا جو بہت لسّان تھا۔ اُس نے آتے ہی ایک ہنگامہ بپا کر دیا اور دلّی کے علما کو مناظرے کی دعوت دی۔ اس دَور کے جو علما خاندانِ شاہ عبدالعزیزؒ اور مولانا شاہ محمد اسحاقؒ کے مخالف تھے، انھوں نے اس پادری سے کہا کہ مولانا محمد اسحاق کو مناظرے کی دعوت دی جائے۔ مولانا نہ تو مناظرانہ اینچ پیچ جانتے تھے، نہ انھیں بحث و مجادلے کی عادت تھی، نہ زیادہ باتیں کرتے تھے اور پھر زبان میں کچھ لکنت بھی تھی، اس لیے ان کے مخالف علما کا خیال تھا کہ یہ چرب زبان اور لسّان پادری ان کو ضرور مات دے گا اور اس طرح ان کی سُبکی ہو گی۔

پادری نے ان کو دعوتِ مناظرہ دی تو انھوں نے فوراً قبول فرمالی۔ مولانا فریدالدین مرادآبادی، مولانا محمد یعقوب اور نوّاب رشیدالدین خاں نے ان کو مشورہ دیا کہ خود مناظرہ نہ کریں، ہم میں سے کسی کو اپنا نمائندہ یا وکیل مقرر کرلیں جو ان کی طرف سے مناظرہ کرے۔ فرمایا: پادری نے مجھے دعوتِ مناظرہ دی ہے، لہٰذا میں ہی مناظرہ کروں گا، کسی کو وکیل یا نمائندہ بنانے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد مناظرے کی تاریخ اور وقت مقرر ہو گیا اور دِلّی کے لال قلعے میں مناظرہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وقتِ مقررہ پر بے شمار لوگ قلعے میں پہنچ گئے اور مجلسِ مناظرہ منعقد ہوئی۔ پادری صاحب سامنے آئے تو حواس باختہ ہو کر کانپنے لگے۔ اسلام یا مولانا کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکے۔ کچھ دیر یہی صورتِ حال رہی اور پادری صاحب نے کوئی بات نہ کی تو مولانا نے پادری سے فرمایا: "آپ کچھ فرمائیں گے یا میں عرض کروں؟" اُس نے کہا "آپ ہی فرمائیے" مولانا نے اسلام کی حقانیت پر دلائل دیے اور عیسائیت کی تردید فرمائی۔ مولانا کی تقریر ختم ہو گئی، لیکن پادری خاموش رہا۔ نہ اس نے عیسائیت کا دفاع کیا

نہ اسلام کی مخالفت کی اور نہ مولانا کے دلائل کے بارے میں کوئی لفظ زبان سے نکالا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے قوتِ گویائی چھین لی ہے۔ اس کے سکوت سے ان لوگوں کو سخت تکلیف ہوئی جو مولانا کے خلاف تھے اور ان کو شکست دلانے کے خواہاں تھے۔

تقریر ختم کر کے مولانا نے مخالف اور موافق حاضرین کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے با قاعدہ بائبل پڑھی ہے۔ اگر پادری میدانِ مناظرہ میں آتر آتا اور سلسلۂ کلام آگے بڑھتا تو اللہ تعالیٰ اس کے مقابلے میں ضروری میری مدد فرماتا۔ یہ بھی فرمایا کہ "اگر پادری کے مقابلے میں اسحاق کو شکست ہو جاتی" تو کوئی افسوسناک بات نہ تھی، مجھ کو علم کا دعویٰ ہی کب ہے، لیکن اسلام تو سب کا ہے۔ میرا بھی اور میرے مخالفوں کا بھی۔ اگر اس موقعے پر شکست کھا جاتا تو یہ تنہا میری شکست نہ ہوتی بلکہ اسے دلی کے تمام مسلمانوں کی شکست سمجھا جاتا۔" فرمایا "اللہ تعالیٰ اپنے دین کی ضرور مدد فرماتا ہے۔ آج بھی اس نے پادری کے مقابلے میں اسلام کی مدد فرمائی۔ پادری کا خاموش رہنا، اسلام کی مدد ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی[۲۲]۔

مولانا محمد اسحاق کے تلامذہ کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ دہلی میں بھی ان سے بے شمار حضرات نے استفادہ کیا۔ اس زمانے میں ہندوستان اور عرب و عجم کے بہت سے علما و طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیلِ علم حدیث کی۔ قیامِ حجاز کے دور میں بھی ان کا دائرۂ تدریس وسعت پذیر تھا۔ اس میں افریقہ، مصر، عرب، ترکی، ہندوستان اور افغانستان کے علاقوں کے تشنگانِ علم بھی شامل ہوئے اور اُن سے فیض حاصل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ بہر حال علم کا یہ دریا دہلی سے جاری ہوا، اور بحرِ ہند میں جا گرا، پھر اس کی موجیں بحرِ عرب سے

---

[۲۲] ارواح ثلاثہ ص ۱۳۲، ۱۳۳

ہم آغوش ہو کر مکہ معظمہ تک پہنچیں اور چار سال تک صحرائے عرب کو سیراب کرتی رہیں۔
ہند اور عرب کے جو تشنہ لب اس سے سیراب ہوئے، ان کی وسیع فہرست میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔
مولانا محمد یعقوب، مولانا محمد عمر بن محمد اسماعیل شہید دہلوی، الشیخ محمد انصاری، مولانا کرامت علی اسرائیلی، مولانا عبدالخالق دہلوی، مولانا صفت اللہ پانی پتی، مولانا سید نذیر حسین دہلوی، مولانا محمد تھانوی، مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی، مولانا محمد ابراہیم نگرنہسوی، مولانا علی احمد ٹونکی، نواب قطب الدین خاں دہلوی، شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی، مولانا عالم علی مرادآبادی، مفتی عنایت احمد، مولانا محمد حازمی عربی، مولانا سبحان بخش شکارپوری، مولانا عبداللہ سندھی، مولانا مفتی عبدالقیوم بھوپالی، مولانا قاری کرم اللہ دہلوی، حافظ محمد فاضل سورتی، مولانا احمد علی سہارن پوری، قاری عبدالرحمن پانی پتی، مولانا نورالحسن کاندھلوی، حافظ محمد جون پوری دہلوی، مولانا رستم علی خاں دہلوی، مولانا بہاء الدین دکھنی۔
یہ چند بزرگوں کے اسمائے گرامی ہیں، سب کا شمار حدِّ امکان سے باہر ہے۔
ان کے تلامذہ نے بھی آگے چل کر اصحابِ علم کو خوب مستفید فرمایا اور جگہ جگہ درس و تدریس کے حلقے قائم کیے۔ ان میں دو بزرگ وہ ہیں جو مولانا کے صحیح جانشین ہوئے اور جن کے چشمۂ فیض سے لاتعداد حضرات نے اپنی علمی پیاس بجھائی، وہ ہیں مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی — مولانا عبدالغنی تو دہلی سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے، لیکن سید نذیر حسین نے دہلی ہی کو اپنا مسکن قرار دیے رکھا۔ سید صاحب ممدوح نے اس فتوے پر بھی دستخط کیے، جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ کو انگریزوں کے خلاف جہاد قرار دیا گیا تھا، پھر اس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کا حلقۂ درسِ حدیث نہایت وسیع تھا اور ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد حدِ شمار سے باہر ہے۔ عرب و عجم اور ہندوستان کے لاتعداد اہلِ علم نے ان سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔

اسی طرح مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی کے تلامذہ کی تعداد کا تعین کرنا بھی ممکن نہیں۔

مولانا محمد اسحاق دہلوی کے یوں تو تمام شاگرد اپنی اپنی جگہ ایک خاص مقام و مرتبہ رکھتے ہیں، لیکن ان دونوں — مولانا عبدالغنی مجددی اور سید نذیر حسین دہلوی۔ نے جو خدمات انجام دیں، اس میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ ان کو اللہ نے اس درجے شرف عطا فرمایا کہ برصغیر کے تمام اہل علم کا سلسلۂ سند ان کی وساطت سے مولانا محمد اسحاق اور پھر شاہ عبدالعزیز اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک منتہی ہوتا ہے۔

مولانا محمد اسحاق دہلوی کی جلالت۔ علم اور حدیث و فقہ میں ان کی قوت نظر کا یہ عالم تھا کہ ان کے استاد شیخ عمر بن عبدالکریم مکی فرمایا کرتے تھے۔

قد حلت فیہ برکۃ جدہ الشیخ عبد العزیز الدھلوی [۲۳]

(ان میں ان کے نانا شیخ عبدالعزیز محدث دہلوی کی برکت علمی حلول کر گئی ہے)

مکہ مکرمہ کے اس دور کے ممتاز عالم شیخ عبداللہ سراج مکی (متوفی ۱۲۶۴ھ) نے ان کو غسل دیا۔ وہ غسل دیتے ہوئے فرماتے تھے:-

واللہ انہ لو عاش وقرأت علیہ الحدیث طول عمری ما نلت ما نالہ۔ [۲۴]

(بخدا اگر یہ زندہ رہتے اور میں تمام عمر ان سے حدیث پڑھنے میں صرف کر دیتا تو اس مرتبے کو نہ پہنچ سکتا جس کو یہ پہنچ چکے ہیں۔)

ان کی پوری زندگی علم حدیث کی تدریس میں گزری۔ لکھنے کا موقع بہت کم ملا۔ انھوں نے مختلف سوالوں کے جواب میں فقہی نوعیت کے جو فتوے تحریر کیے، ان کے علاوہ ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کا پتا چل سکا ہے۔

۱۔ مائۃ مسائل۔

---

[۲۳] الحیات بعد الممات ص ۴۶

[۲۴] ایضاً

۲ ۔ مسائل اربعین ۔

۳ ۔ تذکرۃ الصوم ۔

مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی نے ستر برس کی عمر پا کر ماہ رجب ۱۲۶۲ھ کو مکہ مکرمہ میں انتقال کیا اور جنت المعلیٰ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر کے قریب دفن کیے گئے۔[۲۵]

۵۱ ـــــ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی

مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی علامۂ دہر، عالم کبیر، فقیہ ذی مرتبت اور محدث دوراں تھے۔ شاہ عبد الغنی کے فرزند، شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے بھتیجے، شاہ ولی اللہ محدث کے پوتے اور شاہ عبد الرحیم کے پرپوتے تھے۔ برِّ صغیر پاک و ہند کی اس وسیع و عریض سرزمین میں علم و فضل، وعظ و ارشاد، تصنیف و تالیف، درس و تدریس، احیائے اسلام، تجدید دین، اصلاح اُمّت اور جہاد فی سبیل اللہ کے جو بلند ترین اوصاف اس عالی قدر خاندان کے لائق احترام ارکان میں پائے جاتے ہیں، اس میں کوئی ان کا مدِ مقابل نہیں ـــ مولانا شاہ محمد اسماعیل نے اپنے اسلاف کے ان اوصاف اور بزرگوں کی اس میراث کی نہ صرف حفاظت کا فریضہ انجام دیا بلکہ اپنے بے پناہ عمل و سعی سے ان کے حسن و زیبائی میں انتہائی اضافہ بھی کیا۔

---

[۲۵] آثار الصنادید ص ۲۷۵ ـــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸ ـــــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۱، ۵۲ ـــــ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۴ ـــ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۴۱۲ ـــــ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ۲۸۰ تا ۲۸۴ و ۳۲۶ تا ۳۲۹ ـــــ تراجم علمائے حدیث ہند ص ـــــ الجد العلوم ج ۳ ص ۲۴۰ ـــ نیز دیکھیے ارواح ثلاثہ اور الحیات بعد الممات۔

مولانا شاہ محمّد اسماعیل کی ولادت صحیح اور مستند روایت کے مطابق ۱۲ — ربیع الاوّل ۱۱۹۳ھ (۲۶ — اپریل ۱۷۷۹) کو دہلی میں ہوئی۔ والدۂ ماجدہ کا نام نامی بی بی فاطمہ تھا، اپنے مرشد امیر المجاہدین سیّد احمد شہید بریلوی سے تقریباً سات سال بڑے تھے۔

تعلیم و تربیت

شاہ اسماعیل نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ۱۶ — رجب ۱۲۰۳ھ (۱۲ — اپریل ۱۷۸۹) کو ان کے والد شاہ عبدالغنی کا انتقال ہوا، اس وقت بیٹے کی عمر صرف دس برس کی تھی۔ تینوں اعمام کرام (شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر) یتیم بچے کو آغوشِ محبّت میں لینے اور اپنے گھر لے جانے کے لیے تیار تھے۔ لیکن رسمی طور پر یہ ذمے داری شاہ عبدالقادر نے اُٹھالی، جن کی اپنی اولاد صرف ایک لڑکی تھی۔ شاہ اسماعیل نے درسی کتابیں انہی سے پڑھیں اور تمام مروجہ علوم میں وہ درجہ حاصل کر لیا جو ان کے عہد میں تعلیم و تدریس کا آخری درجہ سمجھا جاتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز سے حدیث کی سند لی اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں حصول علم سے فارغ ہو گئے۔

سر سیّد احمد خاں نے آثار الصنادید میں ان کا ذکر نہایت عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ وہ ان کی بے پناہ ذہانت و فطانت اور قابلیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تعلیم کے عہد آغاز میں استغنا کا یہ عالم تھا کہ اس بات کا کوئی خیال نہ رہتا تھا کہ سبق کہاں ختم کیا تھا اور اب کہاں سے شروع ہو گا کبھی ایسا ہوتا کہ اصل مقام سے بعد کی عبارت پڑھنا شروع کر دیتے، شاہ عبدالقادر ٹوکتے تو جواب دیتے کہ پچھلی عبارت کا مطلب آسان تھا، اس لیے پڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ شاہ عبدالقادر اس متروکہ حصّے سے کچھ پوچھتے تو جواب میں ایسی تقریر فرماتے کہ سب لوگ حیران رہ جاتے کبھی اصل مقام سے پیشتر سبق کا آغاز کر دیتے، شاہ عبدالقادر متنبہ فرماتے تو اسماعیل ایسے شبہات وارد کرتے کہ فاضل استاد کو

بھی جواب میں خاص توجہ مبذول کرنا پڑتی۔

دلّی کے تمام علمی حلقوں میں ان کی غیر معمولی ذکاوت اور انتہا درجے کی ذہانت کی شہرت تھی۔ فارغ التحصیل ہوئے تو لوگ امتحان کے طور پر بر سرِ راہ روک کر مشکل سوالات شروع کر دیتے۔ سوال کرنے والوں کا یہ خیال ہوتا کہ کتاب ان کے پاس نہیں ہے، لہٰذا اطمینان بخش جواب نہ دے سکیں گے۔ لیکن شاہ شہید بے توقف جواب میں تقریر شروع کر دیتے اور مسئلے کی ایسی تشریح فرماتے کہ پوچھنے والے حیران ہو ہو جاتے بلکہ اکثر اوقات اپنی جرأتِ سوال پر ندامت محسوس کرتے[۲۶]

بلاشبہ وہ متبحر عالم اور انتہائی ذکی و ذہین تھے۔ تیس ہزار حدیثیں انھیں زبانی یاد تھیں[۲۷]

سیّد احمد شہید کی بیعت

حصولِ علم سے فراغت کے بعد شاہ اسمٰعیل شہید کی فضیلتِ علمی، ذہانت و ذکاوت اور قابلیت کی شہرت ہر حلقے میں پہنچ گئی تھی، لیکن ابھی کوئی مستقل کام شروع نہیں کیا تھا اور طبیعت میں کچھ بے پروائی سی پائی جاتی تھی۔ یا تو اس کی یہ وجہ ہوگی کہ خاندان میں جو مشاغل رواج پذیر تھے، ان کے نزدیک وہ اصل مقاصد تک پہنچنے کے لیے کافی نہ تھے اور وہ کوئی نیا قدم اُٹھانا چاہتے تھے۔ یا پھر وہ اپنے دل میں ایک لائحہ عمل مرتب کر چکے تھے اور اس کا آغاز کرنے کے لیے رفقا و معاونین کی تلاش میں تھے۔ کئی سال اسی حالت میں گزر گئے۔ اس اثنا میں اگرچہ انھوں نے اپنے اسلاف کے طریق کار کے مطابق تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور کئی اہم شخصیتوں نے ان سے علم حاصل کیا، لیکن یہ کام ان کے کامل اطمینانِ قلب کا باعث نہ تھا۔

۲۶؎ آثار الصنادید ص ۲۷۱، ۲۷۲

۲۷؎ مقدمہ بر تقویۃ الایمان از غلام رسول مہر، ص ۹

ایک عرصے تک یہی حالت رہی، تا آنکہ ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۹ء) میں امیر المجاہدین سید احمد بریلوی نواب امیر خاں والئ ٹونک کی رفاقت و ملازمت ترک کرکے راجپوتانہ سے دہلی پہنچے اور اکبر آبادی مسجد میں اقامت گزیں ہوئے۔ وہ بہت ہی متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ جوں ہی انھوں نے دہلی میں قدم رکھا، لوگوں نے اُن کے حلقۂ بیعت میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ پہلے مولانا محمد یوسف پھلتی، پھر شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحی بُرھانوی اور بعد ازاں شاہ اسماعیل نے ان سے بیعت کی۔ اس وقت سے ان کی زندگی کا دھارا بالکل بدل گیا اور ان کے شب و روز پہلے سے کہیں زیادہ لوگوں کی دعوت و ارشاد میں بسر ہونے لگے۔ سہ شنبہ اور جمعہ کو بالالتزام شاہی مسجد میں وعظ فرماتے۔ سرسیّد رقم طراز ہیں کہ نماز جمعہ کے لیے لوگ اس کثرت سے آنے لگے جیسے عیدین کی نمازوں میں آتے تھے۔ سامعین کا شمار نہ ہوتا تھا، وعظ کا طریقہ ایسا تھا کہ جو کچھ فرماتے دلوں میں پیوست ہو جاتا، اگر کسی بات پر کوئی خلش پیدا بھی ہوتی تو آگے چل کر بالکل رفع ہو جاتی۔ احیائے سنّت اور ردِّ شرک و بدعت ان کے وعظوں کا خاص موضوع ہوتا۔[۲۸]

یہی وہ زمانہ تھا جب اُنھوں نے احیائے دین کا سلسلہ پوری سرگرمی سے شروع کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کی تجدیدی تگ و تاز کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام بلاشبہ ہر رنگ میں جامع اور کامل ہے۔

"بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود رہا، اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مردِ میدان کا منتظر تھا اور معلوم ہے کہ توفیقِ الٰہی نے یہ معاملہ صرف

---

[۲۸] آثار الصنادید ص ۲۷۳

علامہ وحید و شہید رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا، خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔ ؎

می خواست رست خیز ز عالم بر آورد
آں باغباں کہ تربیت ایں نہال کرد

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انہی کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔ حضرت پیر انصاری کا قول یاد ہے "من مرید خرقانی ام، لیکن اگر خرقانی دریں وقت می بود باوجود پیریش مریدیٔ من می کرد" شاہ صاحب نے مزاجِ وقت کے عدم تحمل و استعداد سے مجبور ہو کر بحکم

برمز نکتہ ادا می کنم کہ خلوتیاں
سر سبو بکشادند و در فرو بستند

دعوت و اصلاحِ اُمّت کے جو بھید پُرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیے گئے تھے، اب اس سلطانِ وقت اور سکندر عزم کی بدولت شاہ جہان آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پران کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑے بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب بر سر بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھیں اور خونِ شہادت کے چھینٹے حرف و حکایت کے نقوش و سواد کو صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا؟ یا حق پر چلنے والے اور حق کا درد رکھنے والے معدوم ہو گئے تھے؟ کون ہے جو ایسا کہہ سکتا ہے؟ خود ہی اس خاندانِ عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذۂ علم و عمل موجود تھے۔ حضرت شاہ عبد العزیز کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبد القادر اور

شاہ رفیع الدین علم وعمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضانِ علم کام نہ کر رہا ہو۔ بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لیے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ سب دوسرے دوسرے کاموں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا۔ لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر چست آیا۔ دنیا اس کے لیے خلعتِ عظمت اور شرفِ قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ اُمیدواروں پر اُمیدوار یکے بعد دیگرے گزرتے رہے مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا۔"[29]

یعنی مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کے سوا اس دَور میں کوئی دوسرا راہِ جہاد اور جادۂ شہادت کی طرف قدم نہ بڑھا سکا۔

سفرِ حج

شوال ۱۲۳۶ھ جولائی ۱۸۲۱ء) میں امیر المجاہدین سیّد احمد بریلوی نے حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ اس زمانے میں سمندر کے سفر میں خطرۂ ہلاکت کی وجہ سے بعض علمائے فرضیتِ حج کے سقوط کا فتویٰ جاری کر دیا تھا، بلکہ کچھ ایسے اصحابِ علم بھی تھے جو یہاں تک فرمانے لگے تھے کہ :- ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کی رُو سے عازمِ حج ہونا (معاذ اللہ) معصیت ہے۔ یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا، جس کی روک تھام کی ایک صورت تو یہ تھی کہ تحریر وتقریر کے ذریعے اس کی تردید کی جائے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، سیّد احمد شہید بریلوی، مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی، مولانا عبدالحی بڑھانوی اور دیگر علمائے حق نے نہایت حسن وخوبی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ایک عملی اقدام کیا جائے اور پورے ملک میں ادائے حج کے لیے لوگوں کو تیار کیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد اسماعیل، مولانا

---

[29] تذکرہ ص ۲۹۹، ۳۰۰

عبدالحئی، سید احمد بریلوی اور ان کے رفقائے نامدار نے اس کے لیے ایک زوردار مہم شروع کی اور ساڑھے سات سو مسلمانوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ حج بیت اللہ کا قصد کیا۔ اس قافلے میں مولانا محمد اسماعیل کی والدۂ مکرمہ اور ہمشیرہ محترمہ بھی شامل تھیں۔ دس جہاز کرائے پر لیے گئے اور ہر جہاز کی جماعت کے لیے ایک امیر مقرر کیا گیا۔ ایک جہاز کی جماعت کے امیر خود مولانا اسماعیل تھے۔ یہ قافلہ کلکتے سے روانہ ہوا، اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد شعبان ۱۲۳۹ھ (اپریل ۱۸۲۴ء) کو ہندوستان واپس لوٹا۔

دعوتِ جہاد

حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد مولانا شہید نے اپنے مرشد سید احمد شہید کے تیار کردہ منصوبے کے مطابق اپنے آپ کو دعوتِ جہاد کے لیے وقف کر دیا اور وعظ و تبلیغ میں لوگوں کو جہاد کے لیے کمربستہ ہونے کی تلقین فرمانے لگے۔ اس ضمن میں سرسید لکھتے ہیں:-

بموجب ارشاد سید اصفیا یعنی پیر طریق ہدیٰ اس طرح سے تقریر وعظ کی بنا ڈالی کہ مسائلِ جہاد فی سبیل اللہ بیشتر بیان ہوتے اور یہاں تک آپ کی صیقل تقریر سے مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفا و مجلا ہو گیا اور وہ اس طرح سے راہِ حق میں سرگرم ہوئے کہ ہر شخص بے اختیار چاہنے لگا، سر اس کا راہِ حق میں فدا اور جان اُس کی اعلاءِ لوائے دین محمدی میں صرف ہو۔[۳۰]

مطلب یہ کہ ان کی تقریر کا موضوع اور وعظ کا مقصد فقط یہ ہوتا کہ مسلمان اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے میدانِ عمل میں نکل آئیں اور جو غیر ملکی طاقت ان پر مسلط ہو گئی ہے، اس کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا اور ہر جگہ مختلف پیرائے سے یہ بات بیان فرمائی۔

۳۰؎ آثار الصنادید ص ۲۷۴۔

ہجرت

تقریباً پونے دو سال اُنھوں نے لوگوں کو دعوتِ جہاد دی اور ملک کے تمام اہم مقامات پر اپنا نقطۂ نظر شریعت کی روشنی میں وضاحت سے بیان کیا۔ جب مختلف شہروں اور قصبوں میں مجاہدین کی جماعتیں قائم ہوگئیں تو کامل سوچ بچار کے بعد سرحد کے علاقے سے آغازِ جہاد کا فیصلہ کیا گیا، کیونکہ اس زمانے میں پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہی تھی۔

اس بُنیادی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اُنھوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے سرحد کے آزاد علاقے میں قیام کرنے کا عزم فرمایا۔ چنانچہ وہ ۷۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ (۱۷۔ جنوری ۱۸۲۶) کو سیّد احمد بریلوی کی معیت میں جہاد کی غرض سے مہاجر ہو کر علاقۂ سرحد کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت صرف چھ سو کے قریب آدمی اُن کے ہمراہ تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ مرکز میں پہنچ کر حالات کا پورا جائزہ لیا جائے گا اور پھر مناسب موقع پر مجاہدین کی باقی جماعتوں کو بھی ہندوستان کے مختلف مقامات سے بُلا لیا جائے گا۔ اس سلسلے کے تمام تنظیمی اور تبلیغی معاملات مولانا محمد اسماعیل ممدوح کے سپُرد تھے۔

مجاہدین و مہاجرین کا یہ قافلہ جو کم و بیش چھ سو افراد پر مشتمل تھا، رائے بریلی سے روانہ ہوا، اور بندھیل کھنڈ، گوالیار، ٹونک، اجمیر، صحرائے مارواڑ، عمر کوٹ، حیدر آباد (سندھ) شکارپور، کوئٹہ، قندھار، غزنی اور کابل ہوتا ہوا پشاور پہنچا۔ یہ تقریباً تین ہزار میل کا سفر تھا، جس میں تپتے ہوئے صحرا بھی تھے، جہاں میلوں تک پانی کا ایک قطرہ نہ ملتا تھا۔ بڑے بڑے دریا بھی تھے، دشوار گزار پہاڑ اور برفستان بھی تھے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں نے دس مہینوں میں یہ مسافت طے کی۔

جہاد فی سبیل اللہ

اس کاروانِ حق نے ۲۰ — جمادی الاولی ۱۲۴۲ھ (۲۰ — دسمبر ۱۸۲۶ء) کو جہاد بالسیف کی طرح ڈالی۔ آغاز جہاد میں جو خدمات مولانا محمد اسماعیل نے انجام دیں، ان کی نہایت مختصر کیفیت مندرجہ ذیل ہے:۔

۱۔ باشندگانِ سرحد نے سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر امارتِ جہاد کی بیعت انہی کی سعی و کوشش سے کی۔

۲۔ جہاد سے متعلق سرحد کے علما و اکابر سے جتنی دفعہ بھی گفتگو ہوئی مولانا شہید نے کی اور اس ضمن میں انھوں نے جو علمی، دینی اور سیاسی وضاحتیں طلب کیں، ان سب کا جواب مولانا نے ہی دیا۔

۳۔ ضلع ہزارہ میں تنظیم جہاد انہی کی تگ و دو سے ہوئی۔

۴۔ جنگ شنکیاری میں صرف دس گیارہ مجاہد ان کے ساتھ تھے، لیکن انھوں نے اس درجے بہادری اور استقامت کا ثبوت دیا کہ سکھوں کے ایک بڑے لشکر کو شکست دی۔ اس جنگ میں مولانا کی قبا دشمن کی گولیوں سے چھلنی ہوگئی اور ایک انگلی پر گولی کا زخم لگا۔ بعد میں اس زخمی انگلی کی طرف اشارہ کرکے مزاحاً کہا کرتے تھے کہ یہ ہماری انگشتِ شہادت ہے۔

۵۔ سرحد میں انہی کی کوششوں سے اقامتِ شریعت کی بیعت لی گئی اور وہاں کے باشندے پہلی مرتبہ صحیح شرعی حکومت کی برکتوں سے فیض یاب ہوئے۔

۶۔ امب، مردان، عشرہ اور مایار کی لڑائیوں میں جو فتوحات حاصل ہوئیں وہ انہی کی جرأت و بہادری کا نتیجہ تھا۔

۷۔ پشاور کی فتح کے بعد سلطان محمد خاں بارک زئی سے گفتگو کے لیے سید صاحب نے انہی کو نامزد فرمایا تھا۔

مولانا محمد اسماعیل نہایت ذکی، انتہائی ذہین اور بے حد معاملہ فہم تھے۔

نواب محمد صدیق حسن خان فرماتے ہیں :-

جوہرِ ذکائے او بہ غایت عالی افتادہ بود..... حکایاتِ ذہانت وفطانت وے ہنوز نقل ہر مجلس و زیب ہر محفلِ اہلِ علم است[۱۳۱]

ان کی ذکاوت کا جوہر بہت بلند تھا....... ان کی ذہانت و فطانت کی تیزی کے قصّے اب تک اہلِ علم کی ہر مجلس کے لیے باعثِ زینت سمجھے جاتے ہیں۔

سیرت و کردار

مولانا شہید بہت بڑے عالم، معقول و منقول کے ماہر، فروع و اصول کے امام اور ہر فن میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ زندگی کا ہر لمحہ اعلائے کلمۃ اللہ، احیائے سنّتِ رسول ؐ، جہاد فی سبیل اللہ اور ہدایت خلق اللہ میں گزرا۔ نہایت جری اور شجاع تھے۔ وعظ و تقریر میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، واضح اور مدلل گفتگو کرتے، اللہ کے سوا کسی کا ڈر اور خوف ان کے دل میں نہ تھا۔ خطرناک سے خطرناک مواقع پر بلا جھجک تنہا جا کھڑے ہوتے۔ دُبلے پتلے اور لاغر اندام تھے، مگر عزیمت و استقامت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ایک تجربہ کار جرنیل کی طرح جنگ کی منصوبہ بندی کرتے اور دشمن کے ہر وار کا کامیابی سے دفاع کرتے۔ سادہ مزاج اور سادہ معیشت تھے۔ کھانے پینے اور لباس میں کسی قسم کا تکلّف نہ تھا۔ ملنسار، بلند کردار اور ہمدرد و خلاق تھے۔ فنِ مناظرہ کے ماہر تھے۔ خالص علمی اور تحقیقی انداز میں گفتگو کرتے اور ہر اعتراض کا مسکت جواب دیتے۔

تصانیف

شاہ اسماعیل جہاں بہت بڑے عالم و مجاہد اور واعظ و مبلّغ تھے، وہاں بہترین مصنّف بھی تھے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :-

۱- ردالاشراک :- (عربی) یہ ان کا ایک رسالہ ہے جو عربی زبان میں ہے۔

---

[۱۳۱] اتحاف النبلاء، ص ۴۱۶

اس میں شرک کی باریک سے باریک اقسام بیان کی گئی ہیں اور غیر شرعی رسوم عوائد کی تردید فرمائی گئی ہے۔ ہر جگہ آیاتِ قرآن اور احادیثِ نبوی سے استدلال کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ یہ رسالہ الگ سے شائع ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ نواب سیّد محمد صدیق حسن خاں نے الادراك لتخریج احادیث رد الاشراک کے نام سے شائع کیا تھا۔ شروع میں نواب صاحب کا رسالہ تطف الثمر فی بیان عقیدة اھل الاثر ہے۔

۲۔ تقویۃ الایمان (اُردو) شاہ اسماعیل دہلوی کی یہ بہت ہی مشہور کتاب ہے اور اُردو زبان میں ہے۔ بے شمار مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کی مجموعی تعداد اشاعت پچاس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اُردو زبان کی کوئی کتاب اتنی زیادہ تعداد میں شائع نہیں ہوئی۔ یہ اس کی مقبولیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ سب سے زیادہ ہدفِ اعتراض بھی یہی کتاب بنی اور اس کے رَدّ میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ شاہ اسماعیل پر کفر کے فتوے بھی اسی کتاب کی وجہ سے لگائے گئے۔ بعض لوگوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ جس گھر میں یہ کتاب ہو اس میں فرشتے نہیں آتے۔[۳۲]

تقویۃ الایمان درحقیقت شاہ اسمٰعیل شہید کی عربی کتاب "رد الاشراک" کے پہلے حصے کا ترجمہ ہے جو خود انہی نے کیا تھا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے جو میر شہامت علی نے کیا تھا۔

تقویۃ الایمان آج سے کم و بیش پونے دوسو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس زمانے میں نثری اُردو بالکل ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ نہ اس کے قواعد و ضوابط مرتب ہوئے تھے اور نہ کوئی گرامر معرض وجود میں آئی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو ادب کے اعتبار سے اپنے دَور کا یہ ایک شاہ کار ہے۔ سلاست اور روانی

۳۲؎ حیات اسمٰعیل شہید، ص ۱۷۹۔

درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔ اُردو کے بعض ادیبوں نے اس کو عمدہ ترین ادبی کتاب قرار دیا ہے۔ اس کی زبان قلعۂ معلیٰ کی زبان ہے۔ اس زمانے کے ہندوستان بالخصوص دہلی کی تمام مروّجہ رسوم اس میں بیان کی گئی ہیں اور اس عہد کے مسلمانوں کے عقائد و افکار کی وضاحت کی گئی ہے۔ اُردو کی یہ واحد کتاب ہے جس میں دو پونے دو سو سال کی ہندی رسوم و عوائد کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس دور کے دہلی کی تہذیب و ثقافت کے مختلف گوشوں کو معرضِ تحریر میں لایا گیا ہے۔ اُردو کی خدمت بھی سب سے زیادہ اسی کتاب کی وجہ سے ہوئی کیونکہ اس کی تائید اور تردید میں تمام کتابیں اردو میں لکھی گئیں جو لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئیں اور لوگوں نے دلچسپی سے پڑھیں۔

۳۔ تذکیر الاخوان :۔ (اُردو) یہ شاہ شہید کی عربی تصنیف "ردّ الاشراک" کے دوسرے حصّے کا ترجمہ ہے جو مولانا سلطان محمد خاں نے کیا۔

۴۔ منصبِ امامت :۔ (فارسی) یہ نہایت بلند پایہ اور انتہائی عمدہ کتاب ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۵۔ تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین :۔ (عربی) اس میں شاہ صاحب نے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی وہ احادیث جمع کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں رفع یدین کرنا سنّت ہے۔

۶۔ صراط مستقیم :۔ (فارسی) یہ کتاب سیّد احمد شہید بریلوی کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہید نے صرف اس کی ترتیب و تدوین میں حصّہ لیا۔ مولانا عبدالحی بڑھانوی اس کی تدوین میں شریک تھے۔ اس کے چار باب ہیں۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

۷۔ العبقات :۔ (عربی) یہ کتاب تصوّف کے موضوع پر ہے اور بڑی ادق اور مشکل کتاب ہے۔ ان کی دوسری تصانیف کی طرح اس میں تصوّف کے علاوہ بعض دیگر موضوعات بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ اس کا اُردو ترجمہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے کیا تھا جو حیدر آباد (دکن) سے چھپ چکا ہے۔ ترجمہ بھی بہت مشکل ہے۔

۸ - ایضاح الحق الصریح فی احکام المیّت والضریح :- (فارسی) شاہ صاحب کی یہ نہایت معرکۃ الآرا تصنیف ہے ۔ بدعت کیا ہے اور سنّت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے، اس موضوع میں یہ منفرد کتاب ہے ۔ اُردو ترجمے کے ساتھ یہ کتاب دو یا تین مرتبہ چھپ چکی ہے ۔

۹ - رسالہ درعلم منطق :- (فارسی) سرسیّد نے "آثار الصنادید" میں شاہ صاحب کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے جو علم منطق سے متعلق ہے ۔ یہ رسالہ اپنے موضوع میں نہایت عالمانہ ہے ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس علم پر بھی انھیں عبور حاصل تھا اور وہ انتہائی قابلیت اور فراست و فطانت کے مالک تھے ۔

۱۰ - اصول فقہ :- (عربی) مسائل فقہ سے متعلق یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے ۔ اس میں ضمناً حدیث متواترہ اور تقلید و اجتہاد کے بارے میں بھی گفتگو کی گئی ہے ۔ اپنے موضوع کا یہ ایک بہترین رسالہ ہے ۔ پہلی مرتبہ ۱۸۹۵ء میں مجتبائی پریس دہلی سے اشاعت پذیر ہوا ۔ دائرۃ المعارف لاہور نے بھی اُسے شائع کیا ۔

۱۱ - یک روزی :- (فارسی) یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اور اس میں تقویۃ الایمان پر مولانا فضل حق خیر آبادی کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے ۔ ایک دن شاہ اسماعیل نماز کے لیے مسجد کو جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص نے ان کو مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک رسالہ دیا، جس میں تقویۃ الایمان پر اعتراضات کیے گئے تھے اور مسئلۂ امکانِ نظیر سے متعلق شاہ صاحب کے نقطۂ نظر کی تردید کی گئی تھی ۔ شاہ صاحب نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ گئے اور ایک ہی نشست میں اس کا جواب لکھ دیا ۔ اسی لیے یہ رسالہ "یک روزی" کے نام سے موسوم ہوا ۔ یہ رسالہ کئی دفعہ چھپ چکا ہے ۔ اگرچہ مختصر ہے، تاہم بہت جامع اور مدلل ہے ۔ اب تک اس کا کوئی شخص جواب

نہیں دے سکا۔

۱۲۔ حقیقت تصوّف:۔ (فارسی) یہ کتاب اب نایاب ہے۔ اس کا ذکر "الحیات لبعد المَمات" میں کیا گیا ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے تصوّف اور اُس کی حقیقت بیان کی ہے اور سچے اور صحیح صوفی کی تعریف بیان فرمائی ہے۔ تصوّف کے نام پر جو غلط باتیں کی جاتی ہیں، ان کی مذمت کی ہے۔ اس کتاب سے طبقۂ صوفیا کی اصلاح ہوئی[۳۳]

۱۳۔ الاربعین فی احوال المہدیین:۔ شاہ شہید کی یہ وہ کتاب ہے، جس کا ذکر ان کے کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا۔ صرف "حیات اسماعیل شہید" میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ منقول ہے کہ یہ کتاب صرف ایک مرتبہ ۱۲۶۸ھ میں مصری گنج کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ اب نایاب ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ اس کا موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، امام مہدی کا نزول ہے اور اس میں مصنف شہیر نے وہ احادیث جمع کر دی ہیں، جن سے امام مہدی کے نزول کا ثبوت ملتا ہے۔ کتاب کا کچھ حصہ عربی میں ہے اور بین السطور میں اُردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ آخر میں شاہ نعمت اللہ ولی کا فارسی قصیدہ ہے[۳۴] یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ قصیدہ کس شخص نے کتاب کے آخر میں درج کیا ہے۔

مکتوبات

شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ زندگی کے ہر قدم پر انتہائی سرگرم اور فعال رہے۔ مخالفین اسلام کے ساتھ جہاں ان کی مجاہدانہ تگ و تاز تاریخ کا ایک بہت بڑا باب ہے اور ان کی تصنیفی جدوجہد خاص اہمیت کی حامل ہے، وہاں اُن کے مکتوبات

---

[۳۳] الحیات لبعد المَمات ص ۱۹۹۔

[۳۴] حیات اسماعیل شہید ص ۱۹۲

کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اُنھوں نے اپنے دوستوں، مخالفوں، معاصروں، مختلف علاقوں کے سرداروں اور اہلِ علم کو بہت سے مکتوبات تحریر کیے۔ فقہی اور علمی مسائل دریافت کرنے والوں کے نام بھی انھوں نے خطوط لکھے، پھر اپنے مرشد امیر المجاہدین سیّد احمد شہید بریلوی کی خدمت میں بھی مکتوبات ارسال کیے۔ ان مکتوبات سے اس زمانے کے معاشرتی، دینی اور سیاسی کوائف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ مجاہدین کن حالات سے دوچار تھے اور خدمتِ اسلام کا جذبہ ان کے اندر کس طرح کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ پھر صوبہ سرحد کے عوام و خواص کا ان کے بارے میں کیا نقطۂ نظر تھا۔ شاہ شہید کے مکتوبات سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ان کے علم و فکر کے حدود کس درجہ وسیع تھے اور ان کی سیاسی بصیرت کتنی گہری تھی۔

شعر و شاعری

شاہ اسماعیل شہید جہاں بہت بڑے مصنف اور نثر نگار تھے وہاں ممتاز شاعر بھی تھے۔ نثر کے ساتھ ساتھ ان کی منظومات کو بھی اہلِ فن کے نزدیک ایک مقام حاصل ہے۔ اُنھوں نے فارسی اور اُردو زبانوں میں طبع آزمائی کی اور اس میں کامیاب رہے ہے۔ ان کے کلام کے حصّہ فارسی میں (۱) مثنوی سلک نور (۲) قصیدہ در مدح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم (۳) قصیدہ در مدح سیّد احمد شہید اور حصّۂ اُردو میں (۱) مثنوی سلکِ نور (۲) رسالہ۔ بے نماز اں اور (۳) نسخۂ قوتِ ایمان شامل ہے۔ جس طرح ان کی نثر زوردار اور مؤثر ہے، اسی طرح ان کی (فارسی اور اُردو) منظومات کا پایہ بھی بڑا اُونچا ہے۔

شہادت

اس عالم نبیل، فاضلِ بے بدل، ماہر علوم معقول و منقول، مجاہدِ اعظم، مصلح وقت، مجدّد دوراں، بہادر جرنیل اور عظیم مصنف و شاعر نے اپنے متعدد رفقائے عالی قدر کے ساتھ ۲۴ — ذلقیعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ — مئی ۱۸۳۱ء) کو

بالاکوٹ کے میدان میں کفّار سے جنگ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۳ سال تھی۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

شاہ محمّد عمر

جیسا کہ ابتدا میں بتایا گیا، شاہ محمد اسماعیل کی تعلیم وتربیت کی منزلیں اُن کے چچا شاہ عبدالقادر کی آغوشِ محبت میں طے ہوئی تھیں۔ شاہ عبدالقادر کی ایک ہی صاحبزادی تھیں جن کی شادی ان کے بھتیجے مولانا مصطفےٰ سے ہوئی تھی۔ ان کی بھی ایک ہی بیٹی تھیں، جو شاہ محمد اسماعیل کے عقد میں آئیں۔ شاہ اسماعیل کے ہاں بھی ایک ہی لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام محمّد عمر رکھا گیا۔

شاہ محمد عمر مزاجاً وطبعاً دنیا اور اہلِ دنیا سے اسی طرح بے نیاز اور مستغنی تھے، جس طرح ان کے جدِّ امجد شاہ عبدالغنی تھے۔ تمام عمر گوشہ نشین اور لوگوں سے الگ تھلگ رہے۔ اپنے خاندانی مدرسے میں تعلیم پائی۔ اساتذہ میں صرف شاہ محمد اسحاق دہلوی کے اسمِ گرامی کا پتا چل سکا ہے۔ بہت ہی متّقی اور خدا رسیدہ عالم تھے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ کا بیان ہے کہ شاہ محمد عمر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زیارت کثرت سے ہوتی تھی۔[۳۵]

شاہ محمد عمر اپنے دور کے درویش آدمی تھے اور بعض دفعہ ان پر جذب کا غلبہ ہو جاتا تھا۔

امورِ مشتبہ سے پرہیز کرتے اور ممنوعات سے دامن کشاں رہتے۔ کسی ایسی جگہ نہ جاتے جہاں کسی شکل میں بھی بُرائی کا ارتکاب ہوتا ہو۔ اس سلسلے میں نواب مصطفےٰ خاں کا بیان ہے کہ ہم چند احباب جن میں مرزا غالبؔ بھی تھے،

---

۳۵ ارواح ثلاثہ ص ۱۷۴

اپنے بالاخانے میں بیٹھے ہوئے تھے اور بلا مزامیر کے گانا ہو رہا تھا۔ اتفاق سے مومن خاں مومن کہیں سے شاہ محمد عمر صاحب کو پکڑ کر وہاں لے آئے۔ وہ برابر یہ کہتے جاتے تھے کہ "مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو"۔ مگر مومن خاں نہیں مانتے تھے۔ آخر ان کو لا کر اس مجلس میں بٹھا دیا۔ گانا برابر ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر میں شاہ محمد عمر صاحب نے جسم کو ایک بہت ہی معمولی سی حرکت دی، اس کے اثر سے سارا مکان ہل گیا۔ اس پر حاضرینِ مجلس کچھ پریشان سے ہوئے۔ یہ بھی خیال ہوا کہ شاید شاہ صاحب کی جنبش کا اثر ہو۔ یہ بھی کہا جانے لگا کہ ممکن ہے زلزلے کا جھٹکا ہو۔ مگر سب کی توجہ شاہ محمد عمر کی طرف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے دوبارہ جسم کو حرکت دی جو پہلی حرکت سے زیادہ تھی۔ اس سے پھر مکان ہلا اور پہلے کی نسبت زور سے ہلا۔ اب سب کو یقین ہو گیا کہ یہ سب شاہ محمد عمر کی حرکت کا اثر ہے۔ تھوڑی دیر بعد ذرا اور زور سے جسم کو حرکت دی تو اس سے مکان کو اور زیادہ حرکت ہوئی، یہاں تک کہ کڑیاں بھی بول گئیں اور طاقوں وغیرہ میں جو شیشے اور آلات وغیرہ پڑے تھے وہ کھن کھن کر کے گرنے لگے۔ اس پر کسی نے شاہ محمد عمر سے کہا "یہ کیا؟" فرمایا "میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے چھوڑ دو، مجھے مت بٹھاؤ"۔ یہ الفاظ کہے اور اُٹھ کر چلے گئے۔[۳۶]

شاہ محمد عمر نماز نہایت خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے، میاں سید نذیر حسین دہلوی فرماتے ہیں کہ مولوی محمد عمر کے زہد و عبادت کا یہ حال تھا اور نماز اس طرح اطمینان سے پڑھتے تھے کہ رکوع و سجود اس قدر طویل ہوتے کہ اس اثنا میں عام آدمی سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ ستائیس اٹھائیس مرتبہ پڑھ لیتا۔[۳۷]

استغنا اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ دہلی کے مغل بادشاہ نے اکثر ان سے

۳۶؎ ارواح ثلاثہ ۱۷۵

۳۷؎ الحیات بعد الممات (حاشیہ) ص ۲۰۶

ملاقات کی تمنا کی اور ارکانِ دولت کو پیغام ملاقات دے کر ان کی خدمت میں بھیجا، مگر آپ نہیں گئے اور ہمیشہ جواب میں یہی کہا کہ جس باپ کی نسبت سے بادشاہ میری ملاقات کے خواہش مند ہیں، ان کی بزرگی مجھ میں نہیں ہے، اور اسی عذر پر کبھی ملاقات نہیں کی۔[۳۸]

شاہ محمد عمر علم و عمل اور تقویٰ و تدین میں اپنے دور کی بے نظیر شخصیت تھے۔ ان کے اوصاف و کمالات کی وجہ سے لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ہر حلقے میں ان کو لائقِ تکریم گردانا جاتا تھا۔ انھوں نے دو مغل بادشاہوں کا زمانہ پایا، اکبر شاہ ثانی کا اور بہادر شاہ ظفر کا۔ ان دونوں باپ بیٹے کے دل میں ان کی انتہائی عزت تھی۔ اُنھوں نے اپنے امرا کی وساطت سے ان کو بارہا اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی، مگر یہ نہیں گئے اور ہر دعوت کے جواب میں نہایت انکساری سے کہلا بھیجا کہ نیکی اور پرہیزگاری میں میرا وہ مقام نہیں ہے جو میرے باپ یا میرے دیگر اسلاف کا تھا۔

شاہ محمد عمر نے ۲۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۶۸ھ کو وفات پائی۔ "مرگ شیخ زمان" سے ان کی تاریخ وفات نکالی گئی۔ شاہ محمد عمر کی کوئی اولاد نہ تھی۔ یہ اپنے خاندانِ عالی قدر کے آخری فرد تھے۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی دودمانِ ولی اللّٰہی کی صلبی اولاد کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ البتہ رُوحانی اولاد بے حد و حساب ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کا کوئی ایسا عالم دین نہیں جس کی سند ان بزرگوں تک نہ پہنچتی ہو اور جس نے کسی نہ کسی صورت میں ان سے استفادہ اور استفاضہ نہ کیا ہو۔ خود صاحبِ ترجمہ مولانا محمد اسماعیل شہید کے علم و فضل، عمل و کردار، تصنیف و تالیف اور افکار و نظریات سے مستفید و متاثر ہونے والوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ لوگ انھیں ملت اسلامیہ کا محسنِ عظیم قرار دیتے ہیں اور اپنا رہنما و قائد مانتے ہیں۔

---

[۳۸] الحیات بعد الممات، ص ۲۰۶

ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

۵۲ —— مفتی محمد اصغر انصاری فرنگی محلی

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محلی علم و فضل اور درس و افتا میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کو اس میدان میں زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور کسی کو قدرے کم —— ورنہ خدمات علمی میں مجموعی لحاظ سے کوئی کسی سے پیچھے نہیں ـــ ان حضراتِ علما میں ایک بزرگ مفتی محمد اصغر تھے جو مفتی احمد انصاری فرنگی محلی کے لائق فرزند تھے اور اپنے عہد کے فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ ان کا مولد و منشا لکھنؤ ہے یعنی فرنگی محل کے اسی مہدِ علم میں تربیت حاصل کی جہاں ان کے آبا و اجداد نے حاصل کی تھی۔ پہلے قرآنِ مجید حفظ کیا اور پھر اپنے والدِ ماجد مفتی احمد فرنگی محلی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ اس زمانے میں مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلی کی مسندِ تدریس آراستہ تھی، محمد اصغر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلے اور درس و تدریس میں انہی کا طریقہ اپنایا۔ اپنے بزرگوں کے مدرسے کو رونق بخشی اور علما و طلبا کی کثیر تعداد ان کے گرد جمع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی افتا کا سلسلہ شروع فرمایا، جو خاندان میں اُن کے آبا و اجداد سے چلا آ رہا تھا۔ فقہی مسائل میں لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے اور ان کے فتوے کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

مفتی محمد اصغر انصاری نے متعدد درسی کتابوں پر تعلیقات و حواشی تحریر کیے جو اہلِ علم میں مقبول ہوئے۔

اس ہندی عالم و فقیہ نے ہفتے کے دن ۱۳ —— رجب ۱۲۵۵ھ کو اپنے شہر لکھنؤ میں وفات پائی[۳۹]۔

---

[۳۹] تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۳۹ —— تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۰ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

۵۳ ـــــــــ مفتی محمدؒ افضل پھلواروی

صوبہ بہار کے شہر پھلواری کی علمی تاریخ نہایت شان دار ہے۔ کئی صدیوں سے اُسے علما و فقہا کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ اِس شہر میں صوفیا و اتقیا نے بھی جنم لیا اور درس و تدریس کے دلدادہ حضرات نے بھی اس میں بے حد خدمات انجام دیں۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس مرکزِ علم و تصوّف میں جس بزرگ نے شہرت پائی ان کا اسمِ گرامی مفتی محمد افضل تھا۔ فقہائے حنفیہ میں ان کو عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ان کی خدماتِ بوقلموں کی وجہ سے ان کو یگانۂ روزگار سمجھا جاتا تھا۔ اپنے دَور میں یہ پھلواری کی مسندِ افتا پر فائز تھے اور اس نواح کے تمام لوگ مسائلِ فقہیہ کے سلسلے میں ان سے رجوع کرتے تھے اور ان کے فتوے کو آخری قرار دیا جاتا تھا۔

مفتی محمد افضل پھلواروی سلوک و طریقت میں بھی درک رکھتے تھے اور اس میں وہ شیخ مجیب اللہ ہاشمی جعفری کے حلقۂ ارادت سے منسلک تھے۔ یہ بھی پھلواری کے رہنے والے تھے اور علومِ متداولہ کے ماہرین میں سے تھے۔

مفتی محمد افضل پھلواروی نے ۱۲۱۸ھ میں وفات پائی۔[۱]

۵۴ ـــــــــ مولانا محمدؒ اکبر کشمیری

وادیٔ کشمیر کی خوش گوار فضاؤں میں تیرھویں صدی ہجری میں جن اصحابِ علم اور اربابِ فقہ نے ہوش سنبھالا ان میں مولانا محمد اکبر کشمیری کا ذکر خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہے۔ یہ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) احوالِ علمائے فرنگی محل ص ۱۶ ـــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۲۸؛

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۲۹ بحوالہ تذکرۃ الکملا۔

علمائے عصر کی خدمت میں حاضری دی اور مروّجہ علوم کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد بمبئی کا عزم کیا اور وہاں کے مدرسہ محمدیہ میں جو جامع مسجد میں واقع تھا، درس تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ تیس سال یہ خدمت انجام دی اور اس طویل مدت میں بے شمار تشنگانِ علوم نے ان سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ بلاشُبہ مولانا محمد اکبر کشمیری اکابر علمائے وقت میں سے تھے۔ جن حضرات نے ان سے استفادہ کیا، ان کی وسیع فہرست میں سیّد عبدالفتاح، سیّد عمادالدین اور مفتی عبداللطیف کے اسمائے گرامی شامل ہیں جو اپنے عہد اور علاقوں کے جلیل القدر علما میں شمار ہوئے۔ بمبئی، صوبہ گجرات، دکن اور کوکن وغیرہ کے علاقوں میں ان کے شاگرد وسیع تعداد میں موجود تھے۔

مولانا محمد اکبر کشمیری نے ۱۲۷۲ھ کو بمبئی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔[۱]

۵۵ — مولانا محمّد اکرم شاہ جہان پوری

ہندوستان کے صوبہ یوپی کا شہر شاہ جہان پور بڑا مردم خیز شہر ہے۔ اس شہر کو متعدد اہلِ فضل کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل ہے۔ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں اس شہر کی زرخیز مٹی سے جو حضرات اُبھر کر سامنے آئے ان میں مولانا محمد اکرم اور اُن کے والد مولانا محمد جان کے اسمائے گرامی تاریخ نے خصوصیت سے محفوظ کر لیے ہیں — باپ بیٹا دونوں حنفی المسلک بزرگ تھے اور ادراک و عرفان کے اعتبار سے اپنے عہد میں بہت نامور تھے۔

مولانا محمد اکرم کی ولادت شاہ جہان پور میں ہوئی اور وہیں پلے بڑھے۔ ان کے والد مولانا محمد جان جیّد عالم تھے۔ محمد اکرم نے ان کے اور بعض دیگر علمائے وقت کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور تمام علوم میں جو اس عہد میں پڑھائے جاتے تھے، مہارت حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا محمد اکرم نے اپنے آبائی شہر شاہ جہان پور

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۲ — نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۹

میں درس و تدریس کا ہنگامہ بپا کیا اور مسندِ افتا کو رونق بخشی ــــــ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[۴۲]

۵۶ ــــــ مفتی محمد برکت عظیم آبادی

ہندوستان کے صوبہ بہار کا دارالخلافہ "پٹنہ" ہے۔ اسے کسی زمانے میں "عظیم آباد" کہا جاتا تھا۔ اس شہر کے علما و فضلا کی ایک باقاعدہ اور مستقل تاریخ ہے۔ یہ حضرات درس و تدریس میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، فتویٰ نویسی میں بھی ان کا مرتبہ بلند تھا، تدین و تقویٰ میں بھی انھیں شہرت حاصل تھی، جہاد فی سبیل اللہ میں بھی اُنھوں نے بے پناہ قربانیاں دیں اور تفسیر و حدیث اور فقہ کی ترویج و اشاعت میں بھی ان کی تگ و تاز کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ پٹنہ کے حضراتِ علما میں ایک بزرگ کا نام نامی مفتی محمد برکت تھا جو اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں گردانے جاتے تھے اور وقت کے شیخ اور فقیہ تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ اُنھوں نے میر جمال الدین فاضل سے اخذ علم کیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور پھر عمر بھر یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے شاگردوں میں اس دور کے بعض جلیل القدر علما کے نام ملتے ہیں، جن میں مولانا عبدالغنی پھلواروی شامل ہیں۔ لاتعداد علما و طلبا نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور کسبِ علم کیا۔

مفتی محمد برکت عظیم آبادی نے ۱۲۲۰ھ کو وفات پائی۔[۴۳]

۵۷ ــــــ سیّد محمد تقی لکھنوی

لکھنؤ کے شیعہ علما و فقہا میں تیرھویں صدی ہجری میں سیّد محمد تقی بہت مشہور

---

۴۲ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۲۹ بحوالہ تاریخ فرخ آباد

۴۳ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۳۱ بحوالہ تاریخ الکملا

شخصیت تھے۔ یہ سیّد حسین لکھنوی کے بیٹے اور سیّد دلدار علی حسینی کے پوتے تھے۔ شیعہ امامیہ مذہب میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے انھیں مجتہد کہا جاتا تھا۔

۱۶۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۴ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی سیّد حسین سے علم حاصل کیا۔ سیّد دلدار علی لکھنوی سے سند و اجازہ کا شرف حاصل ہوا، اور کبار علمائے شیعہ امامیہ میں گردانے گئے۔ لکھنؤ میں نوابانِ اودھ کا دور تھا اور امجد علی شاہ بر سرِ حکومت تھا۔ نواب امجد علی نے ان کو "ممتاز العلما" کا خطاب عطا کیا اور شاہی مدرسے کی مسندِ تدریس ان کے سپردِ کی۔

سیّد محمد تقی تصنیفی ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

۱۔ نخبۃ الدعوات:۔ یہ کتاب ادعیہ ماثورہ سے متعلق ہے۔

۲۔ العباب:۔ یہ علم نحو کے بارے میں ہے۔

۳۔ کتاب الارشاد:۔ یہ ان لوگوں کے رَدّ میں ہے جو تاثیرِ دُعا سے انکار کرتے ہیں۔

۴۔ حدیقۃ الواعظین:۔

۵۔ نزھۃ المواعظین:۔

۶۔ لمعۃ الواعظین:۔ یہ تینوں کتابیں (نمبر ۴ تا ۶) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، وعظ و نصیحت کے بارے میں ہیں۔

۷۔ ایک رسالہ اس موضوع پر ہے کہ اگر کوئی شخص بذاتِ خود فاسق ہو، مگر مومنین کے حق میں عادل ہو تو اس کی امامت جائز ہے۔

۸۔ رسالہ فی فضائل الدعاء و آدابہ:۔ یہ رسالہ دُعا کے فضائل و آداب کے موضوع سے متعلق ہے۔

۹۔ ینابیع الانوار فی تفسیر کلام اللہ الجبار:۔ یہ کتاب تفسیر قرآن کے سلسلے میں ہے۔

سیّد محمد تقی کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور مختلف موضوعات سے متعلق ان کے کتب خانے میں بہت سی کتابیں موجود تھیں۔

انھوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور امام باڑہ بھی بنوایا تھا۔ اس امام باڑے میں بہت سے شیعہ حضرات آتے جاتے تھے۔ بالخصوص محرم کے عشرۂ اوّل میں وہاں بہت ہجوم رہتا تھا اور مجالسِ عزا منعقد ہوتی تھیں۔

سیّد محمد تقی نے ۱۲۷۹ھ کو وفات پائی۔

۵۸ ــــــ قاضی محمّد جمیل بُرہان پوری

قاضی محمّد جمیل بن عبدالغفور بُرہان پوری جلیل القدر عالم اور بہت بڑے فقیہ تھے۔ متقی اور پرہیز گار علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولد و منشا برہان پور ہے۔ ذرا ہوش سنبھالا تو قرآنِ مجید حفظ کیا۔ بعد ازاں ابتدائی درسی کتابیں اپنے شہر (برہان پور) کے اساتذہ مولوی قدرت اللہ، مولوی ضیاء الدین عرف اللہ والے اور مولوی عوض نبی سے پڑھیں۔ اس کے بعد حیدر آباد (دکن) کا عزم کیا، لیکن بہت کم عرصہ وہاں مقیم رہے اور مولوی محمد حفیظ سے کچھ استفادہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے حیدر آباد میں ان کا دل نہیں جما۔ اس لیے جلد ہی وہاں سے رختِ سفر باندھا اور دہلی آگئے۔ دہلی اس زمانے میں فضل و کمال کا گہوارہ تھا اور بہت سے جیّد علما اور عالی مرتبت حضرات وہاں اقامت گزیں تھے، جن کے درس و تدریس کے ہنگامے جاری تھے۔ ان میں مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی، مفتی صدرالدین آزردہ اور سیّد محمد قندھاری کے اسمائے گرامی خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہیں مولانا محمد جمیل نے ان سب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور خوب مستفید ہوئے۔ شاہ ابو سعید مجدّدی سے بیعت ہوئے اور خلافت حاصل کی۔

دہلی سے لکھنؤ کا قصد کیا۔ لکھنؤ میں ممتاز شافعی المسلک عالم مرزا حسن علی لکھنوی کی مسندِ تدریس آراستہ تھی، مولانا محمد جمیل اس میں شامل ہوئے اور حصولِ علم کیا۔

لکھنؤ سے عازمِ حجازِ مقدس ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔

حجاز سے مراجعت فرمائے ہند ہوتے اور اپنے وطن بُرہان پور پہنچے۔ چوں کہ حدیث وفقہ اور دیگر علومِ متداولہ میں عبور رکھتے تھے، لہٰذا برہان پور کے منصب قضا پر فائز کیے گئے اور کافی عرصہ یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔

بُرہان پور سے پھر حیدر آباد (دکن) گئے۔ اب تمام اصنافِ علم پر حاوی ہو چکے تھے اور تجربہ بھی وسیع ہو گیا تھا، اس لیے حیدر آباد کے مدرسۂ عالیہ کی مسندِ تدریس ان کو تفویض کی گئی۔ تا حینِ حیات اس مسند پر متمکن رہے اور خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

بلاشُبہ قاضی محمد جمیل بُرہان پوری اپنے عہد کے نامور عالم اور ممتاز فقیہ تھے اور ان کی خدمات کا دائرہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔

اس عالم کبیر اور فقیہ نامدار نے ۲۳ — جمادی الاولیٰ ۱۲۷۴ھ کو حیدر آباد (دکن) میں وفات پائی اور اسی شہر میں آسودۂ لحد ہوئے[۴۴]

۵۹ — سیّد محمّد حُسین حیدر آبادی

ہندوستان کے علاقہ دکن کے علمائے کرام اور فقہائے عظام میں سیّد محمد حسین حیدر آبادی معروف عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ والد کا اسمِ گرامی علی نور اور جدِ امجد کا نامِ نامی نور محمّد تھا۔ تمام علوم میں دسترس رکھتے تھے، لیکن فقہ اور اصولِ فقہ میں بالخصوص شہرت حاصل تھی۔ درحقیقت ان کا خاندان خراسان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کی پیدائش بھی خراسان ہی میں ہوئی اور وہیں نشو و نما پائی۔ اوائل عمر (۱۲۳۷ھ) میں ہندوستان آئے اور یہاں کے مختلف اساتذہ سے علم حاصل کیا۔

---

[۴۴] نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۴۳۲، ۴۳۳ — تاریخ بُرہان پور ص ۱۷۵-۱۷۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۵

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۲۵۵ میں حیدر آباد (دکن) گئے۔ حیدر آباد میں یہ ناصر الدولہ کا دورِ حکومت تھا۔ اس سے ملے تو وہ ان کے کثرت معلومات اور علوم پر مہارت سے بہت متاثر ہوا، اور انھیں اپنے بیٹے افضل الدولہ کا اُستاد مقرر کر دیا۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا جو انھیں حاصل ہوا۔ یہ خدمت اُنھوں نے نہایت حُسن و خوبی سے انجام دی۔ بعد ازاں اپنی قابلیّت کی بنا پر محکمہ قضا میں نائب مقرر ہوئے۔ مُدّت تک یہ خدمت ان کے سپُرد رہی۔ بے حد صالح اور متدین عالم دین تھے۔ گفتار اور کردار میں اپنی مثال آپ تھے۔ جس کام پر مامور کیے جاتے، اسے عمدگی سے انجام دیتے۔ بلند اخلاق اور نرم مزاج اہل علم تھے۔

سیّد محمد حسین نے غرۂ رمضان ۱۲۷۴ھ کو حیدر آباد (دکن) میں وفات پائی[45]۔

۶۰۔ شیخ محمّد حُسین انصاری سندھی

دیارِ سندھ کے شیخ محمد حسین بن محمد مراد بن یعقوب بن محمود انصاری خزرجی، اپنے عصر کے شیخ و فاضل اور عالم کبیر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مشہور صحابی حضرت ابو ایّوب انصاری رضی اللہ عنہٗ کی اولاد سے تھے۔ علاقۂ سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ ان کے والد شیخ محمد مراد جلیل القدر عالم تھے، لائق بیٹے نے انھی سے علم حاصل کیا اور مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ پھر والد کے ساتھ ہی ہجرت کر کے دیارِ عرب کو اپنا مسکن بنا لیا۔ تفسیر و حدیث، صرف و نحو، بیان و معانی، فقہِ حنفیہ اور اس کے اصول پر انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ علم طب میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ سرزمینِ عرب میں انھیں بہت شہرت حاصل تھی اور تمام علما و فضلا ان کے علم و کمال کے معترف تھے۔ اربابِ حکومت میں بھی

---

[45] تزک محبوبی — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۳۷

قدر و منزلت کے مالک تھے۔ ان کے والد محمد مراد بھی طبقۂ علما اور امرا و وزرا میں تکریم و تعظیم کے حامل تھے۔ حکومت کے ایک وزیر نے شیخ محمد مراد کے لیے ایک رباط، ایک مسجد اور بہت اچھا مکان تعمیر کرا دیا تھا۔ ان کا عظیم الشان کتب خانہ تھا جس میں تمام علوم و فنون کی کتابیں موجود تھیں۔[۳۶]

۶۱ — مولانا محمد سالم دہلوی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا گھرانہ علمی اعتبار سے نہایت زرخیز گھرانہ تھا۔ ان کی اولاد و احفاد سے متعدد اہلِ علم نے جنم لیا اور بہترین خدمات انجام دیں۔ تصنیف و تالیف، شروح و حواشی اور درس و تدریس میں ان میں سے بعض حضرات کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس دودمانِ عالی قدر کے ایک بزرگ مولانا محمد سالم تھے جو فضیلت علم اور مشیخت میں خاص مقام رکھتے تھے۔ ان کا مولد و منشا دہلی ہے۔ اپنے عصر کے جلیل القدر اساتذہ سے تحصیل علم کی اور پھر حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ یہ مولانا سلام اللہ کے لائق فرزند تھے اور اپنے دور کے جید علما میں گردانے جاتے تھے۔ حج بیت اللہ کے بعد واپس وطن تشریف لائے تو ہندوستان کے شہر دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علما و فضلا کا مرجع قرار پا گئے۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ اصول الایمان فی حب النبی وآلہ من اہل السعادۃ والایقان:۔ یہ کتاب ایک مقدمے اور چار فصول پر مشتمل ہے۔ مصنف کی زندگی ہی میں ۱۲۵۹ھ کو دہلی میں طبع ہوئی۔

۲۔ نور الایمان:۔

۳۔ لطائف الاسرار:۔ یہ کتاب تعویذات اور دم جھاڑے سے متعلق ہے۔

---

[۳۶] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۳۸

۴۔ طریق السالم

۵۔ ترجمہ حزب البحر

بعض اور رسائل بھی تصنیف کیے۔

مولانا محمد سالم اپنے دور میں تیرھویں صدی ہجری کے معروف علما و فقہا میں سے تھے۔ ان کے سنِ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔[۵۴]

۶۲ ـــــــ مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی

ہندوستان کے شہر مدراس اور اس کے نواح میں جو اصحابِ علم فقہی میدان میں سرگرم عمل ہوئے ان میں مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی کا نام نامی لائقِ تذکرہ ہے۔ ۱۱۹۴ھ کو مدراس میں ان کی ولادت ہوئی اور مختلف علمائے وقت سے حصولِ علم کے بعد کچھ عرصہ تو درس و افادہ میں مشغول رہے، پھر حکومت مدراس نے ان وظائف و عطیات کی تقسیم پر مامور کر دیا جو اہلِ حرمین کے لیے مقرر تھے۔ والیٔ مدراس نے ان کو سراج العلما حافظ محمد اسلم خاں بہادر کے لقب سے سرفراز کیا اور اسی لیے اسلمی کہلائے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد وہ حجاز تشریف لے گئے اور مکہ مکرمہ میں قیام کیا۔ طویل مدّت تک وہاں اقامت گزیں رہے۔ قیامِ مکّہ کے زمانے میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کا عربی میں ترجمہ کیا تاکہ علمائے مکّہ اور دیگر عرب اہلِ علم اس سے مستفید ہو سکیں۔

مکہ مکرمہ سے اپنے وطن مدراس آئے اور مدراس میں ایک ذاتی مکان بنایا، ایک باغ لگایا اور سعید آباد کے نواح میں قبرستان کے لیے بھی ایک جگہ وقف کی۔

مدراس سے حیدر آباد (دکن) گئے، پھر اورنگ آباد کا عزم کیا اور ایک

---

[۵۴] نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۲۲۰، ۲۲۱ بحوالہ مرآۃ الحقائق۔

عرصے کے بعد دوبارہ مدراس آئے۔

اس عالم دین اور فقیہ نامدار نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام "سفینۃ النجات" ہے جو اخلاقی مسائل سے متعلق ہے اور ضخیم کتاب ہے۔ آخر عمر میں فارسی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ یہ تفسیر چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

مولانا محمد سعید اسلمی نے ۸۔ ربیع الاول (ایک روایت کے مطابق ۱۱۔ محرم) ۱۲۷۱ھ یا ۱۲۷۲ھ کو مدراس میں وفات پائی اور وہیں اپنے ذاتی قبرستان (نواحِ سعید آباد) میں دفن کیے گئے۔[۴۸]

۶۳۔ مولانا محمد سلیم جون پوری

جون پور (یوپی) کا ایک مشہور شہر ہے جو بے شمار علما و فقہا کا مولد و مرکز رہا ہے اور ان کا تذکرہ سلسلۂ فقہائے ہند کی گزشتہ جلدوں میں کئی مقامات پر ہو چکا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر میں جن بلند پایہ حضرات نے نوع بنوع علمی خدمات انجام دیں، ان میں مولانا محمد سلیم جعفری جون پوری کا اسمِ گرامی تذکرہ و رجال کی کتابوں میں نمایاں طور سے مرقوم ہے۔

محمد سلیم جعفری ۱۲۲۲ھ کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایک مقام مچھلی شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب قاضی ثناء اللہ مچھلی شہری سے ملتا ہے۔ محمد سلیم نے علوم عربیہ کی ابتدائی تعلیم اپنے شہر کے نامور عالم مفتی علی کبیر بن علی محمد جعفری مچھلی شہری سے حاصل کی اور انتہائی کتابوں کا درس قاضی محمد شکور مچھلی شہری سے لیا۔ ملا رحمت اللہ کابلی سے بھی استفادہ کیا۔

محمد سلیم جعفری اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے، عربی ادبیات میں

---

[۴۸] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۴۱، ۲۲۴

ان کو خصوصیت سے ورک حاصل تھا۔ فارسی اور عربی کے اچھے شاعر بھی تھے اور طبیعت موزوں رکھتے تھے، متقی، پرہیزگار، بلند اخلاق، بامروت، فہیم اور صاحبِ فراست تھے۔ ذہن بہت رسا پایا تھا۔ گفتار و کردار میں بے نظیر تھے۔ فصاحت و بلاغت میں یکتا اور سخن سنجی اور نکتہ آفرینی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی نظم و نثر میں کوئی اس علاقے میں ان کا حریف نہ تھا۔ مشکل ترین مضامین کی عقدہ کشائی میں بہت تیز تھے۔

فقہ میں عبور کی وجہ سے اپنے استادِ محترم مفتی علی کبیر مچھلی شہری کی سفارش پر پہلے قاضی مقرر ہوئے، پھر صدر امین کا منصب پایا، بعد ازاں صدرالصدور کا عہدہ حاصل کیا۔ اپنے دور کے علمائے ہند میں ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اپنی قابلیت و صلاحیت کی بنا پر ملک کی انگریزی حکومت میں نہایت قدر و منزلت کے حامل قرار پائے۔ تصنیف و تالیف میں میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تحریر فرمائیں :۔

۱۔ رقیمۃ السلیم : یہ کتاب علم حدیث سے متعلق ہے اور اس میں فقہی مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب عربی میں ہے۔

۲۔ حاشیہ علیٰ شرح چغمینی :۔ علم ہیئت کے بارے میں شرح چغمینی پر عربی حاشیہ۔

۳۔ ہفوات الالحاد :۔ عربی ادبیات کے بارے میں۔

۴۔ رسالہ الجبر والمقابلہ :۔ یہ بھی عربی میں ہے۔

۵۔ میزان الوافی فی علمی العروض و القوافی :۔ عروض و قوافی کے سلسلے میں ایک اہم کتاب ہے۔

۶۔ رسالہ فی تحقیق الشہور :۔ سال کے بارہ مہینوں کے بارے میں۔

۷۔ رسالہ مصطلحات فارسی۔

۸۔ جون پور نامہ :۔ جون پور کی تاریخ سے متعلق۔

۹ - دیوان فارسی :- فارسی اشعار کا مجموعہ -

۱۰ - دیوان عربی :- عربی اشعار کا مجموعہ -

اس جیّد عالم و فقیہ نے صرف چوالیس سال عمر پائی اور یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۶۶ھ کو اعظم گڑھ (یوپی) میں فوت ہوتے، وہیں دفن کیے گئے[۴۹]۔

۶۴ ــــــ سیّد محمّد سیادت امروہوی

امروہہ (یوپی) کے شیعہ علما و فضلا میں سیّد محمد سیادت بن محمد عبادت حسینی امروہوی نے بڑا نام پایا۔ امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ان کے والد سید محمد عبادت شیعہ کے معروف علما میں سے تھے، بیٹے نے انھی سے اکتساب علم کیا اور علم فقہ اور دیگر علوم میں عبور حاصل کیا۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں ایک ممتاز شیعہ عالم و مجتہد سیّد محمد بن دلدار علی لکھنوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور فقہ، کلام، اصولِ فقہ اور باقی علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت پیدا کی۔ اب وہ فقہ و اصول میں اپنے عصر کے بہت بڑے شیعہ عالم شمار ہونے لگے۔ فارغ التحصیل ہو کر واپس امروہہ گئے تو انھیں اپنے والد گرامی سیّد محمد عبادت کی جگہ فرض نمازوں کا امام مقرر کر دیا گیا اور تحقیقِ مسائل میں امروہہ اور اس کے گرد و نواح کے حضرات انھی سے رجوع کرنے لگے۔ اپنے شہر کا منصبِ افتا اور عہدۂ تدریس بھی ان کے سپرد کیا گیا اور اس سلسلے میں دُور دور تک ان کا نام پہنچا۔

امروہہ کے اس شیعہ عالم و فقیہ نے ۱۲۶۵ھ کو امروہہ میں وفات پائی[۵۰]۔

---

[۴۹] تجلّی نور ج ۲ ص ۱۳۲، ۱۳۳ — تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۲۷۳، ۲۷۴ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۴۲، ۴۴۳؛

[۵۰] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۴۳ بحوالہ تاریخ اصغری۔

۶۵۔۔۔۔ محمدؐ شاکر سُورتی

ہندوستان کے علاقہ گجرات کے شہر سُورت میں بے شمار علما او رفقہا پیدا ہوئے جن کا ذکر فقہائے ہند کی تمام جلدوں ہیں متعدد مقامات پر آچکا ہے۔ ان حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد شاکر تھے جو حنفی المسلک تھے اور سورت کے اُونچے مرتبے کے فقہا میں گردانے جاتے تھے۔ ان کے زمانے میں سورت میں لاہور کے ایک عالم و فقیہ سیّد عبداللہ حسنی لاہوری فروکش تھے، محمدؐ شاکر نے اِنھی سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا اور مرتبۂ عالی کو پہنچے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے شہر ہی میں سکونت اختیار کیے رکھی اور تمام عمر درس و افادہ میں مشغول رہے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اپنے عصر میں ان کو تشنگانِ علوم کے مرکز و مرجع کی حیثیت حاصل تھی۔ فقہی مسائل کی تحقیق و دریافت میں لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے اور ان کی بات کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔[۱]

مولانا محمد شاکر سورتی نے ۱۱۔ ذیقعدہ ۱۲۴۰ھ کو سورت میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

۶۶۔۔۔۔ مولانا محمدؐ شکور ہاشمی مچھلی شہری

صوبہ یوپی کا "مچھلی شہر" کسی زمانے میں اہلِ علم کا گہوارہ تھا۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس کے لائقِ تذکرہ حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد شکور جعفری ہاشمی مچھلی شہری گزرے ہیں جن کے والد کا نامِ نامی مولانا امانت علی جعفری ہاشمی تھا اور وہ اپنے دور کے فاضل آدمی تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیارؓ رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

محمد شکور کی ولادت ۱۲۱۱ھ کو مچھلی شہر میں ہوئی اور اپنے والدِ ماجد کے

---

[۱] نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۴۳، ۴۴۴ بحوالہ حدیقۂ احمدیہ۔

سایۂ عاطفت میں تربیت پائی۔ حصولِ علم کا آغاز اپنے نانا مولوی علی محمدؒ سے کیا جو علم و عمل اور فضل و کمال میں اونچے مرتبے کے مالک تھے۔ کتبِ درسیہ کی تکمیل انہی سے کی۔ اس کے بعد مزید تحصیل کے لیے دہلی کا رُخ کیا۔ دہلی میں اس زمانے میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا رشید الدین خاں، مولانا عبدالحی بکری برہان پوری اور مولانا فضل امام خیرآبادی کے سلسلہ ہائے درس جاری تھے، محمد شکور ان میں شامل ہوئے، تین سال دہلی رہے اور ان سب علمائے مشاہیر سے استفادہ کیا۔

فارغ التحصیل ہوئے تو ان کا شمار اپنے دَور کے معروف ترین علما میں ہونے لگا اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں ممتاز گردانے گئے۔ حدیث و فقہ میں بالخصوص عبور حاصل تھا۔ ان کی شہرتِ علمی اس زمانے کے ہندوستان کی انگریزی حکومت کے سرکردہ افراد تک پہنچی تو انھیں منصبِ افتا پر متمکن کر دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔ پھر فتح پور ہسوہ میں صدر الصدور کا عہدۂ جلیلہ ان کے سپرد ہوا۔ پچیس سال یہ خدمت انجام دی۔ ۱۲۶۰ھ میں اس منصب سے علیحدہ ہوئے۔ ملازمت کے دوران اور اس کے بعد تدریس کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا۔ ان کے معروف شاگردوں میں تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی بھی شامل ہیں۔ مولوی رحمان علی نے فتح پور ہسوہ میں بھی ان سے تعلیم پائی اور پھر جب وہ ملازمت سے علیحدہ ہو کر اپنے وطن مچھلی شہر چلے گئے تو اس وقت بھی یہ ان کی خدمت میں حاضر تھے اور ان کے عزیز اور لائق شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

دو مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل ہوا۔ مکہ مکرمہ کے دورانِ قیام میں مفتیٔ مکہ سیّد محمد حسین سے بھی اِستفادہ کیا۔

مولانا محمد شکور نے ترکِ ملازمت کے بعد مستقل طور پر اپنے وطن میں سکونت اِختیار کر لی تھی۔ ۱۲۶۰ھ میں ملازمت چھوڑی تو گھر میں بیٹھ گئے اور درس و تدریس کا

سلسلہ شروع کر دیا۔ وفات کے وقت تک کُل چالیس سال گھر میں رہے اور اس دوران میں حکومت انگریزی کی طرف سے باقاعدہ پنشن ملتی رہی۔ چالیس سال میں نوّے ہزار روپے پنشن کے ملے جو اس دور میں بہت بڑی رقم تھی۔

مندرجہ ذیل کتابیں ان سے یادگار ہیں:۔

۱۔ شرح مقامات ہندی۔

۲۔ حل ابحاث الفرائد۔

۳۔ شرح کنز الدقائق: فقہ کی مشہور درسی کتاب کنز الدقائق کی شرح۔

۴۔ ترجمہ طوطی نامہ (از نخشبی)

یہ تمام کتابیں عربی میں ہیں۔

اس عالم و فقیہ نے ۲۹۔ شوال ۱۳۰۰ھ کو مچھلی شہر میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔[۲۵]

۶۷ــــــ سیّد محمّد ظاہر حسنی بریلوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مقاماتِ علم وکمال اور ورع و تقویٰ میں رائے بریلی کو ایک عرصے سے خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں شاہ علم اللہ کے اخلاف میں سے ایک عابد و زاہد بزرگ سیّد محمد ظاہر حسنی تھے جو سیّد غلام جیلانی کے فرزندِ ارجمند تھے۔ ۱۱۹۸ھ کو اپنے آبائی وطن رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد اپنے عم محترم سیّد قطب الہدیٰ سے جو حضرت شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی کے تلمیذ تھے حصولِ علم کا آغاز کیا اور طویل مدّت تک ان سے مشغولِ استفادہ رہے۔ علومِ مروّجہ

---

[۲۵] تجلی نور ج ۲ ص ۱۲۵ تا ۱۲۷ ــ تاریخ شیراز ہند جون پور ۷۶۹، ۷۷۰ ــ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۲ ــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۴۴!

کی کچھ کتابیں مولانا ذوالفقار علی دیوی سے بھی پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے عازم لکھنؤ ہوئے اور مولانا عبدالجامع سیدن پوری کے حلقۂ درس میں شرکت کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علم طب کو مرکز التفات ٹھہرایا اور لکھنؤ کے بعض مشاہیر اطبا سے کتب طب پڑھیں اور اس میں مہارت پیدا کی۔ حصولِ علم سے فراغت کے بعد اپنے شہر رائے بریلی تشریف لے گئے اور سید احمد شہید بریلوی سے اخذ طریقت کیا۔ پھر حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ حج کے بعد وطن واپس آئے اور دعوت و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصہ ریاست رلواں میں مقیم رہے، وہاں ریاست کے دیوان، پانڈے دین بندہ بہادر کے بیٹوں کو تعلیم دینے پر مامور ہوئے۔ اس زمانے میں تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور وہ ان کے علم و فضل اور زہد و اتقا سے متاثر ہوئے۔

سید محمد ظاہر بے شک جید عالم، فقیہ کامل اور مردِ صالح تھے۔ بارعب، بلند اخلاق، متواضع، فصیح اللسان، سلیم العقل اور صحیح الفکر اہلِ علم تھے۔ اللہ نے ان کو حُسنِ صورت، عذوبت زبان اور اخلاقِ حسنہ کی دولت سے نوازا تھا۔ وعظ و خطابت، درس و تدریس، فتویٰ نویسی اور فصلِ خصومات ان کا مشغلہ تھا۔ ان کے اوصافِ گوناگوں کی بنا پر سب لوگ اُن کی عزّت کرتے تھے اور وہ سب سے احترام کے ساتھ پیش آتے تھے، اپنے شہر اور قرب و جوار میں انھیں قبولیت عامہ حاصل تھی۔ اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔ تصنیف و تالیف کا ملکہ بھی تھا۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:۔

۱۔ تحریم الحرام:۔ یہ قرآن مجید کی آیت وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ کی تفسیر ہے۔

۲۔ قاطع البدعۃ:۔ بدعات و رسوم کی تردید میں۔

۳۔ خیر المسالک:۔ سلوک و تصوّف کے بارے میں۔

۴۔ رسالہ در بیان وحدت الوجود و وحدت الشہود:۔ اس میں وحدت الوجود کا

رَدّ کیا گیا ہے۔

۵۔ رسالہ در بیان فتوحاتِ شام۔

۶۔ دیوان شعری، اُردو۔

اُوپر کی پانچوں کتابیں فارسی میں ہیں۔

ان کے شاگردوں میں مولانا محمد صادق غازی پوری مشہور مناظر اور تفسیر مظہر العجائب کے مصنف مولانا لطف اللہ لکھنوی اور ان (سید محمد ظاہر) کے بھانجے سید فخر الدین حسنی (صاحب نزہۃ الخواطر کے والد) شامل ہیں۔

سید محمد ظاہر نے ۱۲۷۸ھ کو رائے بریلی میں بعارضۂ فالج وفات پائی [۵۳]

۶۸ ـــــــ علامہ محمد عابد سندھی

تیرھویں صدی ہجری کے دیارِ سندھ کے علمائے مشاہیر میں علامہ محمد عابد بن احمد علی بن محمد مراد بن یعقوب حافظ بن محمود انصاری خزرجی سندھی کا اسمِ گرامی بہت مشہور ہے۔ وہ اپنے دور کے عالمِ اجل، محدث نامدار اور فقیہ کامل تھے۔ معقول و منقول کے جامع اور فقہ حنفیہ کے ماہر تھے۔ نسباً مدینہ منورہ کے قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے، جیسا کہ شجرۂ نسب سے ظاہر ہے، والد کا اسمِ گرامی شیخ احمد علی اور دادا کا محمد مراد تھا۔

محمد عابد سندھی کی ولادت ۱۱۹۰ھ کے لگ بھگ صوبہ سندھ کے ایک مشہور مقام "سیون" میں ہوئی۔ ان کے جدِّ امجد شیخ محمد مراد اپنے اہل و عیال کے پورے قافلے کے ساتھ ارضِ سندھ سے ہجرت کر کے سرزمینِ عرب میں چلے

---

[۵۳] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۶، ۱۹۷ ـــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۴۵، ۴۴۶۔

گئے تھے اور وہیں اقامت اختیار کرلی تھی ۔ اصحابِ علم وصلاح میں ان کا شمار ہوتا تھا اور شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب تھے۔

محمد عابد سندھی نے علوم مروّجہ کی اکثر کتابیں علاقۂ عرب میں اپنے عمِّ محترم شیخ محمد حسین سے پڑھیں ۔ پھر علمائے یمن و حجاز کی خدمت میں حاضر ہوئے ، جن میں علامہ سیّد عبدالرحمٰن بن سلیمان اہدل ، شیخ یوسف بن محمد زجاجی ، شیخ محمد طاہر سنبل ، مفتی عبدالملک قلعی اور شیخ صالح بن محمد عمری زیادہ مشہور ہیں اور ان کا شمار اس عہد کے اجل علمائے عرب میں ہوتا تھا ۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد علامہ محمد عابد سندھی نے یمن کے مقام "زبید" کو اپنا مسکن قرار دیا اور زیادہ عرصہ وہیں رہے ، یہاں تک کہ وہیں کے ساکنین میں سے گردانے گئے ۔ بعدازاں "صنعا" تشریف لے گئے اور وہاں اقامت اختیار کرلی ، زندگی کا بہت بڑا حصّہ وہیں گزارا ، اور وہاں کے امیر کے طبیب مقرر ہوگئے ۔ شادی بھی وہاں کے ایک وزیر کی بیٹی سے ہوئی ۔ وہاں کے عوام وخواص ان کی بوقلموں علمی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے ۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ امیر صنعا نے ایک مرتبہ ان کو بہت سے ہدایا و تحائف دے کر حاکم مصر کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا ۔ دربارِ مصر میں ان کی یہ سفارت آگے چل کر ان کی عظمت وشہرت کا باعث بنی اور وہ ایک اُونچے مقام پر فائز ہوئے ۔

مصر میں طابہ کے محلات اور باغات ان کے لیے بالخصوص وجہ کشش تھے اور ان کی خوشبو اور مہک انھیں اپنی طرف کھینچتی تھی ۔ چنانچہ ایک دن وہاں گئے تاکہ اس کے قرب وجوار میں اپنے لیے کوئی جگہ تلاش کریں اور وہاں سکونت اختیار کرکے علم وحکمت کے موتی بکھیریں ۔

اس نواح میں وہ ایک عرصے تک اقامت گزیں رہے اور درس و تدریس اور وعظ وارشاد کے ذریعے وہاں کے لوگوں کی اصلاح کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرائے رکھا ۔ لیکن وہاں کے لوگ ان کی مخالفت پر اُتر آئے اور ان کی تبلیغِ دین

اور اشاعتِ اسلام کی کوششوں کے خلاف کمربستہ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مجبوراً اپنے اس پسندیدہ مقام سے خیمہ اکھاڑنا پڑا۔ اب وہ وہاں سے کوچ کر کے "حدیدہ" میں آ بسے۔ حدیدہ میں انھیں ایک اور دورِ ابتلا سے گزرنا پڑا۔

۱۲۲۴ھ کا واقعہ ہے کہ حسین بن علی حازمی جو کہ زیدی شیعہ تھے، حدیدہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ وہ اہلِ نجد کے شدید مخالف تھے۔ انھوں نے حکم دیا کہ اذان میں حی علیٰ خیر العمل کے الفاظ بڑھائے جائیں اور وہ الفاظ جو مسلمانوں کو ان کے اسلاف سے ورثے میں ملے ہیں، یعنی الصلوٰۃ خیر من النوم ترک کر دیے جائیں۔ وہ ان الفاظ کو بدعت قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ الفاظ حضرت عمر بن خطاب نے اپنے دورِ خلافت میں ایجاد کیے ہیں۔ لیکن لوگوں نے قاضی حسین بن علی کے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔

جب قاضی نے دیکھا کہ لوگ ان کا حکم ماننے کو تیار نہیں اور وہ اس کو غلط قرار دیتے ہیں تو وہ غصے سے بے قابو ہو گئے اور سختی پر اتر آئے۔ انھوں نے چالیس آدمیوں کو جنھیں وہ خطرناک سمجھتے تھے، گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ علامہ محمد عابد سندھی کو بھی ان کے ساتھ حوالۂ زندان کر دیا گیا۔ علامہ سندھی اور ان کے ساتھیوں پر اس قدر مظالم ڈھائے کہ ان کی گردنوں میں لوہے کے طوق ڈال دیے اور اُن کے لیے بیٹھنا اُٹھنا اور چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ متواتر چھ دن ان کو اسی حالت میں رکھا گیا۔ پھر سب کو چھوڑ دیا، لیکن علامہ محمد عابد کو نہیں چھوڑا، ان کو قاضی حسین بن علی کے حکم کے مطابق شدید مارا پیٹا گیا۔ بالآخر انھیں حدیدہ سے نکال دیا گیا۔

اس کے بعد وہ اپنے آبائی وطن سندھ آئے اور وہاں کے ایک مقام "نواری" میں قیام پذیر ہوئے، چند روز وہاں رہے، پھر ذہن میں بلادِ عرب کا شوق موجزن ہوا، اور ادھر کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اب مدینہ منورہ

میں اقامت اختیار کی اور نہایت اکرام و احترام کے ساتھ اس بلدۂ طیبہ میں مقیم ہوئے۔ والئ مصر کی طرف سے علمائے ملک کی صدارت کے منصب پر فائز کیے گئے اور انتہائی عزت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اب اللہ کی عبادت، اتباع سنت، صبر و استقامت، نصح امت، اشاعتِ دین، لوگوں سے رأفت و شفقت کا برتاؤ کرنے اور نشرِ علوم کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا، ہر لمحہ اسی میں مشغول رہتے اور یہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

علامہ محمد عابد سندھی کا تذکرہ البدر الطالع میں قاضی محمد بن علی شوکانی نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ محمد عابد سندھی اپنے چچا کی معیت میں بندرگاہ حدیدہ پہنچے، ان کے چچا علم طب میں بہت مشہور تھے۔ شیخ محمد عابد بھی طبابت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں صرف و نحو، فقہ حنفیہ، اصول فقہ اور دیگر علوم میں مہارت حاصل تھی۔ علم طب میں شہرت و ناموری کی وجہ سے حاکم وقت امیر منصور نے ان کو حدیدہ سے خاص طور پر بلایا اور بہت سے لوگوں نے ان سے علاج کرایا اور صحت یاب ہوئے۔

قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ ۱۲۱۳ھ میں محمد عابد حدیدہ سے ان کے پاس صنعا آئے اور ان سے ہدایۃ الابہری اور اس کی شرح میبذی پڑھی۔ باوجود اس کے کہ کتاب کے مباحث بہت مشکل اور دقیق ہیں، جو بڑے بڑے علما کی سمجھ میں بھی نہیں آتے، لیکن وہ ہر بحث کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

پھر اسی سال شوال ۱۲۱۳ھ میں وہ حدیدہ واپس ہوئے اور امیر حدیدہ نے ان کو نہایت اعزاز و اکرام کا مستحق گردانا۔ ان کے لیے خاص وظیفہ مقرر کیا اور خلعت عطا کی۔ بہت سے عطیات و تحائف بھی دیے۔ پھر ان کی آمد و رفت صنعا میں بھی رہی۔ زمانۂ منصور میں بھی وہ کئی دفعہ صنعا آتے۔ متوکل باللہ کے عہد میں بھی ان کا وہاں آنا جانا رہا۔ امیر مہدی کے دور میں بھی وہ متعدد مرتبہ وارد صنعا ہوئے۔

مہدی کے نزدیک تو وہ اس قدر لائقِ اعتماد تھے کہ ۱۲۳۲ھ کو اس نے ان کو محمد علی پاشا کے دربار میں اپنے خاص نمائندے کی حیثیت سے تحائف دے کر مصر بھیجا۔ جب مصر سے واپس آئے تو کہا کہ مصر میں علم ختم ہو چکا ہے، صرف تقلید اور تصوّف کی باتیں باقی رہ گئی ہیں، لوگ فکر اور اجتہاد کی دولت سے محروم ہو گئے ہیں۔

الیانع الجنی میں شیخ محسن بن یحییٰ ترہٹی رقم طراز ہیں کہ عادات و اطوار اور اخلاق و کردار کی بلندی میں شیخ محمد عابد اپنے زمانے کے معروف ترین لوگوں میں سے تھے۔

علامہ محمد عابد سندھی تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور کئی مبسوط اور مختصر کتابیں ان سے یادگار رہیں جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ المواہب اللطیفہ علیٰ مسند الامام ابی حنیفہ:۔ یہ صرف حصکفی کی روایت پر مشتمل ہے۔

۲۔ طوالع الانوار علیٰ الدر المختار:۔ یہ اپنے موضوع کی نہایت جامع کتاب ہے، جس میں مذہب امام ابو حنیفہ کے فروعی مسائل اور فتوے بیان کیے گئے ہیں۔

۳۔ شرح تیسیر الوصول الیٰ احادیث الرسول:۔ یہ ابن الربیع حافظ شیبانی کی کتاب کی شرح ہے، جو کتاب الحدود تک ہے۔

۴۔ حصر الشارد فی اسانید محمد عابد:۔ یہ اسانید کے بارے میں ایک مبسوط و مفصل کتاب ہے جو بندرگاہِ مخا میں، ماہِ رجب ۱۲۴۰ھ کو مکمل ہوئی۔

۵۔ شرح بلوغ المرام:۔ منقول ہے کہ علامہ سندھی نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی مشہور کتاب "بلوغ المرام" کی شرح لکھنی شروع کی تھی لیکن اُسے مکمل نہ کر پائے۔

ان کتابوں کے علاوہ مختلف علوم و فنون سے متعلق انھوں نے اور بھی

کئی کتابیں تصنیف کیں۔
وہ عربی کے بہت بڑے شاعر بھی تھے۔
علامہ محمد عابد سندھی نے پیر کے دن ۱۷ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں باب عثمان کے سامنے دفن کیے گئے[۵۴]

۶۹ — سید محمد عسکری امروہوی

امروہہ، ہندوستان کے صوبہ یو پی کا وہ شہر ہے جس میں بہت سے شیعہ علما و فقہا نے جنم لیا اور علم و ادراک میں شہرت حاصل کی تیرھویں صدی ہجری میں جو شیعہ اہلِ علم امروہہ میں پیدا ہوئے، ان میں ایک بزرگ سید محمد عسکری حسینی نقوی ہیں، جن کے والد کا اسمِ گرامی سید محمد سیادت اور دادا کا محمد عبادت تھا۔ اپنے دور اور علاقے کے عالم اور فاضل شخص تھے۔

سید محمد عسکری کی ولادت امروہہ میں ہوئی اور وہیں نشو و نما پائی۔ ان کے والد سید محمد سیادت اس عہد کے نامور علما میں سے تھے، محمد عسکری نے ابتدائی تعلیم والد ہی سے حاصل کی اور شیعی فقہ کا حصول بھی انہی سے کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے عازم لکھنؤ ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ کے شیعہ علما میں سے سید محمد بن دلدار علی مجتہد لکھنوی اور ان کے بڑے بھائی سید حسین کا بہت شہرہ تھا اور ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ سید محمد عسکری ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں بھائیوں سے خوب استفادہ کیا۔

جب فارغ التحصیل ہو گئے تو واپس اپنے وطن امروہہ آئے اور والد کی وفات کے بعد وہاں کے شیعہ حضرات کی نماز پنجگانہ کی امامت اُن کے سپرد ہوئی تدریس و فتا

---

[۵۴] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۲۷ — الیانع الجنی — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۲ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۴۶ تا ۲۴۴ — ابجد العلوم ج ۳ ص ۱۷۰ — حدائق الحنفیہ ص ۴۷۳

کی ذمے داریاں بھی انھیں سونپی گئیں۔ چونکہ مروّجہ علوم میں دسترس رکھتے تھے اور بالخصوص فقہِ شیعہ میں ادراک حاصل تھا، علاوہ ازیں آبا و اجداد سے ایک مذہبی منصب پر فائز چلے آ رہے تھے، لہٰذا بہت جلد امروہہ اور اس کے گرد و نواح کے شیعہ حضرات کا مرجع قرار پا گئے۔ وہاں کے اصحابِ تشیع کے امام بھی تھے، فتویٰ نویسی بھی کرتے تھے اور طلبا کو درس بھی دیتے تھے۔ اپنے حلقے میں بڑی عزت و تکریم کے حامل تھے اور ہر اعتبار سے قدر و منزلت رکھتے تھے۔

سیّد محمد عسکری حسینی نقوی نے ۱۲۸۹ھ کو امروہہ میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[۵۵]

۷۔ حافظ محمد عظیم پشاوری

تیرھویں صدی ہجری کے علمائے پشاور میں حافظ محمد عظیم کا نام نامی لائقِ تذکرہ ہے۔ وہ اپنے عہد اور علاقۂ پشاور کے عالم نبیل، فاضل جلیل اور واعظِ بے عدیل تھے۔ ظاہری و باطنی کمالات کے جامع اور صاحبِ کشوف و کرامات تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدائے عمر میں بہت غبی اور کند ذہن تھے۔ کوئی چیز یاد نہ رہتی تھی اور مکتب سے بھاگ آتے تھے۔ ایک روز حسبِ معمول مکتب سے بھاگ کر آئے تو والدین کے خوفِ عتاب سے گھر میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی اور رات بھر مکان کی دیوار کے بیرونی حصے کے پاس کھڑے روتے رہے۔ منقول ہے کہ اسی حالت میں کھڑے تھے کہ حضرت خضر کی زیارت ہوئی اور انھوں نے آپ کے لیے دعا کی۔ اس کے بعد ذہن کھل گیا اور تھوڑی ہی مدت میں علومِ نقلیہ و عقلیہ سے فارغ ہو گئے۔

حافظ محمد عظیم اپنے دور کے بہت بڑے فقیہ، جلیل القدر عالم اور

۵۵؎ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۵۱؎

بے مثال واعظ تھے۔ پشاور اور اس کے نواح کے لوگ مسائل فقہی وغیرہ میں انہی سے رجوع کرتے تھے۔ عربی، فارسی، پشتو اور پنجابی کے ماہر تھے اور ان تمام زبانوں میں نہایت مؤثر وعظ کہتے تھے۔ جو شخص ان زبانوں میں سے کوئی زبان بولتا، اُسی زبان میں اس سے بات کرتے اور مسائل سمجھاتے۔

حافظ محمد عظیم پشاوری بصارت سے محروم تھے، لیکن اللہ نے ان کو بے پناہ بصیرت سے نوازا تھا اور ان کے فہم و فراست اور علم و عرفان کی وجہ سے لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ علمائے وقت میں بھی انتہائی قدر و منزلت کے مالک تھے۔

پشاور کے اس ممتاز عالم اور فقیہ نے ۱۲۷۵ھ کو وفات پائی اور بے شمار لوگ ان کی نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔ جنازے میں اس بے پناہ ہجوم کو دیکھ کر پشاور کے لوگ حیران ہوتے تھے کہ اتنے آدمی کہاں سے آئے اور انھیں حافظ محمد عظیم کی وفات کا کیسے علم ہوا۔ جنازے میں ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لیے پولیس کی اچھی خاصی نفری وہاں موجود تھی۔[۵۶]

۷۱ — مولانا محمّد علی بھیروی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں بہت سے دیہات اور قصبات کو علما و فقہا کے مراکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان دیہات میں ایک مقام "بھیرہ" ہے جو اس نواح میں اچھا خاصا گاؤں تھا۔ بھیرہ میں تیرھویں صدی ہجری میں جو اہل علم نمایاں ہو کر اُبھرے، ان میں ایک بزرگ مولانا محمد علی تھے، جن کے والد کا اسمِ گرامی عبدالحکیم اور دادا کا ابوالغوث

---

[۵۶] حدائق الحنفیہ ص ۴۷۸، ۴۷۹ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۰۲، ۲۰۳ — نزہتہ الخواطر، ج ۷ ص ۴۵۱۔

تھا۔ محمد علی بھیروی اپنے دور کے صوفی اور عبادت گزار عالم تھے۔ فضل و صلاح کے اوصاف سے بہرہ مند تھے اور اعمالِ اعظم گڑھ کے معروف فقہا میں گردانے جاتے تھے۔

محمد علی کا مولد و منشا بھیرہ ہے اور یہیں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصولِ علم کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور اپنے گرد و نواح کے اساتذہ سے تحصیل کی۔ اس زمانے میں مدراس میں بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی کا غلغلۂ درس بلند تھا اور بہت سے علما و طلبا ان سے فیض حاصل کر رہے تھے۔ محمد علی نے مدراس کا رُخ کیا اور بحر العلوم کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہو گئے۔ ان سے خوب استفادہ کیا۔

اس کے بعد عازم حرمین شریفین ہوئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا، تین سال مدینہ منورہ میں مقیم رہے اور حرمین کے اساتذہ و مشائخ سے علم حدیث پڑھا۔ بعد ازاں واپس وطن آئے اور پورے تنتیس [۳۳] سال بعد اپنے گاؤں بھیرہ میں داخل ہوئے۔ پھر گھر سے باہر نہیں نکلے اور تمام عمر بھیرہ ہی میں رہے۔ امیر مدراس ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ جب مستقل طور پر بھیرہ میں سکونت اختیار کر لی تو امیر مذکور نے ان کو باقاعدہ ماہانہ وظیفہ دینا شروع کر دیا تھا اور وہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ بلاشبہ مولانا محمد علی بھیروی اپنے عصر اور علاقے کے جلیل القدر عالم اور بلند مرتبہ فقیہ تھے۔[۵۶]

۷۲ — مولانا محمد علی صدر پوری

مولانا محمد علی بن رمضان علی صدر پوری اپنے دور کے شیخ و فاضل اور نہایت صالح و متدین عالم تھے۔ طبیعت موزوں پائی تھی اور اچھے شاعر تھے۔

---

۵۶ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۴ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۵۲، ۴۵۳

صدر پور ایک گاؤں ہے جو ملیح آباد سے متصل مضافاتِ لکھنؤ میں واقع ہے، وہیں تیرھویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے میں محمد علی پیدا ہوئے حصولِ علم کے لیے لکھنؤ کا عزم کیا، اس زمانے میں لکھنؤ میں مرزا حسن علی شافعی لکھنوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، محمدؒ علی نے ان کے اور دیگر اساتذۂ عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مرزا حسن علی سے کتبِ حدیث و تفسیر سَمَاعَۃً وَ قِرَأۃً پڑھیں۔ مولانا بشارت اللہ بہرائچی مجددی سے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت ہوئے۔

مولانا محمد علی صدر پوری نہایت متقی اور پرہیزگار عالم تھے، علومِ فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ اشاعت سُنّت اور ردّ بدعت میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ ۱۲۵۸ھ میں ٹونک تشریف لے گئے اور راس نواح کے امیر نواب وزیر محمد خاں بہادر نصرت جنگ کے ملازمین و مصاحبین میں شمولیت اختیار کی۔ امیر موصوف نے ان کو اپنے بیٹوں کی مجالست و مصاحبت پر مقرر کر دیا۔ پھر آخر عمر تک وزیر الملک نواب محمد علی خان بہادر صولت جنگ کے حلقۂ ملازمت میں رہے۔

اس نامور عالمِ دین نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام یہ ہیں:۔

۱ - آثارِ محشر:۔ یہ کتاب منظوم ہے اور آثار و احوال قیامت سے متعلق ہے۔

۲ - وقائع احمدی:۔ سیّد احمد شہید بریلوی کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔

۳ - ترجمہ حقیقۃ الاسلام:۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی کتاب کا ترجمہ۔

۴ - نصابِ گوھر:۔ منظوم

۵ - نصاب سلک گوھر۔

۶ - مصدر الفیوض۔

۷ - مفتاح المخازن۔

۸ - کنز المصادر۔

۹ - رکاز الھدایت۔ مسائلِ فقہ پر محیط ہے۔

۱۰ ۔ مثنوی تحفۃ الاخبار ۔

۱۱ ۔ مثنوی تحفۃ الاصحاب ۔

۱۲ ۔ قصائد در حمد و نعت ۔

۱۳ ۔ مثنوی عبرت افزا :۔ یہ ایک دین دار اور نیک بخت بیوی کا قصّہ ہے ۔

۱۴ ۔ عناقید الاثمار :۔

ان رسائل و کتب کے علاوہ بھی کچھ رسائل ان سے یادگار ہیں ۔

مولانا محمّد علی صدر پوری نے ۱۵ ۔ رجب ۱۲۸۹ھ کو نصف شب کے وقت وفات پائی[۵۸]

۷۳ ـــــــ مفتی محمّد عوض بریلوی

رائے بریلی صوبہ یوپی (ہندوستان) کا ایک مشہور شہر ہے جو صدیوں سے علما و فضلا کا مرکز اور صوفیا و اتقیا اور فقہا و صلحا کا مسکن چلا آ رہا ہے ۔ اس شہر میں بے شمار اہل کمال پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف ہندوستان ہی میں علم و فضل کی روشنی پھیلائی بلکہ اس برّصغیر سے باہر کے لوگوں کو بھی متاثر کیا ۔ یہی وہ شہر ہے جس کی خاک سے امیر المجاہدین سیّد احمد شہید اُٹھے اور اس برّصغیر کے لوگوں کے دلوں میں جہاد کی شمع روشن کی ۔ ان کا دور تیرھویں صدی ہجری کا ہے ۔

تیرھویں صدی ہی میں یہاں ایک بزرگ مفتی محمد عوض بریلوی پیدا ہوئے جو اپنے دور کے عالم و شیخ اور فقیہ نامدار تھے اور اس عہد کے مشاہیر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا ۔ ان کے والد مفتی درویش محمّد تھے جو اپنے علم و ادراک کی بنا پر رائے بریلی کے منصبِ افتا پر فائز تھے ۔ ان کی وفات کے بعد ان کے

---

[۵۸] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۳ ، ۲۰۴ ۔ نزہتہ الخواطر ج ۷ ، ص ۴۵۷ ، ۴۵۸ ۔

بیٹے مفتی محمد عوض نے باپ کی جگہ سنبھالی اور منصب افتا پر فائز ہوئے۔

مفتی محمد عوض جہاں افتا اور علم و فضل میں یگانہ تھے، وہاں زہد و عبادت اور صلاح و تقویٰ میں بھی اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ مسائل میں مرجع خلائق تھے اور دین کو سمجھنے کے لیے کثیر تعداد میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔

مفتی صاحب ممدوح نے ۱۲۲۰ھ کو وفات پائی[۵۹]

۷۴ ـــــ مولانا محمد غفران رام پوری

مولانا محمد غفران بن ملّا تائب آخون بن حافظ سعد اللہ خاں رام پوری۔

مولانا محمد غفران رام پوری جنھیں ان کے علم و فضل کی وجہ سے ملّا محمد غفران کہا جاتا تھا، اپنے دور کے بہت بڑے فقیہ اور عالم اجل تھے۔ یوپی (ہندوستان) کے مشہور شہر رام پور میں سکونت پذیر تھے اور نسلی اعتبار سے "ترابنی خیل" افاغنہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۶۰ھ کے لگ بھگ رام پور میں پیدا ہوئے اور اپنے عہد کے بعض ممتاز علما سے استفادہ کیا۔ ملا فقیر آخون افغانی کے شاگرد اور مرید تھے۔ ان سے علم فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ فقہ میں ان کے عبور و مہارت کا یہ عالم تھا کہ پورے ایک سو جز میں فقہی فتاوے تحریر کیے۔ یہ فتاوے "جنگ" کے نام سے موسوم ہیں اور قلمی صورت میں رام پور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔ لفظ "جنگ" کا اطلاق ایک بڑی اور مبسوط بیاض پر ہوتا ہے۔

ان کے والد ملّا تائب آخون بہت متقی اور پرہیز گار عالم تھے۔ متعدد لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا اور ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے۔ تائب کے معنی توبہ کرنے والا اور آخون کے معنی معلّم اور استاد کے ہیں اور واقعہ

---

[۵۹] نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۴۵۹ بحوالہ تاریخ فرخ آباد۔

ملّا نائب آخون اسم بامسمّٰی تھے۔

مولانا محمد غفران رام پوری کا وسیع حلقۂ درس تھا، بہت سے مشہور اور نامور طلبا و علما نے ان کے دامنِ تربیت میں رہنے کی سعادت حاصل کی اور اُن سے فیض پایا۔

اس زمانے کا ہندوستان تحقیق و تدقیق اور درس و تدریس کے میدان میں خاص شہرت رکھتا تھا اور جگہ جگہ علمائے ہند کے مدارس جاری تھے، جن میں دُور دُور سے آکر لوگ مستفید ہوتے تھے۔ مولانا محمد غفران رام پوری کا اسمِ گرامی بھی انہی بلند مرتبت اساتذہ و معلمین میں شامل ہے، جنھوں نے ہر حال میں علم کی شمع جلائے رکھی اور جو فضل و کمال میں یگانۂ دہر ہوئے یہ مسلکاً حنفی تھے۔

نواب صدیق حسن خاں نے مولانا محمد غفران رام پوری کا تذکرہ اپنی مشہور تصنیف ابجد العلوم میں کیا ہے اور انھیں "المعروف بروایت کش" لکھا ہے۔

مولانا محمد غفران نے سو سال کی عمر پائی اور ۱۲۶۰ھ میں جنّت کی راہ لی۔[۶۰]

۷۵۔ مولانا محمد غوث مدراسی

مولانا محمد غوث بن ناصر الدین بن نظام الدین بن عبداللہ مدراسی فقہی مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے اور اپنے دور کے مشہور شیخ اور عالم تھے اور ممتاز فقہائے ہند میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

مولانا محمد غوث مدراسی ۱۷۔ رمضان ۱۱۶۶ھ کو علاقہ آرکاٹ کے ایک مقام محمد پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد علم و فضل کی دولت سے آراستہ اور زہد و تقویٰ کی نعمت سے مالا مال تھے۔ محمد غوث نے ہوش سنبھالا تو اپنے جدِّ امجد مولانا نظام الدین سے تحصیل علم کا آغاز کیا اور کافی عرصہ ان سے اخذِ فیض

۶۰۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۵، ۲۰۶ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۴۵ — ابجد العلوم ج ۳ ص ۲۵۹

کرتے رہے۔ حدیث کی سند انہی سے لی۔

مولانا نظام الدین کی وفات کے بعد مولانا امین الدین صدیقی الوری کی خدمت میں گئے اور ان سے اکتسابِ علم میں مشغول ہوئے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں مولانا امین الدین صدیقی محمد پور میں فروکش تھے۔ پھر جب انھوں نے صوبہ مدراس کے ایک اور شہر رامنات کا عزم کیا تو محمد غوث ان کے ساتھ روانہ ہو گئے اور ان سے اکثر کتبِ درسیہ پڑھیں۔

پھر جب مولانا امین الدین صدیقی الوری انتقال کر گئے تو محمد غوث مدراس کو روانہ ہوئے۔ مدراس میں ان دنوں بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی کا سلسلۂ درس جاری تھا اور بہت سے طلبا ان سے حصولِ علم میں مشغول تھے۔ محمد غوث بھی بحر العلوم سے وابستہ ہو گئے اور ان سے اخذِ علم کرنے لگے اور پھر انہی سے سندِ فراغت حاصل کی۔

اسی زمانے میں انھوں نے مدراس کے نواب والا جاہ کے بیٹے امیر الامرا سے تقرب پیدا کیا اور اس کے لڑکے عظیم الدولہ کے اُستاد مقرر ہوئے امیر الامرا کی وفات کے بعد عدل و قضا کا محکمہ ان کے سپرد ہوا، اور انھیں احکام شرعیہ کی تنفیذ پر مامور کیا گیا۔ پھر جب والا جاہ کے بیٹے عمدۃ الامرا کا عہد آیا تو یہ اس خدمت سے معزول ہو گئے اور حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔ یہ ۱۲۱۳ھ کا واقعہ ہے۔

بعد ازاں جب عظیم الدولہ برسرِ اقتدار آیا تو مولانا محمد غوث پھر واپس مدراس آ گئے اور عظیم الدولہ نے انھیں منصبِ وزارت پر فائز کیا اور شرف الدولہ، شرف الملک غالب جنگ کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ یہ ۱۲۱۶ھ کا واقعہ ہے۔ ۱۲۲۳ھ تک اس عہدے پر متمکن رہے۔ اس کے بعد معزول کر دیے گئے۔

مولانا محمد غوث مدراسی شافعی نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام درج ذیل ہیں:-

۱- نثر المرجان فی رسم نظم القرآن:- دو جلدوں میں۔

۲۔ الفوائد الصبغیہ فی شرح الفرائض السراجیہ۔

۳۔ سواطع الانوار فی معرفۃ اوقات الصلوٰۃ والاسحار۔

۴۔ بسط الیدین لاکرام الابوین۔

۵۔ ارجوزۃ فی القاب سیّدنا علی رضی اللہ عنہ۔

۶۔ کفایۃ المبتدی فی الفقہ الشافعی :۔ شافعی فقہ سے متعلق۔

۷۔ زواجر الارشاد الیٰ اہل دار الجہاد۔

۸۔ تعلیقات علیٰ مختصر ابی شجاع۔

۹۔ تعلیقات علیٰ قطر الندی۔

۱۰۔ مسائل فی الفقہ الشافعی۔

۱۱۔ النصف الآخر من الکافی :۔ کافیہ کا اختصار۔

۱۲۔ حواشی علی القاموس۔

۱۳۔ الشافی شرح الکافی :۔ علم نحو کی مشہور کتاب کافیہ کی شرح جو نامکمل رہی۔

۱۴۔ النجم الوقاد شرح قصیدۃ بانت سعاد۔

۱۵۔ وسائل البرکات شرح دلائل الخیرات :۔ نامکمل رہی۔

۱۶۔ بحور الفوائد :۔ میراث کے بارے میں۔

یہ سولہ کتابیں عربی زبان میں ہیں ـــــ اب ذیل میں بارہ کتابوں کے نام درج کیے جارہے ہیں جو فارسی زبان میں ہیں :۔

۱۔ اظہار المفاخر فی مناقب السید عبد القادر۔

۲۔ الیواقیت المنثورہ فی الاذکار الماثورہ۔

۳۔ نسائم الاذہار فی الصلوٰۃ علیٰ سید الابرار۔

۴۔ ہدایۃ الغوی الی المنہج السوی :۔ یہ کتاب طب نبویؐ کے موضوع پر ہے۔

۵- خواص الحیوان -
۶- رشحات الاعجاز فی تحقیق الحقیقة والمجاز -
۷- رسالہ در رد خواجہ کمال الدین[۶۱] -
۸- آمدن -
۹- برھان الحکمہ ترجمہ ھدایة الحکمہ -
۱۰- الفتاوی الناصریہ فی فقہ الحنفیہ -
۱۱- خلاصة البیان فی شرح عقیدة عبد الرحمٰن (عبدالرحمٰن جامی مراد ہیں)
۱۲- زبدة العقائد -

فقہ احناف کے بارے میں ایک رسالہ اُردو زبان میں تحریر فرمایا۔ مولانا محمد غوث مدراسی بہت بڑے شافعی عالم و فقیہ اور مصنّف تھے۔ اُنھوں نے اتوار کے روز ۱۱ صفر ۱۲۳۸ھ کو وفات پائی[۶۲]

۷۶ ــــــ مولانا محمد قاسم نانوتوی

تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے اعاظم رجال میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ان کا شمار اپنے دور کے فحول علما میں ہوتا ہے۔ مروّجہ علوم کے تمام گوشوں پر ان کو عبور حاصل تھا اور معقول و منقول میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ادبیات، بیان و معانی، منطق و فلسفہ اور حساب و ریاضی وغیرہ ہر فن پر ان کی گہری اور عمیق نظر تھی۔

---

[۶۱] اس سے خواجہ کمال الدین قادیانی مراد نہیں ہے۔ ایک اور خواجہ کمال الدین مراد ہے۔
[۶۲] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۵۹، ۴۶۰۔

ولادت اور ابتدائی حالات

مولانا ممدوح صوبہ یوپی کے ضلع سہارن پور کے مردم خیز علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں کے ایک قصبہ "نانوتہ" کے باشندے تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ اسد علی اور دادا کا غلام شاہ تھا۔

آپ ماہِ شعبان (یا رمضان) ۱۲۴۸ھ میں بمقام نانوتہ پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام خورشید حسین ہے۔ ان کے والد شیخ اسد علی، مولانا مملوک علی نانوتوی کے ہم عمر تھے اور حصولِ علم کے لیے ان کے ساتھ دہلی بھی گئے تھے، لیکن ذہنی طور پر علم سے لگاؤ نہ تھا، اس لیے فارسی کی چند کتابوں کے علاوہ اور کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ دہلی سے واپس نانوتہ آگئے اور کاشت کاری میں مشغول ہو گئے ـــــ علم سے اس بیگانہ شخص کو اللہ تعالیٰ نے محمد قاسم کی صورت میں ایک ایسے گوہرِ شب چراغ سے نوازا جس کی ضیا پاشیوں سے ایک عالم مستنیر ہوا۔

حصولِ علم کا دور

اس بلند بخت عالمِ دین نے حصولِ علم کا آغاز اپنے مولد و مسکن نانوتہ میں کیا اور وہیں قرآن مجید پڑھا اور وہیں ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد انھیں دیوبند بھیج دیا گیا۔ دیوبند میں اس زمانے میں دو بزرگوں کی شہرت تھی، ایک مولوی مہتاب علی کی اور دوسرے شیخ نہال احمد کی۔ مولانا محمد قاسم نے ان دونوں حضرات سے حصولِ علم کیا۔ مولانا ممدوح کے نانا سہارن پور میں مقیم تھے اور وہاں وکالت کرتے تھے۔ مولانا دیوبند سے نانا کے پاس سہارن پور چلے گئے۔ وہاں مولوی محمد نواز سے عربی کی بعض ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۵۹ھ میں جب کہ محمد قاسم کی عمر صرف گیارہ بارہ برس تھی، نانا کا انتقال ہو گیا۔ یہ ان کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ تھا، لیکن تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور دیوبند اور سہارن پور کے بعض اساتذہ سے مصروفِ استفادہ رہے۔

اس زمانے میں دیارِ ہند کے معروف عالم مولانا مملوک علی دہلی[۶۳] کالج کے شعبۂ عربی کے صدر مدرس تھے۔ وہ ۲۔محرم ۱۲۶۰ھ کو محمد قاسم اور اپنے بیٹے محمد یعقوب کو دہلی لے گئے اور ۴۔محرم کو مولانا نانوتوی نے علم نحو کی مشہور کتاب "کافیہ" پڑھنا شروع کی۔ قیامِ دہلی کے دور میں اُنھوں نے علومِ متداولہ کی تکمیل مولانا مملوک علی اور مفتی صدر الدین سے کی اور علمِ حدیث کی تحصیل مولانا احمد علی سہارن پوری اور شاہ عبدالغنی مجددی سے کی۔ بعض اساتذہ سے حساب و ریاضی اور اقلیدس کی کتابیں پڑھیں۔ غرض علومِ مروجہ میں خوب مہارت پیدا کی اور ہر گوشۂ فن سے بہرہ ور ہوئے۔

مطبع احمدی سے تعلق ملازمت

مولانا احمد علی سہارن پوری ۱۲۶۲ھ میں حج کے بعد حجاز سے واپس آئے تو دہلی میں مطبع احمدی قائم کیا۔ مولانا نانوتوی نے طالب علمی کے زمانے میں مطبع احمدی سے تعلق ملازمت اختیار کر لیا تھا اور کتبِ حدیث کی تصحیح کا کام اُن کے سپرد تھا۔ غالباً اسی زمانے میں انھوں نے مولانا احمد علی سے سننِ ابوداؤد پڑھی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اس زمانے میں مولانا نانوتوی کے ہم درس تھے جو چار سال حصولِ تعلیم کے لیے دہلی میں مقیم رہے اور ۱۲۶۵ھ میں فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن گنگوہ واپس تشریف لے گئے۔ ۱۲۶۵ھ کے لگ بھگ مولانا نانوتوی نے بھی مروجہ تعلیم مکمل کر لی تھی۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

---

[۶۳] دہلی کالج دراصل "مدرسہ غازی الدین" کا نام ہے۔ یہ مدرسہ نظام الملک آصف جاہ اول کے والد غازی الدین فیروز جنگ (متوفی ۱۲۱۲ھ) نے دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر قائم کیا تھا۔ مدرسے کی عمارت کے ساتھ ایک خوب صورت مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور قریب ہی مقبرہ بنوایا جہاں وہ خود دفن ہوئے۔ اس مدرسے کا دوسرا دور ۱۷۹۲ء میں شروع ہوا۔ ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا جسے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کی مشہور درس گاہ سمجھا جاتا تھا۔

مطبع احمدی سے مولانا نانوتوی کا تعلقِ ملازمت کب تک قائم رہا؟ اس کے متعلق یقینی طور سے تو کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) کے انقلاب تک یہ مطبع دہلی میں قائم رہا، غالب گمان یہ ہے کہ اسی وقت تک مولانا نانوتوی اس سے منسلک رہے۔

دہلی میں سلسلۂ تدریس

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا نانوتوی نے دہلی میں کچھ عرصہ تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ اُن کے اُستاد تھے اور مدرسہ دارالبقا میں پڑھاتے تھے۔ مولانا نانوتوی کی خدمات بھی اُنھوں نے اس مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے حاصل کرلی تھیں لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مولانا ممدوح کا تعلقِ تدریس اس مدرسے سے کتنا عرصہ قائم رہا۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی مدّت ہی مدرسہ دارالبقا میں مدرس رہے۔ اس زمانے میں تدریس کے ساتھ ساتھ وہ مطبع احمدی میں بھی کتبِ حدیث کی تصحیح کے فرائض سرانجام دیتے تھے یعنی ایک ہی وقت میں تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا اور تصحیح کا بھی۔

صحیح بخاری کا تحشیہ

مولانا احمد علی سہارن پوری نے دہلی میں جو مطبع احمدی قائم کیا تھا، اُس کے ذریعے اُنھوں نے کتبِ حدیث کی نہایت قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔[۶۴] جیساکہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، مولانا محمد قاسم نانوتوی مطبع احمدی سے منسلک تھے اور مولانا احمد علی کے لائق تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ استاذِ محترم کے فرمان کے مطابق وہ کتبِ حدیث کی تصحیح پر مامور تھے۔ اُستاد اپنے اس شاگرد کی قابلیت اور حدیث سے متعلق ان کی ژرف نگاہی سے بخوبی آگاہ تھے، چنانچہ صحیح بخاری کے آخری پانچ پاروں کی تحشیہ نویسی کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔

۶۴ـ مولانا احمد علی سہارن پوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری جلد اوّل ص ۷۷ تا ۸۴۔

بعض حضرات علما نے جو مولانا نانوتوی کی صلاحیتوں سے واقف نہ تھے، اس پر اعتراض کیا اور مولانا احمد علی سے کہا کہ ان پانچ پاروں کے بعض مباحث نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور نوجوان محمد قاسم بطریق احسن اس سے عہدہ برآنہ ہوسکیں گے۔ لیکن مولانا احمد علی اپنی رائے پر قائم رہے اور یہ کام اپنے اسی شاگرد سے کرایا۔ جب تحشیہ مکمل ہوگیا تو ان حضرات کو دکھایا گیا اور انھوں نے اس کی بے حد تحسین کی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا احمد علی صاحب نے تحشیۂ بخاری میں ابتدا ہی سے مسائل میں مذہب حنفیہ کی تائید کا التزام کیا تھا اور آخری پانچ پاروں میں جو مولانا نانوتوی کے سپرد کیے گئے تھے، اس قسم کے مقامات آتے ہیں، جہاں امام بخاری نے مذہب حنفیہ کے بعض مسائل کو حدیث کی رُو سے محلِ اعتراض ٹھہرایا ہے۔ جو حضرات مولانا نانوتوی کو یہ کام تفویض کرنے پر معترض تھے، ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مولانا نانوتوی اس انداز سے یہ فریضہ انجام نہیں دے سکیں گے، جس انداز سے مولانا احمد علی آغاز سے دیتے آئے ہیں۔ لیکن مولانا نانوتوی اس باب میں اُستاد کے نقشِ قدم پر چلے اور اسی اسلوب سے تحشیہ لکھا جس اسلوب سے استادِ مکرم شروع سے لکھتے آئے تھے، اور بلاشُبہ ایک نوجوان اور اس میدان میں بظاہر نووارد کے لیے یہ بہت مشکل مرحلہ تھا جو انھوں نے استادِ محترم کے حسبِ منشا بطریق احسن طے کیا اور اس میں اپنے مسلک کی پوری ترجمانی کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ۱۱ مئی کو شروع ہوئی تھی۔ اس سے تین چار ماہ بعد سہارن پور کے ایک انگریز حاکم مسٹر سپنکی (SPANKIE) نے سہارن پور اور اس کے نواح میں مسلمانوں پر شدید مظالم ڈھائے، جس سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوگیا۔ اشتعال کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) کے رئیس قاضی عنایت علی کے بھائی قاضی عبدالرحیم اپنے چند احباب کی معیت میں کسی کام سے سہارن پور گئے تو وہاں کے ایک ہندو نے جو کا تستھ تھا مسٹر سپنکی

کے ہاں جا کر کہا کہ یہ لوگ ہاتھی خریدنے کے لیے آئے ہیں، ہاتھی خرید کر دہلی جائیں گے اور وہاں انگریزوں کے خلاف جہاد کریں گے۔ مسٹر سپنکی نے ان کو بلایا اور سہارن پور میں ان کی آمد کے بارے میں حقیقت حال معلوم کرنا چاہی لیکن ان لوگوں کے جواب اس کے نزدیک قابلِ اطمینان نہ تھے۔ اس پر قاضی عبدالرحیم اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس سے تھانہ بھون، دیوبند اور دیگر قصبات و دیہات میں انگریزوں کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد ضامن، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ حضرات نے تھانہ بھون میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ اس مجلس میں مولانا محمد احسن نانوتوی بھی شامل تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ کو جہاد نہیں سمجھتے تھے اور انگریزوں کے نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ اس مجلس کے شرکا میں سے مولانا شیخ محمد تھانوی[۶۵] نے جہاد کے خلاف اظہارِ رائے کیا اور فرمایا کہ "جب قاضی عنایت علی عام جنگ کے دوران خاموش رہے

---

[۶۵] مولانا شیخ محمد، تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر، یوپی) میں ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام ظہور احسن ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن تھانہ بھون میں پائی، قرآن مجید بھی وہیں حفظ کیا۔ اس کے بعد دہلی گئے اور مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم دینیہ کی تحصیل کی اور سند سے مفتخر ہوئے۔ حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی کے حلقۂ بیعت میں شمولیت کی۔ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں وفات پائی۔ مولانا ممدوح کے مفصل حالات ان کے رسالہ "تحقیق وحدت الوجود والشہود" کے ساتھ مولوی ثناء الحق (ایم۔ اے) نے شائع کیے ہیں ——— مولانا شیخ محمد تھانوی کی تصنیفات میں ارشاد محمدی، بیاض محمدی، انوار محمدی اور دفتر ہفتم مثنوی مولانا روم شامل ہیں۔

اور اس مجلس حاضرین میں سے بھی کسی نے اس کو جہاد سمجھ کر اس میں حصّہ نہیں لیا تو اس وقت جب کہ انتقام کا جذبہ کار فرما ہے، اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جا سکتا ہے[۶۶]۔

مولانا محمد احسن نے مولانا شیخ محمد تھانوی کی تائید کی۔ اس پر اُن کے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی نے مولانا محمد احسن کو ڈانٹا۔ آخر فیصلہ جہاد کے حق میں ہوا، مولانا محمد احسن نانوتہ آ گئے[۶۷]۔

تھانہ بھون کی مجلس مشاورت کے بعد ان حضرات نے حاجی امداد اللہ صاحب کو امیر جہاد مقرر کیا اور شاملی (ضلع مظفر نگر) میں انگریزوں کے خلاف میدانِ جہاد میں اُترے۔ حافظ محمد ضامن، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی نے خوب دادِ شجاعت دی۔ حافظ محمد ضامن نے شاملی کے میدانِ جنگ میں مرتبۂ شہادت پایا اور دیگر حضرات شدید مقابلے کے بعد واپس آ گئے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد حالات نے انگریزوں کے حق میں پلٹا کھایا تو اُنھوں نے مسلمانوں سے سخت انتقام لیا۔ حاجی امداد اللہ ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) کو ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے، مولانا رشید احمد گنگوہی چھ مہینے جیل میں بند رہے، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے، مولانا محمد منیر نانوتوی اور مولانا محمد مظہر نانوتوی روپوش ہو گئے (میدانِ جنگ میں مولانا محمد مظہر نانوتوی کے ٹخنے میں گولی لگی تھی، اور وہ زخمی ہو گئے تھے) قاضی عنایت علی پہاڑوں میں جا کر چھپ گئے۔

---

[۶۶] وحدت الوجود والشہود (ص، ۵۱) میں مولانا شیخ محمد تھانوی کا یہ ارشاد منقول ہے ——— نیت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے بظاہر تو اس کو جہاد کا درجہ نہیں درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

[۶۷] "مولانا محمد احسن نانوتوی" از ڈاکٹر محمد ایوب قادری) صفحہ ۴۵

روپوشی اور حج بیت اللہ

یہ زمانہ نہایت خطرناک تھا اور ہر شخص آزمائش و ابتلا کا شکار تھا۔ اس دورِ پُر خطر میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ مولانا نانوتوی نے وارنٹ گرفتاری کے بعد انتہائی احتیاط سے کام لیا، تین دن تو وہ ایک گھر میں بند رہے، اس کے بعد مختلف علاقوں اور قصبات و دیہات میں گھومتے رہے، اس لیے کہ دشمن تعاقب میں تھا اور اس کے ذرائع تلاش و جستجو بہت وسیع تھے۔ ہر مقام پر مخبر بیٹھے تھے اور کسی ایک جگہ پر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنا ہی قرینِ مصلحت تھا۔ بعض مقامات پر خود انگریزی پولیس کے افسروں سے جو مولانا کی تلاش میں تھے، مولانا کی گفتگو بھی ہوئی، بلکہ دیوبند کی مسجد چھتہ میں آکر تو خود انھوں نے مولانا ہی سے پوچھا کہ "مولانا محمد قاسم کہاں ہیں؟" انھوں نے دو قدم آگے بڑھا کر اس جگہ کی طرف جہاں وہ پہلے کھڑے تھے، اشارہ کرتے ہوئے کہا، "ابھی یہیں تھے۔ دیکھ لیجیے۔" یہ ایک بہت بڑے حاضر دماغ اور حاضر جواب سیاست دان ہی کا جواب ہوسکتا ہے، ورنہ عام لوگ تو ایسے مواقع پر ہوش کھو بیٹھتے ہیں اور تلاش کنندگان ان کے چہرے کے آثار ہی سے سمجھ لیتے ہیں کہ اصل شخص یہی ہے اور اسے پکڑ لیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ ان کے برادر نسبتی شیخ نہال احمد انھیں اپنے گاؤں چکوالی لے گئے جو نانوتہ اور دیوبند کے درمیان واقع ہے۔ پولیس کے لوگ ان کی تلاش میں وہاں پہنچے تو ان کے لیے خود ہی چائے تیار کی اور پھر خود ہی مولانا محمد قاسم کی "تلاش" میں نکل کھڑے ہوئے اور گرفتاری سے بچ گئے ——— یہ ان کی فہم و فراست کی انتہا تھی، بروقت کوئی بات سوجھ جانا اور اپنے آپ کو چاروں طرف پھیلے ہوئے خطرے سے بچا لینا، بہت بڑی بات ہے۔ ان کی اس قسم کی باتیں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے بھی تحریر فرمائی

ہیں ۶۸؎ مولانا گیلانی مرحوم طویل الذیل عالم تھے اور ان کا اندازِ نگارش کچھ اور ہی قسم کا ہے۔

مولانا نانوتوی بہر حال انسان تھے اور اپنے دور کے بہت بڑے انسان تھے اور ہر انسان اپنے آپ کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، مولانا نے بھی یہ کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے۔

واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نانوتوی کم و بیش ساڑھے تین سال روپوش رہے اور یہ اُن کے لیے انتہائی آزمائش کا زمانہ تھا جو انھوں نے مختلف مقامات میں گزارا۔ ان مقامات میں بوڑبہ، گمنھلہ، لاڈوہ، پنجلاسہ، دیوبند، نانوتہ اور چکوالی وغیرہ مقامات شامل ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں وہ کتنی تکلیفوں سے دوچار ہوئے ہوں گے اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھاگ دوڑ میں انھیں کس قدر ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچی ہو گی۔ لیکن یہ سب تکلیفیں اور اذیتیں انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ یہ ان کی عظمت و عزیمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

روپوشی ہی کے دور میں ۱۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء) کو وہ اپنے وطن نانوتہ سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی ان کے رفیقِ سفر تھے۔ نانوتہ سے کراچی تک کا سفر انھوں نے مختلف ذرائع سے طے کیا اور پھر ساحلِ کراچی سے سرزمینِ حجاز کو روانہ ہوئے۔ یہ اس عظیم المرتبت عالم دین کا پہلا سفرِ حج تھا۔

اعلانِ معافی

۲۔ اگست ۱۸۵۸ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہِ راست ہندوستان پر ملکہ وکٹوریہ کے قبضے کا اعلان کیا گیا۔ اس سے دو مہینے

۶۸؎ سوانح قاسمی جلد دوم ص ۱۷۶ تا ۱۸۱

بعد یکم اکتوبر ۱۸۵۸ء کو الٰہ آباد میں لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کا وہ معافی نامہ پڑھ کر سنایا جس کی رُو سے ۱۸۵۷ء کے "غدر" میں حصّہ لینے والے "مجرموں" کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ جو لوگ اس ہنگامے میں شریک ہوتے تھے، حکومت انگریزی کی طرف سے ان کی گرفتاری کا اب کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا لیکن اس میں یہ استثنا بھی تھا کہ "جو لوگ انگریزی رعایا کے قتل میں شریک ہوئے انھیں رحم کا مستحق نہیں سمجھا جاتے گا۔"

علاوہ ازیں اس اعلان میں مرقوم تھا کہ:

۱۔ جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو۔

۲۔ یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں۔

۳۔ یا جنھوں نے ترغیب بغاوت دی ہو۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے اعلانِ معافی نامہ میں یہ الفاظ درج تھے کہ "ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہوگی، لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر، جن کے اعتبار سے وہ اپنی اطاعت سے پھر گئے، کاملِ غور کیا جائے گا۔"

بہرحال اس معافی نامہ کے مشتہر ہونے کے دو سال بعد ۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو مولانا نانوتوی اپنے وطن نانوتہ سے حج کے لیے روانہ ہوئے۔

حج سے واپسی

۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو مولانا نانوتوی حج بیت اللہ سے واپس وطن تشریف لائے۔ اب حالات کسی حد تک سازگار ہو چکے تھے اور ملک کی سیاسی فضا میں وہ تلخی باقی نہ رہی تھی جو کچھ عرصہ پہلے تھی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ قمری حساب سے ۱۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ کو وہ حج کے لیے نانوتہ سے روانہ ہوئے تھے اور کراچی کی بندرگاہ سے عزمِ حجاز کیا تھا، تقریباً ایک سال بعد ربیع الاوّل ۱۲۷۸ھ کے آخر میں واپسی ہوئی اور بمبئی کے

ساحل پر جہاز سے اُترے اور وہاں سے چل کر جمادی الاخریٰ تک نانوتہ پہنچے۔

حفظِ قرآن مجید

زمانۂ روپوشی اور ایامِ حج میں ایک بہت بڑا کام یہ ہوا کہ قرآن مجید حفظ کر لیا۔ رُوپوشی کا دور نہایت پریشانی کا دور تھا اور مستقل طور سے کسی ایک جگہ پر قیام کرنا ممکن نہیں تھا، حج کے دنوں میں بھی کسی ایک مقام پر بیٹھنا مشکل ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس زمانے میں مولانا کو حفظِ قرآن کی نعمت حاصل ہوگئی۔

مطبع مجتبائی میرٹھ کی ملازمت

حج بیت اللہ سے واپس آنے کے بعد مولانا نانوتوی نے مطبع مجتبائی میرٹھ میں ملازمت کر لی۔ یہ مطبع منشی ممتاز علی نے قائم کیا تھا جو شیخ امجد علی کے بیٹے تھے اور اپنے عہد کے مشہور خطاط تھے۔ منقول ہے کہ وہ فنِ خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے اور "نزہت رقم" ان کا لقب تھا۔ مولانا نانوتوی سے ان کے تعلقات پہلے ہی سے قائم تھے اور وہ مولانا کی علمی صلاحیتوں سے آگاہ تھے، اسی لیے ان کو اپنے اس مطبع میں ملازم رکھا اور کتابوں کی تصحیح وغیرہ کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اس سے قبل مولانا احمد علی سہارن پوری کے مطبع احمدی میں بھی مولانا نانوتوی یہ خدمت انجام دے چکے تھے اور اس فن کی نزاکتوں کا انھیں بخوبی علم تھا۔

دوسری مرتبہ حج کو روانگی

۱۲۷۸ھ سے ۱۲۸۵ھ تک سات سال مولانا نانوتوی مطبع مجتبائی میرٹھ سے بسلسلۂ تصحیح کتب وابستہ رہے۔ اس اثنا میں ان کی تمام تر توجہ اسی طرف منتقل رہی اور نہایت اہتمام اور ذمے داری سے اپنے مفوضہ فرائض انجام دیے۔ ۱۲۸۵ھ میں مولانا نانوتوی اور مطبع مجتبائی کے مالک منشی ممتاز علی حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا نانوتوی کا یہ دوسرا حج تھا۔ منشی ممتاز علی

بہ ارادۂ ہجرت ہندوستان سے حجاز گئے تھے، اس لیے انھوں نے مطبع مجتبائی ختم کر دیا تھا۔ لیکن مولانا نانوتوی حج کے بعد واپس وطن آ گئے۔

مطبع ہاشمی میرٹھ سے وابستگی

تصحیح وغیرہ کے کام میں مولانا نانوتوی نے پوری طرح مہارت پیدا کر لی تھی اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مطابع کے مالک ان کے کام سے متاثر تھے، لہٰذا دوسرے حج سے واپس آتے ہی میرٹھ پہنچے تو وہاں کے مطبع ہاشمی سے وابستگی اختیار کر لی اور کچھ عرصہ اس میں مصروفِ عمل رہے۔

علی گڑھ میں قیام

اسی اثنا میں مولانا عبدالجلیل علی گڑھی (جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کے خلاف دادِ شجاعت دیتے ہوئے علی گڑھ میں شہید ہو گئے تھے[۶۹]) کے فرزند گرامی قدر مولانا محمد اسماعیل (متوفی شوال ۱۳۱۱ھ) کو حدیث پڑھانے کی غرض سے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں نو مہینے ان کا قیام علی گڑھ میں رہا۔ تراجم علمائے حدیث ہند (صفحہ ۲۲۵) میں مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی لکھتے ہیں: مولانا (نانوتوی) علی گڑھ تشریف لاتے اور مولانا عبدالجلیل کے بیٹے (مولانا محمد اسماعیل) کو نو مہینے میں صحاح ستہ کا دورہ ختم کرا کے واپس چلے گئے، اس مدت کی اُجرت بجز نانِ جویں کے کچھ قبول نہ فرمائی۔

پھر مطبع مجتبائی میں

منشی ممتاز علی (جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا) ۱۲۸۵ھ میں ہجرت کے ارادے سے حجاز گئے تھے، لیکن اُنھوں نے وہاں اقامت اختیار نہیں کی۔ دوسرے سال ہی ہندوستان واپس آ گئے اور مطبع مجتبائی دہلی میں قائم کر لیا جو

---

[۶۹] مولانا عبدالجلیل علی گڑھی شہید کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری جلد دوم ص ۵۷ تا ۵۹)

"مطبع مجتبائی دہلی" کے نام سے مشہور ہوا، اس میں تصحیح کتب کے سلسلے میں انھوں نے مولانا نانوتوی کو بھی دہلی بلا لیا۔ اسی اثنا میں انھوں نے یہ مطبع پانچ سو روپے میں مولوی عبد الاحد کو فروخت کر دیا۔ مولانا نانوتوی کچھ عرصہ اس میں کام کرتے رہے۔ اس مطبع سے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم سے متعلق بے شمار کتابیں شائع ہوئیں اور کاغذ، کتابت، طباعت، صحت وغیرہ کے سلسلے میں ان کتابوں نے نہایت اہمیت حاصل کی۔

شمائل شریف کی اشاعت

۱۲۸۶ھ میں مطبع مجتبائی دہلی میں ایک شمائل شریف شائع ہوئی جس کی کتابت منشی ممتاز علی نے اور تصحیح مولانا نانوتوی نے کی۔ اس شمائل کے بارے میں مولوی عبد الاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی لکھتے ہیں۔

"خداوندا آپ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ شمائل شریف اب تیسری دفعہ اس مطبع مجتبائی دہلی میں چھپی۔ ایک دفعہ تو منشی ممتاز علی نزہت رقم مہاجر مکی نے اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھی اور قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند نے اس کی تصحیح فرمائی۔"

مولانا نانوتوی نے اس شمائل کی طباعت سے متعلق دو قطعاتِ تاریخ رقم کیے جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، پہلا قطعہ فارسی میں ہے۔

شمائل کز شرف دارد شرف بر حاصل کانہا
کہ ایں جا است بر جاں ست صد گونہ بلا زانہا
نوشت و طبع زو نزہت رقم ممتاز علی قاسم
حقیقت برد زاں گردید تعویذ دل و جانہا

دوسرا قطعہ تاریخ اردو میں ہے جو یہ ہے:۔

چھاپی وہ شمائل کہ اگر جان کے لب ہوں   بے ساختہ بول اٹھے کہ مرغوب چھپی ہے
میں نے بھی کہا مدح میں اور کیونکر نہ کہیے   کہتے ہیں تکرار عدد خوب چھپی ہے

۶۴۳

ایک راحت دل راحت دل پہ ہے مضاعف — کیا لکھی کیا عمدہ خوش اسلوب چھپی ہے
کیا کہنے حمائل کے بہت خوب ہی چھاپی — کیا کہنے ہیں پاکیزہ بہت خوب چھپی ہے
۱۲۸۶ — ۱۲۸۶

مطبع مصطفائی میں

مطبع مصطفائی منشی ممتاز علی نے حجاز سے واپس آکر دہلی میں قائم کیا تھا اور تصحیح کتب کے لیے انھوں نے مولانا نانوتوی کو بھی دہلی بلا لیا تھا۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کتنا عرصہ مطبع مصطفائی میں خدمات انجام دیتے رہے۔

بہر حال مولانا ممدوح نے علی الترتیب مطبع احمدی، مطبع مجتبائی، مطبع ہاشمی اور مطبع مصطفائی میں سالہا سال تک تصحیح کتب کا کام کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں۔ "معاشی جد و جہد سے آپ نے بہر حال اپنے آپ کو بے تعلق نہیں رکھا۔ مختلف قرائن و قیاسات کی بنا پر میرا اندازہ یہی ہے کہ ایک کم پچاس کی عمر گراں مایہ میں سے تقریباً چالیس انتالیس سال کی عمر تک آپ مذکورہ بالا مختلف مطابع یعنی احمدی، مجتبائی، ہاشمی، مصطفائی میں علی الترتیب تصحیح کی خدمات انجام دیتے رہے۔"[۴۹]

مولانا گیلانی کے اس متن کی تشریح یہ ہے کہ مولانا نانوتوی نے کل انچاس سال عمر پائی اور اس مختصر عمر میں سے چالیس انتالیس سال مختلف مطابع میں تصحیح کتب کی خدمت انجام دی ——— اس حساب سے انھوں نے نو دس سال کی عمر میں تصحیح کا کام شروع کر دیا تھا۔

واقعات کی رُو سے مولانا گیلانی کا یہ فرمان قرین صحت نہیں۔ مولانا نانوتوی کی ولادت ۱۲۴۸ھ میں ہوئی۔ محرم ۱۲۶۰ھ کو وہ (بارہ سال کی عمر میں) مولانا مملوک علی کے ساتھ حصولِ علم کے لیے دہلی گئے اور کافیہ پڑھنا شروع کیا۔ ۱۲۶۲ھ میں مولانا احمد علی سہارن پوری حج کے بعد حجاز سے واپس آئے اور

---

[۴۹] سوانح قاسمی، ج ۱ ص ۵۳۵

دہلی میں مطبع احمدی قائم کیا۔ اس کے بعد مولانا نانوتوی ان کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے اور ان سے سنن ابوداؤد پڑھی۔ ۱۲۶۵ھ کے پس و پیش میں وُہ فارغ التحصیل ہوئے جب کہ ان کی عمر سترہ برس کی تھی ــــــ اگر طالب علمی کے زمانے ہی میں مطبع احمدی سے تعلقِ ملازمت اختیار کر لیا ہو اور تصحیحِ کتب میں مشغول ہو گئے ہوں، جب بھی ۱۲۶۴ کے لگ بھگ انھوں نے یہ کام شروع کیا، اس حساب سے وہ کم سے کم اس وقت پندرہ یا سولہ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ ظاہر ہے ان کی قابلیت وصلاحیت سے متاثر ہو کر ہی مولانا سہارن پوری نے اس اہم ذمہ داری پر انھیں مامور کیا ہو گا۔ نو دس سال کی عمر کے بچّے کے سپرد اتنا اہم کام نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا نانوتوی بہت ذہین اور نہایت صاحبِ فراست تھے، تاہم جب تک متعلقہ کتابوں کے متون پر پوری نظر نہ ہو اس قسم کے بڑے کام پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں ہوتا۔

ماہانہ آمدنی

مذکورہ بالا مطابع سے اس اہم خدمت کی جو ماہانہ آمدنی مولانا نانوتوی کو ہوتی تھی، وہ چار پانچ روپے تھی[۱۷] موجودہ دور کے حساب سے اس کو "آمدنی" یا "تنخواہ" سے تعبیر کرنا آمدنی اور تنخواہ کا مذاق اُڑانا ہے۔ لیکن آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال قبل کے حالات کی رُو سے دیکھا جائے تو چار پانچ رپے فی الواقع اپنے اندر ایک وزن رکھتے تھے۔ زندگی سادہ تھی اور زمانہ بہت سستا تھا، پھر علمائے دین کے دلوں میں خلوص کا بے پناہ داعیہ کارفرما تھا اور وہ تھوڑے کو بہت سمجھنے کے عادی تھے۔ وہ کوئی کام پیسے کے لیے نہیں کرتے تھے، نیکی سمجھ کر کرتے تھے اور ان کے ذہن و قلب پر ہر آن خشیتِ الٰہی اور للٰہیت کا جذبہ طاری رہتا تھا۔

---

۱۷ سوانح قاسمی، ج ۱، ص ۵۳۸

دیوبند میں دارالعلوم کا قیام

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے اسلامی مدارس شدید نقصان سے دوچار ہوئے۔ متعدد علمائے دین کو انگریزوں نے پھانسیوں پر لٹکا دیا۔ بعض کو کالے پانی کی سزا دی گئی اور کچھ حضرات ملک سے ہجرت کر کے سرزمین حجاز میں جا بسے۔ ان نازک حالات میں چند علما و زعما نے جن میں مولانا فضل الرحمن، مولانا ذوالفقار علی، حاجی عابد حسین، مولوی مہتاب علی اور شیخ نہال احمد شامل تھے، ضلع سہارن پور کے مشہور مقام دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۷ء) کو دیوبند کی "چھتہ والی مسجد" میں انار کے درخت کے نیچے کھلے صحن میں اس مدرسے کا آغاز کیا گیا۔ اس مدرسے کے مہتمم یا سرپرست مولانا محمد قاسم نانوتوی کو مقرر کیا گیا۔ اس زمانے میں مولانا نانوتوی مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح کتب کا کام کرتے تھے۔ اس مدرسے کے سب سے پہلے طالب علم کا نام محمود تھا جنھوں نے بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے نام سے شہرت پائی اور اپنے عہد کے اکابر علمائے ہند میں شمار ہوتے اور پہلے مدرس کا نام ملا محمود تھا۔ حسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ استاد بھی محمود اور شاگرد بھی محمود۔!

سب سے پہلے جس شخص نے اس مدرسے کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے چادر پھیلائی اور جس نے سب سے پہلے چندہ دیا، اس شخصیت کا اسمِ گرامی حاجی عابد حسین تھا، جو مدرسے کے بانیوں میں سے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں تقریباً چار سو روپے جمع ہو گئے اور یہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔

اس سے چار دن بعد ۱۹ محرم کو ایک اشتہار چھپوا کر مدرسے کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ پھر طلبا نے اس مدرسے کی طرف اس کثرت سے رجوع کیا کہ پہلے ہی سال کے اختتام تک ان کی تعداد اٹھتر ہو گئی۔ ان میں بیرون ہند کے طلبا بھی شامل تھے۔ جیسے جیسے طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، مدرسین کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا تقرر صدر مدرس کی حیثیت سے کیا گیا۔ مدرسے کے قیام پر سات سال گزرے تھے کہ اس میں طلبا کی تعداد بہت

بڑھ گئی اور چھتہ والی مسجد میں اُن کے لیے قیام و تعلیم کا انتظام ممکن نہ رہا۔ چنانچہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) کو اُسے دیوبند کی جامع مسجد میں منتقل کر دیا گیا۔

نئی جگہ کی خرید اور سنگِ بنیاد

جامع مسجد میں مدرسے کی منتقلی پر تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ طلبا کی کثرت نے اسے بھی اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب مولانا نانوتوی نے اپنے رفقا کے سامنے مدرسے کے لیے آبادی سے باہر ایک وسیع عمارت تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور زمین کا ایک قطعہ خریدا گیا اور پھر ۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کو جمعۃ المبارک کے دن اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ علی الترتیب مولانا احمد علی سہارن پوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی عابد حسین اور مولانا محمد مظہر کاندھلوی نے ایک ایک اینٹ رکھی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے مادۂ تاریخ "اشرف عمارات" سے نکالا، جس سے ۱۲۹۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔ عمارت کی تعمیر کا آغاز آئندہ سال ہی سے ہوا، لہٰذا ۱۲۹۳ھ صحیح قرار پاتا ہے —— یہی وہ قطعہ اراضی ہے جہاں آج یہ درس گاہ قائم ہے اور جسے برِصغیر پاک و ہند کے ایک بہت بڑے دارالعلوم کی حیثیت حاصل ہے، اس سے بے شمار علما و فضلا فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور متعدد وجوہ سے اس نے تمام عالمِ اسلام میں شہرت پائی۔

تیسرا حج

مولانا نانوتوی نے پہلا حج ۱۲۷۷ھ میں کیا تھا، اس سفرِ حج میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ ۱۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء) کو نانوتہ سے روانہ ہوئے اور کم و بیش ایک سال بعد ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو واپس وطن آئے۔

دوسری مرتبہ ۱۲۸۵ھ کو قصدِ حج بیت اللہ کیا۔ ان دنوں وہ بصورتِ ملازمت مطبع مجتبائی دہلی سے وابستہ تھے اور اس مطبع کے مالک منشی ممتاز علی اس

حج میں ان کے رفیقِ سفر تھے۔ اس زمانے میں دیوبند کا مدرسہ قائم ہو چکا تھا اور مولانا اس کے نگران تھے۔ حج سے واپس آکر وہ میرٹھ کے مطبع ہاشمی میں کام کرنے لگے تھے۔

تیسری دفعہ وہ شوال ۱۲۹۴ھ کو عازمِ حجاز ہوئے اور حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ اس حج میں علمائے کرام کی ایک جماعت ان کے ساتھ تھی۔ حج کے بعد جدہ پہنچے تو ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ کو مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔

پادری تارا چند سے مناظرہ

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی عیسائی مبلغین اور پادری اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ پادری تو وہ تھے جو انگریزوں کے ہم رکاب ہو کر ان کے ملک انگلستان سے یہاں آئے اور کچھ وہ تھے جو ہندوستان ہی کے رہنے والے تھے اور انگریز پادریوں کی تبلیغ سے متاثر ہو کر ہو کر حلقہ بگوشِ عیسائیت ہوئے تھے اور انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ اقتدار میں ان کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں اور پھر جب حکومت براہِ راست تاج برطانیہ کے قبضے میں آئی تو اُن کی تبلیغی تگ و تاز نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ علمائے دین نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، تحریر و کتابت کی صورت میں بھی اور تقریروں اور مناظروں کی شکل میں بھی ۔۔۔ ان حضرات علما کی وسیع فہرست میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مولانا سید امیر حسن حسینی سہسوانی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ انہی حضرات میں بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نام نامی شامل ہے۔

اس زمانے میں پادری اس قدر بے باک ہو گئے تھے اور ان کی زبان اتنی دراز ہو گئی تھی کہ گلیوں، محلوں، بازاروں اور عام مجمعوں میں جا جا کر اسلام اور

نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدفِ اعتراض ٹھہرانے اور ان پر کھلم کھلا تنقید کرنے لگے تھے۔ دوسرے تصبات و بلاد کی طرح دہلی میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ مولانا نانوتوی اس زمانے میں دہلی کے مطبع مجتبائی میں کام کرتے تھے اور طلبا کو پڑھاتے بھی تھے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں اور اصحابِ عقیدت کو حکم دیا کہ وہ بھی بازاروں اور محلوں میں جاکر وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کریں، اسلام کی حقانیت بیان کریں اور پادریوں کے افکار و خیالات کی واضح الفاظ میں تردید کریں۔ ان دنوں تاراچند نام کا ایک پادری جگہ جگہ جاکر اسلامی احکام و فرامین کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ یہ صورتِ حال مولانا نانوتوی کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ ایک دن وہ خود میدان میں آئے اور اپنا نام ظاہر کیے اور تعارف کرائے بغیر مجمع عام میں اسلام کی حقانیت بیان کرنے اور عیسائیت کا رد کرنے لگے۔ وہیں تاراچند سے ان کا سامنا ہوا، اور تھوڑی سی گفت گو کے بعد مناظرہ شروع ہوگیا۔ مناظرے میں پادری کو شکست ہوئی اور مولانا کامیاب رہے۔

اس عہد کے ایک جلیل القدر عالم مولانا ابوالمنصور ناصر الدین دہلوی تھے۔ انھوں نے عیسائیت کی تردید کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ بہت بڑے مناظر اور داعیِ اسلام تھے۔ مولانا نانوتوی کی ملاقات ان سے ہوئی تو نہایت مسرت کا اظہار کیا اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر انتہائی خوش ہوئے۔ مولانا ناصر الدین نے ۱۳۲۰ھ کو دہلی میں وفات پائی۔

شاہ جہان پور کا میلہ خدا شناسی

انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد انھی کو زیادہ تر مبتلائے مصائب کیا۔ ان کو سیاسی طور پر بھی دبانے کی کوشش کی اور مذہبی اعتبار سے بھی شکست دینے کا عمل شروع کیا۔ ایک طرف ان کے مقابلے میں پادریوں کو لا کھڑا کیا اور دوسری جانب ہندوؤں کو شہ دی کہ وہ مسلمانوں سے مناظرے کریں۔ اس منصوبے کے تحت صوبہ یوپی کے ایک شہر

شاہ جہاں پور کے قریب ایک گاؤں "چاندا پور" میں ۸ مئی ۱۸۷۶ء کو ایک میلے کا اہتمام کیا گیا، جس کا نام "میلہ خداشناسی" رکھا گیا۔ اس موقع پر مسلمان، عیسائی اور ہندو تینوں مذاہب کے سرکردہ لوگوں کو اشتہارات کے ذریعے دعوت دی گئی کہ وہ اس میلے میں شریک ہوں اور اپنے اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کریں، چنانچہ مولانا محمد منیر نانوتوی اور مولوی الٰہی بخش رنگین کی تحریک پر مولانا محمد قاسم نانوتوی وہاں پہنچے۔ مولانا محمود حسن، مولوی رحیم اللہ بجنوری اور مولانا فخرالحسن ان کے ساتھ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا ابوالمنصور ناصرالدین دہلوی، مرزا موحد جالندھری، مولانا احمد علی دہلوی، میر حیدر دہلوی، مولانا لغمان اور مولانا الٰہی بخش رنگین بھی وہاں تشریف لے گئے۔ ان تمام علما نے تقریریں کیں اور لوگ ان سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا قاسم نانوتوی نے ابطالِ تثلیث، ردِّ شرک اور اثباتِ توحید کے موضوع پر تقریر کی اور مخالف و موافق حاضرین پر ان تقریروں کا انتہائی اثر ہوا، اور اردگرد کے تمام دیہات و قصبات میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ مسلمان جیت گئے اور دوسرے مذہبوں (عیسائیوں اور ہندوؤں) کے مناظر ہار گئے۔

اس سے دوسرے سال مارچ ۱۸۷۷ء میں میلۂ خداشناسی پھر منعقد ہوا اور مولانا نانوتوی اس مرتبہ بھی وہاں پہنچے۔ اس سال مرادآباد کے منشی اندرمن اور آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی (وفات ۱۸۸۳ء) بھی وہاں گئے تھے اور انھوں نے سنسکرت آمیز ہندی میں تقریر کی تھی۔ پادری نولس نے جو پہلے سال کے میلے میں بھی شامل تھا، اب کی مرتبہ ایک اور پادری کو بھی بُلا لیا تھا، جس کا نام اسکاٹ تھا اور یہ عیسائیوں کا مشہور پادری تھا۔ اس میلے میں مولانا نانوتوی کے ساتھ چند اور علمائے دین بھی تھے جن میں مولانا حفیظ الرحمٰن خاں، مولوی عبدالغفور اور مولوی محمد علی بچھرایونی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا نانوتوی نے مسئلۂ توحید سے متعلق گفتگو کی اور کامیاب رہے۔

شاہ جہاں پور کا میلۂ خدا شناسی دو سال منعقد ہوا۔ پہلا ۸ مئی ۱۸۷۶ء میں اور دوسرا مارچ ۱۸۷۷ء میں۔ مولانا نانوتوی دونوں میں شریک ہوئے اور دونوں مرتبہ اپنے علم و فضل کے جوہر دکھائے۔ ان میلوں کے بارے میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم لکھتے ہیں۔

"ایک بات یہاں خاص طور سے غور طلب ہے کہ "میلہ خدا شناسی شاہ جہان پور" اعلان و اشتہار کے ساتھ دو سال منعقد ہوا، اور اس میں ایک طرح سے مذہب اسلام کو چیلنج کیا گیا تھا۔ شاہ جہان پور سے بریلی اور بدایوں بالکل قریب اور متصل اضلاع ہیں، مگر اس میلے میں علمائے بدایوں اور بریلی کی کسی دلچسپی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔"[۲۷]

روداد رڑکی

شوال ۱۲۹۴ھ کو مولانا نانوتوی چند علمائے کرام کی معیت میں حج بیت اللہ کو روانہ ہوئے اور ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ کو واپس آئے۔ جدّہ پہنچے تو طبیعت خراب ہوگئی، وطن آکر کچھ افاقہ محسوس ہوا، مگر بیماری کلی طور پر ختم نہیں ہوئی۔ اس سے تقریباً پانچ مہینے بعد شعبان ۱۲۹۵ھ کو رڑکی سے اطلاع ملی کہ پنڈت دیانند سرسوتی سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور اسلام کے خلاف تقریریں کر رہے ہیں۔ مولانا نانوتوی کمزوری کے باوجود رڑکی پہنچے۔ بہت کوشش کی کہ پنڈت دیانند مجمع عام میں آئیں اور سب کے سامنے مولانا سے گفتگو کریں، لیکن وہ نہ آئے اور رڑکی سے واپس چلے گئے۔ مولانا کے حکم کے مطابق مولانا فخر الحسن اور مولانا محمود حسن نے عام جلسوں میں تقریریں کیں اور پنڈت جی کو مناظرے کا چیلنج دیا۔ مولانا نانوتوی نے بھی جلسۂ عام میں تقریر کی اور اسلام پر جو اعتراضات پنڈت دیانند سرسوتی نے کیے تھے ان کا مدلل جواب دیا۔

میرٹھ کا واقعہ

اس سے کچھ عرصہ بعد پتا چلا کہ پنڈت دیانند میرٹھ پہنچے ہوئے ہیں اور وہاں مختلف

---

[۲۷] "مولانا محمد احسن نانوتوی" ص ۲۲۲

مقامات پر جلسے منعقد کر کے اسلام پر حملے کر رہے ہیں، چنانچہ میرٹھ کے مسلمانوں کی درخواست پر مولانا نانوتوی وہاں گئے۔ پنڈت جی وہاں بھی ان سے گفتگو کرنے پر تیار نہ ہوئے اور میرٹھ سے چلے گئے۔ مولانا نے وہاں بھی جلسۂ عام میں تقریر کی اور پنڈت دیانند کے اعتراضات کا جواب دیا۔

مہمان کے لیے حقے کا انتظام

مولانا نانوتوی ہمہ اوصاف موصوف عالم تھے، ان میں جہاں اور بہت سی خوبیاں پائی جاتی تھیں، وہاں ایک خوبی یہ تھی کہ بہت بڑے مہمان نواز تھے۔ مہمان کی تمام جائز ضرورتوں کا خیال رکھتے اور اس کو کسی قسم کی پریشانی میں مبتلا نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے جو سوانح قاسمی کے مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی نے نقل کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا نانوتوی کے قیام دہلی کے زمانے میں ایک ایسا شخص ان کے ہاں مہمان کی حیثیت سے آیا جو نہ دنیوی اعتبار سے کوئی خاص مقام رکھتا تھا اور نہ علمی اور دینی لحاظ سے کسی اہم مرتبے کا حامل تھا۔ بس ایک عام سا آدمی تھا۔ اسے ریاح کا عارضہ تھا اور حقہ پینے کا عادی تھا۔ حقہ پینے سے اسے افاقہ رہتا تھا۔ اس نے رات کا کھانا کھایا اور معمول کے مطابق کھانے کے بعد حقہ نہ پی سکا، مولانا کے احترام کے پیش نظر اپنی اس ضرورت کا ان کے سامنے اظہار بھی نہ کر سکا۔ آدھی رات کے بعد اسے نفخ ہو گیا اور سخت تکلیف پیش آئی۔ مولانا کو اس کی بے چینی کا علم ہوا تو فوراً اٹھے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ یہ تکلیف حقہ نہ پینے کی وجہ سے پیش آئی ہے، اسی وقت کہیں سے حقہ لے کر آئے، خود چلم بھری اور حقہ اٹھا کر اس کو پیش کیا۔ پھر معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا۔

"آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں فرمایا تھا کہ میں حقہ پیتا ہوں۔"

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا کو حقے سے نفرت تھی، لیکن اس کے باوجود مہمان

کے لیے آدھی رات کے بعد حقّہ مہیا کیا اور اُسے پلایا۔[۷۳]

اندازِ تبلیغ کی ایک اچھوتی مثال

مولانا نانوتوی جس زمانے میں منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی دہلی میں تصحیح کتب کی خدمت انجام دیتے تھے، اسی زمانے میں ایک ادر صاحب بھی اس مطبع میں کام کرتے تھے، جو "حافظ جی" کے نام سے مشہور تھے۔ وہ بالکل آزاد منش

---

[۷۳] سوانح قاسمی ج اص ۴۶۸، ۴۶۹۔

یہاں مجھے اسی قسم کا ایک واقعہ قاضی محمد سلیمان منصورپوری مرحوم (مصنف رحمۃ للعالمین) کا یاد آیا جو ایک مرتبہ ہمارے ایک بزرگ میاں قاسم الدین مرحوم نے سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ اور میرے دادا میاں محمد مرحوم (جو میاں قاسم الدین کے برادرِ نسبتی تھے) قاضی صاحب مرحوم سے ملاقات کے لیے پٹیالہ گئے۔ یہ دونوں بزرگ حقّہ پینے کے عادی تھے۔ قاضی صاحب اس زمانے میں ریاست پٹیالہ کے سیشن جج تھے۔ یہ بزرگ جتنے دن پٹیالہ میں قاضی صاحب مرحوم کے ہاں مقیم رہے، قاضی صاحب انھیں خود کھانا کھلاتے اور اپنے ہاتھ سے حقّہ بھر کر لاتے رہے۔ قاضی صاحب سے یہ حضرات بار بار کہتے کہ کھانا اور حقّہ ملازم لے آئے گا، آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ قاضی صاحب ہمیشہ یہی جواب دیتے کہ آپ ملازم کے رشتہ دار یا مہمان نہیں ہیں، میرے رشتہ دار اور میرے ہی مہمان ہیں اور مجھ ہی سے ملاقات کے لیے آئے ہیں، میرا فرض ہے کہ آپ کی خدمت کروں اور آپ کی ضروریات کا اہتمام کروں —— میرے دادا کا انتقال جولائی ۱۹۳۹ء کو میرے قدیم وطن کوٹ کپورہ (مشرقی پنجاب) میں ہوا، اور میاں قاسم الدین کی وفات ۱۹۵۰ء کو میرے موجودہ گاؤں چک نمبر ۵۳ گ۔ب (تحصیل جڑانوالہ، ضلع فیصل آباد) میں ہوئی —— اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے، پُرانے لوگ عجیب افکار و خیالات کے مالک تھے، سراپا خلوص اور پیکرِ محبّت تھے۔

تھے، رندانہ وضع تھی، چوڑی دار پائجامہ پہنتے تھے جو اس دور کے شرفا کا لباس نہ تھا۔ داڑھی چڑھا کر رکھتے تھے اور نماز نہ پڑھتے تھے۔ مطبع میں ملازمت کی وجہ سے مولانا اور حافظ جی کی آپس میں نہایت گہری دوستی تھی۔ یہ دوستی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی کے "حافظ جی مولانا کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے اور مولانا ان کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے۔ مولانا ان کو کنگھا کرتے اور وہ مولانا کو کنگھا کرتے۔ مولانا کو ان کا اس قدر خیال رہتا کہ "کبھی مٹھائی وغیرہ ان کے پاس آتی تو حافظ جی کا حصہ ضرور رکھتے۔"

سوانح قاسمی میں مرقوم ہے کہ "مولانا کے مقدس دوست، ان کی ایک آزاد شخص کے ساتھ اس قسم کی دوستی سے ناخوش تھے، مگر وہ اس کی پروا نہ کرتے تھے۔" ایک دن تنہائی میں مولانا نے حافظ جی سے کہا کہ "بھئی! ہماری دوستی کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ دونوں کا رنگ ایک ہی ہو۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری وضع قطع کچھ اور ہو اور تمہارے دوست کی کچھ اور"۔ فرمایا "لاؤ میں ہی تمہارا رنگ اختیار کرتا ہوں۔" یہ الفاظ سن کر حافظ جی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور اس کے بعد اپنے دوست (مولانا نانوتوی) کا ایسا پختہ رنگ اختیار کیا کہ پرہیزگار مسلمانوں کی وضع قطع اختیار کرلی، اور اس روز سے پکے نمازی اور نیک وضع بن گئے۔[۴۷]

---

[۴۷] تفصیل کے لیے دیکھیے سوانح قاسمی ج ا ص ۴۶۹

اسی نوع کا قاضی سلیمان منصور پوری کا ایک اور واقعہ ذہن میں آیا۔ یہ واقعہ صوفی نذیر حسین مرحوم سے تعلق رکھتا ہے جو امرتسر کے رہنے والے تھے اور قیام پاکستان کے بعد گوجرانوالہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے، ۲۷ فروری ۱۹۵۴ء کو فوت ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کسی زمانے میں بھٹنڈہ ریلوے سٹیشن میں ملازم تھے۔ فقیرانہ لباس اور وہی وضع قطع، بڑی بڑی مونچھیں، اچھی خاصی داڑھی، سر پر لمبے لمبے بال اور پنڈلیوں سے نیچے تک سبز رنگ کا چغہ۔ کلائی میں چھ سات لوہے کے کڑے اور ہاتھ میں ڈنڈا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

یہ تبلیغ کا ایک اچھوتا اور نفسیاتی انداز تھا، جو نہایت موثر ثابت ہوا۔

میلاد کا واقعہ

اس زمانے میں ایک بزرگ مولوی عبدالسمیع تھے جو میلاد کے سختی سے قائل تھے اور اس موضوع پر بعض علمائے دیوبند سے ان کے مناظرے بھی ہوئے۔ مولانا نانوتوی سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی سے منقول ہے کہ "ایک صاحب نے میرٹھ میں مولانا نانوتوی سے دریافت کیا کہ مولوی عبدالسمیع صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) جسے ہتھیلی میں تھام کر ہاتھ کے جھٹکے سے کڑوں پر مارتے تو چھن چھن کی آواز گونجنے لگتی۔ صوفی صاحب کہتے ہیں، ایک دن میں اسی شکل و ہیئت میں بھٹنڈہ ریلوے سٹیشن کے ایک پلیٹ فارم پر گھوم رہا تھا کہ اچانک ایک بزرگ پر نظر پڑی جو پٹیالہ شاہی عمامہ باندھے ہوئے تھے، خوب صورت داڑھی اور رکٹی ہوئی مونچھیں، تنگ موری کا پاجامہ اور شیروانی زیب تن۔ گورا رنگ اور نورانی چہرہ۔ نہایت معزز اور وجیہ آدمی تھے ساتھ ایک ملازم جس کے ہاتھ میں کپڑے کا مصلّٰی اور سلور کا لوٹا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ریلوے سٹیشن کے جو بڑے چھوٹے لوگ ادھر سے گزرتے، ان بزرگ کو نہایت ادب سے سلام کرتے اور وہ مسکراتے ہوئے سب کے سلام کا جواب دیتے تھے۔ مجھے اس بزرگ کی موہنا شکل و صورت اور غیر معمولی روحانیت نے اپنی طرف کھینچا اور میں نے آگے بڑھ کر ان کو جھک کے سلام کیا۔ پھر نہایت ادب سے عرض کیا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں۔؟"

فرمایا "یہیں بھٹنڈے میں رہتا ہوں۔"

"یہاں جناب کا کیا شغل ہے؟"

بولے "سٹیشن سے قریب کی مسجد میں ہر روز نمازِ مغرب کے بعد قرآنِ مجید کا درس دیتا ہوں۔"

"اب کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

تو مولود شریف کرتے ہیں، آپ کیوں نہیں کرتے؟"

جواب ملاحظہ ہو، فرمایا "بھائی! انھیں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبّت معلوم ہوتی ہے، مجھے بھی اللہ تعالیٰ محبّت نصیب کرے۔"

مولانا تھانوی فرماتے ہیں، یہ جواب کسی طرح مولوی عبدالسمیع تک بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) "پٹیالے جارہا ہوں"

"واپس کب تشریف لائیں گے؟"

جواب دیا "ان شاء اللہ پرسوں آجاؤں گا اور معمول کے مطابق نمازِ مغرب کے بعد درسِ قرآن دوں گا" — پھر بدرجۂ غایت شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آپ بھی درس میں آیا کریں"

صوفی صاحب بتاتے ہیں کہ میں تیسرے دن اپنی مخصوص وضع قطع اور ہیئت کذائی میں ان کے درس میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے بہت سے افسر اور ساتھی وہاں موجود ہیں اور انتہائی انہماک سے درس سُن رہے ہیں — میں سب سے پیچھے جوتوں میں جاکر بیٹھ گیا۔ بزرگ نے دورانِ درس میں مجھے دیکھا تو فرمایا "قریب آجائیے" میں جھجکتا ہوا اُٹھا اور حسبِ حکم اُن کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں جُھکی ہوئی تھیں اور اپنی اس ہیئت پر شرم محسوس کر رہا تھا — میرے افسر اور ساتھی مجھے ایک خاص انداز سے دیکھ رہے تھے — درس کے بعد باہر نکلے تو پتا چلا کہ یہ قاضی محمد سلیمان منصورپوری ہیں جو بہت بڑے عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ریاست پٹیالہ کے سیشن جج ہیں اور ریاست کی تمام منڈیوں کے منتظم ہیں اور اس حیثیت سے "ناظم منڈیات" ان کا عہدہ ہے اور بھٹنڈہ میں ان کا دفتر ہے۔

اس کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ مونچھوں اور ڈاڑھی کو سنّت کے مطابق کیا، سر کے بال کٹوائے، کڑے اتار پھینکے اور ڈنڈا غائب کر دیا۔ جُبہ اتار دیا اور لباس بدل لیا — دوسرے دن درس میں گیا تو حُلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے مجھے غور سے دیکھا، اپنے قریب بٹھایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا "وہ جُبہ، کڑے، ڈنڈا اور سر کے بال کدھر گئے —؟" عرض کیا "اب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

پہنچ گیا تو کہا ، ایسے سے بھلا کوئی کیا لڑے ۔[۵۵]

یہ تھا مخالفوں کے بارے میں ان بزرگوں کا اندازِ کلام اور اسلوبِ گفتگو۔ اس قسم کی باتیں لوگوں کو متاثر کرتی تھیں اور وہ امورِ بدعت سے دامن کشاں ہو جاتے تھے۔

بدعتی کی مہمان نوازی

ایک صاحب "ٹھسکہ" کے رہنے والے تھے اور طبقۂ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے ، لوگ انھیں "شاہ صاحب" کہتے تھے ۔ علمائے دیوبند جن امور کے بدعت ہونے کا فتویٰ دیتے تھے ، وہ ان میں مبتلا تھے ۔ انھوں نے مولانا نانوتوی کی شہرت سنی تو ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ مولانا نے نہایت احترام کے ساتھ ان کو مہمان بنایا اور طلبا کو حکم دیا کہ کوئی شخص ان کے طریقے کے خلاف کسی قسم کی بات نہ کرے ، اس لیے کہ مہمان کی دلشکنی نہیں کرنی چاہیے ۔ مولانا نانوتوی نے رسم مشائخ کی پیروی کرتے ہوئے شاہ صاحب کی خدمت میں نذر بھی پیش کی ۔ بلکہ شاہ صاحب کے ساتھ جو بھنگی سائیس تھے ، ان کو خود کھانا کھلایا اور ان کی خاطر مدارات کی ۔ یہ بات کسی نے مولانا رشید احمد گنگوہی کو بھی پہنچا دی —— مولانا گنگوہی نے مولانا نانوتوی کے اس طرزِ عمل پر کچھ ناگواری کا اظہار کیا اور کہا کہ بدعتی کا اکرام جائز نہیں ۔ مولانا نانوتوی کی طرف سے جواب دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تو کافر مہمانوں کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) وہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ۔" فرمایا رہنے دیتے ، اتنی جلدی کیا پڑی تھی ، وہ لباس اچھا لگتا تھا ۔ اور آپ کی شخصیت کا جزو بن گیا تھا ——

غور فرمایئے ۔ پرانے بزرگوں اور عالموں کا طریقِ کلام اور نہج تفہیم کس درجے میٹھا اور پیارا تھا ۔ ان کی ہر بات دل میں اترتی اور فکر و ذہن کی گہرائیوں میں اثر و سوز کے نقوش مرتسم کرتی جاتی تھی ۔

۵۵ سوانح قاسمی ج ۱ ص ۴۷۱ ، ۴۷۲

بھی اکرام کرتے تھے ــــ مولانا گنگوہی کو لوگوں نے مولانا نانوتوی کا یہ جواب سنایا تو فرمایا کہ کافر کے اکرام میں غلط فہمی اور فساد کا احتمال نہیں، برخلاف بدعتی کے۔ بدعتی کے اکرام میں اندیشہ ہے کہ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے اور سمجھنے لگے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کو صحیح قرار دے دیا گیا ہے، علاوہ ازیں دوسرے لوگ بھی یہی غلط نتیجہ نکال سکتے اور بدعتی کے عمل کو مبنی بر صحت ٹھہرا سکتے ہیں۔

منقول ہے کہ جب مولانا نانوتوی کے سامنے مولانا گنگوہی کا یہ قول بیان کیا گیا تو جو صاحب ان دونوں بزرگوں کی باتیں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہنچا رہے تھے، ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا: "یہ کیا واہیات ہے، اِدھر کی اُدھر لگاتے پھرتے ہو، بیٹھو اپنا کام کرو۔"

کہا جاتا ہے کہ جب وہ مہمان یعنی شاہ صاحب مولانا نانوتوی کے ہاں سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے مولانا سے کہا: "فقیر تو آپ ہیں، ہم تو صرف نقال ہیں۔"[۷۶]

تصنیفات

مولانا نانوتوی متعدد کتابوں کے مصنف تھے اور ان کی تمام تصنیفات ان مسائل سے متعلق ہیں جو ان کے عہد میں زیرِ بحث تھے۔ ان سے مختلف اہل علم نے جو استفسار کیے ان کے انھوں نے مفصل اور مدلل جواب دیے اور پھر وہ کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان کے مندرجات و مشمولات نہایت دقیق اور فلسفیانہ ہیں۔ مولوی منصور علی خان مراد آبادی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"میں نے جناب مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی کو خوب دیکھا ہے اور اُن کی تقریر بھی سُنی ہے اور ان کے خیالات اور اوصاف پر غور کیا ہے۔ ان کا ذہن مصنفینِ فلسفہ کے ذہن سے بھی عالی تھا۔ وہ ہر مسئلۂ شرعی کو دلائل عقلیہ

---

[۷۶] سوانح قاسمی ج ۱ ص ۴۷۲، ۴۷۳

سے ثابت کرنے پر اور مسئلہ فلسفی مخالفِ شرع کو دلائل عقلیہ سے رَدّ کرنے پر ایسے قادر تھے کہ دوسرے کسی عالم کو میں نے ایسی قوتِ علمیہ اور قوتِ بیانیہ والا نہیں دیکھا۔[۷۷]"

ان کے مکاتیب و رسائل اور تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ بلاشبہ وہ بہت بڑی قوتِ علمیہ اور قوتِ بیانیہ کے مالک تھے اور اللہ نے ان کو ذہانت و فطانت کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ ان کے بہت سے مکتوبات کے علاوہ جو انھوں نے مختلف حضرات کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمائے، ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ **تحشیہ صحیح بخاری**:۔ یہ صحیح بخاری کے آخری پانچ پاروں کا حاشیہ ہے جو انھوں نے مولانا احمد علی سہارن پوری کے فرمان کے مطابق لکھا۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

۲۔ **آبِ حیات**:۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحانی اور جسمانی حیاتِ مبارکہ سے متعلق ایک علمی اور تحقیقی کتاب ہے۔ باغ فدک کے بارے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان کا بھی اس میں جواب دیا گیا ہے۔

۳۔ **مصابیح التراویح**:۔ یہ تراویح سے متعلق مولانا احمد حسن امروہوی کے ایک استفسار کا جواب ہے۔

۴۔ **ھدایۃ الشیعہ**:۔ اس میں ان اعتراضات کے مفصل اور مدلل جوابات دیے گئے ہیں جو شیعہ حضرات کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں۔

۵۔ **الدلیل المحکم علیٰ قرأۃ الفاتحۃ للمؤتم**:۔ یہ فاتحہ خلف الامام کے متعلق ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔ اس کے آخر میں ایک بزرگ کے نام ایک

---

[۷۷] مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۲۴

مکتوب ہے جس میں تقلید اور آٹھ رکعت تراویح کا بیان ہے۔

۶۔ اجوبہ اربعین :۔ اس میں شیعہ حضرات کے مختلف اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

۷۔ اسرار قرآنی :۔ یہ ایک رسالہ ہے جو بعض مسائل سے متعلق پانچ مکتوبات کے جوابات پر محیط ہے۔ ان میں پہلے تین مکتوب مولانا محمد صدیق مراد آبادی کے ہیں، چوتھا مولانا احمد حسن امروہوی کا اور پانچواں مرزا عبدالقادر مراد آبادی کا ہے۔

۸۔ تصفیۃ العقائد :۔ سرسید احمد خاں اور مولانا نانوتوی کے درمیان پیرجی محمد عارف انبٹھوی کی معرفت ایک مرتبہ عقائد اسلام کے موضوع پر خط و کتابت ہوئی تھی۔ مولانا محمد حیات میرٹھی نے تصفیۃ العقائد کے نام سے اسے چھاپ دیا تھا۔ پہلا خط پیرجی محمد عارف کے نام اور دوسرا خط سرسید احمد خاں کے نام ہے۔ سرسید کا خط بنام پیرجی محمد عارف بھی اس میں شامل ہے۔

۹۔ تحذیر الناس :۔ مولانا محمد احسن نانوتوی کے ایک استفسار کا جواب جو کتابی شکل میں شائع ہوا۔

۱۰۔ رد قول الفصیح :۔ مولانا عبدالقادر بدایونی کے شاگرد مولوی فصیح الدین بدایونی نے تحذیر الناس کے رد میں ایک رسالہ قول الفصیح لکھا تھا۔ مولانا نانوتوی نے اس کے جواب میں رد قول الفصیح لکھا۔

۱۱۔ حجۃ الاسلام :۔ چاندا پور (ضلع شاہ جہان پور) کے میلہ خداشناسی میں مولانا نانوتوی نے حقانیت اسلام کے متعلق ایک تقریر کی تھی جو مولوی فخر الحسن گنگوہی نے حجۃ الاسلام کے نام شائع کی۔

۱۲۔ گفتگوئے مذہبی (میلہ خداشناسی) یہ بھی ایک تقریر ہے جو چاندا پور (ضلع شاہ جہان پور) کے میلۂ خداشناسی میں کی تھی۔ یہ میلہ ۷، ۸ مئی ۱۸۷۶ء

کو ہوا تھا۔

۱۳۔ مباحثہ شاہ جہان پور:۔ یہ بھی ایک تقریر ہے جو ۱۹، ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کے میلہ خدا شناسی میں ہوئی۔

۱۴۔ انتصار الاسلام:۔ یہ وہ تقریر ہے جو رڑکی میں اس وقت جا کر کی جب کہ پنڈت دیانند سرسوتی وہاں گئے تھے اور مسلمانوں کو مناظرے کا چیلنج دیا تھا۔ مولانا نانوتوی مناظرے کے لیے وہاں پہنچے تو دیانند سامنے نہیں آئے تھے اور رڑکی سے کسی دوسری جگہ چلے گئے تھے۔ اس تقریر میں شیطان، جنّ اور فرشتوں کا وجود ثابت کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سرسیّد کے اوہام کی بھی تردید کی گئی ہے۔

۱۵۔ قبلہ نما:۔ پنڈت دیانند سرسوتی (آریہ سماجی) نے استقبال قبلہ کے مسئلے کو ہدفِ اعتراض ٹھہرایا تھا۔ مولانا نانوتوی نے اس رسالے میں استقبال قبلہ اور بت پرستی کے درمیان جو فرق ہے، اس کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقتِ قبلہ کیا ہے اور نماز میں اس کی طرف منہ کرنا کیوں ضروری ہے۔ یہ رسالہ "انتصار الاسلام" کا حصّہ دوم ہے۔

۱۶۔ جواب ترکی بہ ترکی:۔ ایک مرتبہ میرٹھ (یوپی) میں آریہ سماجیوں نے اسلام پر کچھ تحریری اور تقریری اعتراض کیے تھے۔ اس رسالے میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ مولانا نانوتوی کا یہ رسالہ مولوی عبدالعلی نے مرتب کیا ہے۔

۱۷۔ تقریر دلپذیر:۔ اس میں عقلی اور نقلی دلائل سے اسلام کی حقانیت ثابت کی گئی ہے اور اللہ کی توحید اور آنحضرتؐ کی نبوت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ نیز واضح کیا گیا ہے کہ نجات کا دارومدار صرف اسلام کو ماننے پر ہے۔

۱۸۔ توثیق الکلام در مبحث خلف الامام:۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس

رسالے میں فاتحہ خلف الامام کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

۱۹۔ تحفہ لحمیہ:۔ اس میں گوشت خوری کو عقلی اور نقلی اسلوب میں ثابت کیا گیا ہے۔

۲۰۔ انتباہ المؤمنین:۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے جو مولوی الٰہی بخش کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا۔ اس میں شیعہ حضرات کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ رسالے کے آخر میں مولانا حبیب الرحمٰن بن مولانا احمد علی سہارن پوری نے مولانا اسماعیل شہید دہلوی کا عربی زبان کا ایک خط اور اس کا اُردو ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے۔

۲۱۔ فیوض قاسمیہ:۔ اس میں پندرہ علمی مکتوبات کے جواب دیے گئے ہیں۔

۲۲۔ جمال قاسمی:۔ یہ مولانا نانوتوی کے ان دو مکتوبات پر مشتمل ہے جو اُنھوں نے محمد جمال الدین دہلوی کو تحریر فرمائے۔ مکتوب الیہ نے یہ مکتوبات "جمال قاسمی" کے نام سے مرتب کیے۔

مکتوب اوّل:۔ ۲ ر ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ کو لکھا گیا جو وحدت الوجود کے بیان میں ہے۔

مکتوب دوم:۔ ۳ ر ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ کو تحریر فرمایا گیا جو سماعِ موتیٰ کے متعلق ہے۔

۲۳۔ لطائف قاسمیہ:۔ یہ رسالہ نو مکتوبات پر مشتمل ہے جو مولانا نے مختلف مسائل کے جواب میں نو حضرات کے نام تحریر کیے۔

۲۴۔ مکتوباتِ قاسمیہ:۔ اس مجموعۂ مکتوبات میں مولانا کے آٹھ خطوط شامل ہیں جو اُنھوں نے خلیفہ بشیر احمد دیوبندی کے نام لکھے۔ یہ خطوط تصوّف و سلوک کے موضوع پر مشتمل ہیں۔ آخر میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے آٹھ خط درج کیے گئے ہیں اور ایک خط مولانا رشید احمد گنگوہی کا ہے۔

۲۵۔ الاجوبۃ الکاملہ فی الاسولۃ الخامسہ:۔ یہ رسالہ شیعیت کے

ردّ میں ہے۔

۲۶۔ قصائد قاسمیہ :۔ مولانا ذوقِ شعری بھی رکھتے تھے۔ یہ ان کے چند قصاید کا مجموعہ ہے۔ قصیدۂ اوّل رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شانِ بابرکات میں ہے۔ تین قصیدے ترکی کے سلطان عبد الحمید کی مدح میں ہیں۔ پہلا اُردو میں، دوسرا فارسی میں اور تیسرا عربی میں — مولانا ذو الفقار علی، مولانا فیض الحسن اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے عربی قصائد بھی اس مجموعے میں شامل ہیں جو انھوں نے سلطان عبد الحمید کی مدح میں لکھے۔ آخر میں مولانا نانوتوی کا منظوم چشتیہ صابریہ شجرہ درج ہے۔

تلامذہ

مولانا محمد قاسم نانوتوی بلاشُبہ دیارِ ہند کے جلیل القدر عالم اور منفرد اوصاف کے حامل تھے۔ ان کی خدماتِ گوناگوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ اگرچہ محدود تھا، لیکن اس میں ہندوستان کے بعض اعاظم رجال شامل تھے، جن میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا احمد حسن امروہی، مولانا محمد یعقوب دہلوی اور حکیم منصور علی خاں مراد آبادی لائقِ تذکرہ ہیں۔

انتقال

مولانا نانوتوی حج بیت اللہ کے لیے تیسری اور آخری مرتبہ شوال ۱۲۹۴ھ کو وطن سے روانہ ہوئے اور ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ کو واپس تشریف لائے۔ واپسی پر جدّہ پہنچے تو ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور پھر مستقل طور پر بیماری کی گرفت میں آگئے۔ درمیان میں علاج معالجے سے کچھ افاقہ بھی ہوا، مگر مرض کی جڑ نہیں کٹی اور ضیق النفس کی تکلیف نے شدت اختیار کرلی۔ بالآخر ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ (۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء) کو پنجشنبہ کے روز دیوبند میں ان کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی اور نمازِ مغرب کے بعد اس خزانۂ علم وفضل کو اسی سرزمین میں سپردِ خاک کردیا گیا — اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

۷۷۔ مفتی محمد قلی کنتوری

مفتی محمد قلی بن محمد حسین بن حامد حسین بن زین العابدین موسوی نیسا پوری کنتوری، اپنے دور کے فاضل بزرگ اور مشہور شیعہ عالم تھے۔ ۱۱۸۸ھ کو پیدا ہوئے اور لکھنؤ کے ممتاز اساتذہ سے حصولِ علم کیا۔ پھر سیّد دلدار علی نقوی نصیر آبادی سے منسلک ہوئے جو نامور شیعہ مجتہد تھے۔ ان سے حدیث و فقہ اور اصولِ حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد شیعہ حضرات کی طرف سے میرٹھ (یوپی) میں مسندِ افتا پر فائز ہوئے۔ عرصے تک اس منصب پر متمکن رہے۔ شیعی اصول و کلام سے متعلق بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ السیف الناصری :- یہ کتاب شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ کے پہلے باب کے رَدّ میں ہے۔

۲۔ تقلب المکاید :- یہ تحفہ اثنا عشریہ کے دوسرے باب کے رَدّ میں ہے۔

۳۔ برہان السعادہ :- اس میں تحفہ اثنا عشریہ کے ساتویں باب کا رَدّ کیا گیا ہے۔

۴۔ تشیید المطاعن لکشف الضغائن :- یہ تحفہ اثنا عشریہ کے دسویں باب کی تردید پر مشتمل ہے۔

۵۔ مصارع الافہام لقطع الاوہام :- اس میں تحفہ اثنا عشریہ کے گیارھویں باب کی تردید کی گئی ہے۔

۶۔ الاجوبۃ الفاخرۃ :- اس میں مولانا رشید الدین خاں دہلوی[۷۸] کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو انھوں نے سیف

---

[۷۸] مولانا رشید الدین خاں دہلوی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری جلد اوّل ص ۲۴۲ تا ۲۴۵۔

ناصری پر کیے ہیں۔

۷۔ الفتوحات الحیدریہ :۔ یہ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی کی الصراط المستقیم کے رّد میں ہے۔

۸۔ الشعلۃ الطفریہ : یہ مولانا رشید الدین خان دہلوی کی مشہور کتاب "الشوکۃ العمریہ" کے رد میں ہے۔

۹۔ نفاق الشیخین بحکم احادیث الصحیحین۔

۱۰۔ تطہیر المؤمنین عن نجاسۃ المشرکین۔

۱۱۔ تقریب الافہام فی تفسیر ایات الاحکام۔

ان کے علاوہ انھوں نے اور بھی رسائل تحریر کیے۔

مفتی محمد قلی کنتوری نے ۹ محرم ۱۲۶۰ھ کو ۲۷ سال کی عمر میں وفات پائی[۷۹]

۷۸۔ مولانا محمد لبیب عثمانی

یوپی کا شہر بدایوں علم و علما کی کثرت میں خاص شہرت کا حامل ہے۔ اس شہر کی سرزمین میں بے شمار اہلِ علم نے جنم لیا اور اپنی خدمات کی وجہ سے بڑا نام پایا۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس خطے میں جو حضرات پیدا ہوئے ان میں مولانا محمد لبیب عثمانی بدایونی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ مولانا محمد سعید بدایونی کے بیٹے تھے جو اس نواح کے اصحابِ علم میں خاص طور سے معروف تھے۔

مولانا محمد لبیب بدایوں میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں نشو و نما پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ محمد سعید بدایونی سے تحصیلِ علم کیا اور مدت تک ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ علوم متداولہ سے فراغت کے بعد خود سلسلۂ درس جاری کیا

---

[۷۹] نزھۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۰، ۴۶۱ بحوالہ تذکرۂ العلما۔

اور بہت سے علما و طلبا ان سے مستفید ہوئے۔ علم فقہ اور فرائض و وراثت میں مہارت رکھتے تھے اور اس موضوع سے متعلق کثیر تعداد میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔

بدایوں کے اس عالم و فقیہ نے ۷۴ برس عمر پا کر محرم ۱۲۰۵ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔[۵۸]

۷۹۔ سیّد محمّد لطیف مچھلی شہری

سیّد محمد لطیف ہاشمی جعفری جلیل القدر عالم، نامور فقیہ اور شیخ تھے۔ علمائے حنفیہ میں اونچے مرتبے کے بزرگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ قاضی ثناء اللہ مچھلی شہری کی اولاد سے تھے۔ بلند اخلاق اور صالح عالم دین تھے۔ مچھلی شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد مفتی علی کبیر سے حصولِ علم کا آغاز کیا، کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔ پھر مولانا محمد شکور کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے تکمیل علم کی۔ تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ ادبیات عربی میں بالخصوص کمال حاصل تھا۔ عبادت و زہد میں اپنی مثال آپ تھے۔ کئی سال درس و تدریس میں مشغول رہے اور بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ پہلے مفتی مقرر ہوئے، پھر صدر امین کا عہدہ سنبھالا، بعد ازاں صدر الصدور کا منصب پایا۔ مسندِ قضا پر بھی متمکن رہے۔ تمام مناصب میں اچھی شہرت پائی اور ہر طبقے کے لوگ ان کے کام سے متاثر ہوئے۔

حکایاتِ عربی ان کی ایک تصنیف ہے۔ طوطی نامہ کا ترجمہ شروع کیا تھا، لیکن اسے مولانا عبدالشکور نے مکمل کیا۔

مذکورہ بالا خدمات انجام دینے کے بعد پنشن پائی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

۵۸۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۱ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۳

آخرِ عمر میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور سعادتِ حج حاصل کی ۔ ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۶۷ ھ کو مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے[۸۱]

۸۰ ـــ مولانا محمد مُبین فرنگی محلی

برصغیر پاک و ہند کے جن علمی خاندانوں نے بہت زیادہ شہرت پائی ، ان میں لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں ۔ یہ انصاری خاندان تھا ۔ اس کے متعدد اہلِ علم کا ذکر سلسلۂ فقہائے ہند کے بہت سے مقامات میں ہو چکا ہے ۔ اس دودمانِ عالی قدر کے جدِّ اعلیٰ شیخ قطب الدین شہید سہالوی تھے ، جن کی شہادت کے بعد یہ خاندان لکھنؤ کے نواحی قریہ سہالی سے ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ آیا اور وہاں کے ایک مقام "فرنگی محل" میں اقامت گزیں ہونے کی بنا پر اس کے معزز ارکان "فرنگی محلی" کی نسبت سے مشہور ہوئے ۔ مولانا قطب الدین شہید کے فرزند نامدار ملا نظام الدین انصاری فرنگی محلی نے عربی اور دینی مدارس کے لیے باقاعدہ ایک نصاب تعلیم مرتب کیا جو ان کے نام کی مناسبت سے "درسِ نظامیہ" کہلایا ۔ اسی خاندان کے ایک عالم دین مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلی تھے ۔ ان کا مختصر نسب نامہ یہ ہے ۔ محمد مبین بن محب اللہ بن احمد بن محمد سعید بن قطب الدین شہید انصاری فرنگی محلی لکھنوی ۔

مولانا محمد مبین اپنے دور کے عالم کبیر اور شیخ ذی مرتبت تھے ۔ کبار فقہائے حنفیہ میں گردانے جاتے تھے ۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی گہوارۂ علم میں نشوونما پائی ۔ معقول و منقول کے جید عالم ملا حسن فرنگی محلی لکھنوی سے علم حاصل کیا جو ملا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد تھے ۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے اور علوم متداولہ میں درجۂ کمال کو پہنچے ۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و افادہ

---

[۸۱] تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۳۷۷ ـــ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۲

میں مشغول ہوئے اور اپنے تمام اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے۔ علاوہ ازیں تصنیف و تالیف میں بھی نام پیدا کیا اور وعظ و تذکیر کے میدان میں بھی شہرت پائی۔ ایک روایت کے مطابق شیخ قطب الدین کی اولاد میں یہ اوّلین عالم دین تھے جنھوں نے لکھنؤ کے فرنگی محل کو مرکز بنا کر تذکیر و موعظت کا سلسلہ شروع کیا۔

ان کی تصنیفات و تالیفات اور شرح و حواشی کا دائرہ کسی ایک ہی فن میں محدود نہیں ہے، بہ ہر موضوع پر حاوی تھے اور ہر میدان میں انھوں نے دادِ تحقیق دی جس کی تفصیل مندرجہ تحت ہے۔

۱۔ شرح سُلّم العلوم :۔ یہ علم منطق کی کتاب ہے اور درسیات میں شامل ہے۔ اس کی انھوں نے ایک مبسوط شرح سپردِ قلم کی، جسے حلقۂ علما میں تلقی و قبولیت حاصل ہوئی۔

۲۔ شرح مُسَلَّم الثبوت :۔ اصولِ فقہ کی ایک مشہور کتاب مسلم الثبوت ہے اور شاملِ درسِ نظامی ہے۔ مولانا محمد مبین فرنگی محلی نے شرح مسلم الثبوت کے نام سے اس کی شرح لکھی۔

۳۔ حاشیہ میرزاھد رسالہ۔

۴۔ حاشیہ میرزاھد ملا جلال۔

۵۔ حاشیہ میرزاھد شرح المواقف۔

۶۔ حاشیہ علیٰ شرح ھدایۃ الحکمۃ از شیرازی۔

۷۔ وسیلۃ النجات :۔ یہ رسالہ اہل بیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ہے۔

۸۔ ترجمہ حکایات الصالحین۔

۹۔ شرح اسماء حسنیٰ۔

۱۰۔ شرح تبصرہ :۔ یہ کتاب تصوف کے موضوع پر ہے۔

۱۱۔ زبدۃ الفوائد :۔ اس میں سحری اور رمضان المبارک کے مسائل بیان کیے گئے ہیں

۱۲۔ کنز الحسنات فی ایتاء الزکوٰۃ :۔ یہ رسالہ زکوٰۃ کے احکام و مسائل سے متعلق ہے۔

غرض مولانا محمد مبین انصاری فرنگی تیرھویں صدی ہجری کے جیّد عالم اور ممتاز فقیہ تھے۔ ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ کو لکھنؤ میں فوت ہوئے[۸۲]

۸۱ــــــ مولانا محمّد مرشد سرہندی

سرہند (مشرقی پنجاب) میں تیرھویں صدی ہجری کے جو علما و فقہا امتیاز و ناموری سے مفتخر ہوئے، ان میں مولانا محمّد مرشد بن محمد ارشد بن فرخ شاہ کا نام نامی خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہے۔ وہ مسلکاً حنفی تھے اور سرہند کے رہنے والے تھے متقی اور صالح عالم دین تھے۔ ۱۱ صفر ۱۱۱۷ھ ان کا سنِ ولادت ہے۔ ان کے والد محمد ارشد سرہندی جیّد علما میں سے تھے اور ان کا سلسلۂ درس جاری تھا جس سے بہت سے تشنگانِ علوم مستفید ہوئے۔ بیٹے نے انھی کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیا اور علم و معرفت میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے بازی لے گئے۔

علوم مروّجہ کی تحصیل کے بعد عازم رام پور ہوئے۔ وہاں اس زمانے میں نواب فیض اللہ خاں دادِ حکمرانی دیتا تھا اور علم و علما کا بہت قدر دان تھا، مولانا محمّد مرشد سے بھی اس نے انتہائی تکریم کا برتاؤ کیا اور انھیں نہایت عزّت سے ٹھہرایا۔ انھوں نے رام پور میں درس و تدریس کی مسند آراستہ کی اور اس نواح کے علما و طلبا کا مرکز قرار پاتے۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں ان کے فرزندِ گرامی مولانا سراج احمد بھی شامل ہیں، جنھوں نے جامع ترمذی کی شرح سپردِ قلم کی۔

---

۸۲ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۷۲-۱۷۴ ــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۱ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۰۳، ۴۰۴

مولانا محمد مرشد سرہندی نے پیر کے روز ۱۹۔ رجب ۱۲۰۱ھ کو رام پور میں وفات پائی۔[۸۳]

۸۲۔۔۔ مولانا محمد مستعان کاکوروی

کاکوری کسی زمانے میں بے شمار علما و فقہا اور صلحا و اتقیا کا مسکن تھا۔ اس کے تیرھویں صدی ہجری کے عالی مرتبت اصحاب میں مولانا محمد مستعان بن عبدالسبحان کا نام تذکرہ و رجال کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ یہ کاکوری کے شیخ و فاضل اور عالم کبیر تھے، وہاں کے فقہائے حنفیہ میں ان کو بڑا اونچا مقام حاصل تھا۔۔۔ ان کا مولد و منشا کاکوری ہے۔ مولانا محمد اعلم بن شاکر اللہ سندیلوی سے علم حاصل کیا اور اپنے عہد کے عظیم لوگوں میں گردانے گئے۔ حصولِ علم کے بعد خود درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور خلقِ کثیر کو مستفید فرمایا۔

علم فقہ، منطق و فلسفہ اور اصول و کلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔ زہد و تقویٰ، ورع و عبادت، حسنِ کلام، علوِّ اخلاق اور ذکاوت و فطانت میں خاص طور سے مشہور تھے۔

اس عالم اجل نے غرۂ رجب ۱۲۲۷ھ کو وفات پائی۔[۸۴]

۸۳۔۔۔ قاضی محمد معروف مدراسی

تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے مدراس میں قاضی محمد معروف بن عبداللہ مدراسی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ اپنے زمانے کی مشہور علمی شخصیت تھے اور ممتاز شیوخ میں شمار کیے جاتے تھے۔ مدراس اور اس کے قرب و جوار میں ان کا بہت

۸۳؎ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۲، ۴۶۳ بحوالہ الہدیۃ الاحمدیہ۔

۸۴؎ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۳

شہرہ تھا۔ ان کے والد قاضی عبداللہ مدراسی بھی ہمہ اوصاف موصوف عالم تھے۔ بیٹے نے علوم متداولہ کی ابتدائی اور متوسط کتابیں والد بزرگوار سے پڑھیں۔ پھر قاضی ارتضا علی گوپاموی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ علم سے فارغ ہونے کے بعد خود درس و افادہ میں مصروف ہوئے اور ایک مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر منصبِ افتا پر متمکن کیے گئے اور طویل عرصے تک اس نازک اور اہم منصب پر فائز رہے۔ اپنے اُستاد قاضی ارتضا علی گوپاموی کی وفات کے بعد قاضی القضاۃ بنا دیے گئے، اس زمانے میں اس بہت بڑے عہدے پر اسی شخص کو متمکن کیا جاتا تھا جو علمِ فقہ کے تمام گوشوں سے پوری طرح آگاہ ہوتا تھا۔ قاضی محمد معروف مدراسی کو اس پر اسی لیے فائز کیا گیا کہ وہ دیگر مروجہ و متداولہ علوم کے علاوہ علم فقہ پر بھی عمیق نگاہ رکھتے تھے۔

ہندوستان کے اس جلیل القدر عالم و فقیہ نے ۲۹۔شعبان ۱۲۷۴ھ کو اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی[85]۔

۸۴ — مولانا محمد معین انصاری لکھنوی

علمائے فرنگی محل میں مولانا محمد معین بن محمد مبین انصاری لکھنوی نے میدانِ علم کے مختلف پہلوؤں میں بڑی شہرت پائی۔ وہ اپنے عصر کے ممتاز عالم، نامور فقیہ اور معروف شیخ تھے۔ لکھنؤ میں ولادت ہوئی اور وہیں تربیت پائی۔ خاندان کے تمام افراد علم و فضل کے زیور سے آراستہ تھے۔ اپنے بڑے بھائی مولانا حیدر، چچازاد بھائی مولانا ولی اللہ اور مفتی ظہور اللہ لکھنوی سے علم حاصل کیا۔ سندِ حدیث مولانا عبدالحفیظ مکی حنفی سے لی۔ پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور بہت لوگوں کو مستفید فرمایا۔ ان کے والد مولانا محمد مبین انصاری لکھنوی ہر جمعے کو مجلسِ وعظ منعقد

---

[85] نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۳ بحوالہ حدیقۃ المرام۔

کرتے تھے، باپ کی وفات کے بعد لائق بیٹے (محمد معین) نے مسند سنبھالی تو انھوں نے یہ سلسلۂ وعظ جاری رکھا۔ کثیر تعداد میں لوگ ان کی مجلسِ وعظ و تذکیر میں شامل ہوتے اور نصیحت حاصل کرتے تھے۔

مولانا محمد معین انصاری اپنے زمانے کے جید عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ علمِ فقہ، نحو اور دیگر موضوعات سے متعلق انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ غایۃ البیان فیما یحل ویحرم من الحیوان:- یہ کتاب مسائلِ فقہ پر مشتمل ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں ان حیوانات کا ذکر کیا گیا ہے جن کا کھانا شرعی اعتبار سے حلال یا حرام ہے۔

۲۔ غایۃ الکلام فی القرأۃ خلف الامام:- یہ فاتحہ خلف الامام کے بارے میں ہے۔

۳۔ ابراز الکنوز فی احوال ارباب الرموز:- حالاتِ اصحاب رموز کے بیان میں۔

۴۔ شرح رسالہ امام نووی۔

۵۔ کتاب حصن حصین: ناتمام رہی۔

۶۔ حاشیہ صدرا:- تا بحث ہیولیٰ۔

۷۔ معینیہ:- متعہ کی تحریم اور آیات وراثت کی تفسیر میں۔

۸۔ حاشیہ علیٰ ہدایۃ الحکمۃ:- شیرازی کی مشہور درسی کتاب ہدایۃ الحکمہ پر حاشیہ۔

علاوہ ازیں بعض درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات ان سے یادگار ہیں۔

مولانا محمد معین انصاری فرنگی محلی لکھنوی نے ۲۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۸ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا اور باغ مولانا احمد انوار الحق لکھنؤ میں دفن ہوئے[۸۶]۔

۸۶۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۸ ــــــ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۷۴، ۱۷۵ ــــــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۴۔

۸۵ــــ مولانا محمد نعیم کشمیری

خطۂ کشمیر علم وادراک، تصوّف وسلوک اور فضل وکمال کے اعتبار سے اسلامی تاریخ میں ہمیشہ ایک مستقل حیثیت کا حامل رہا ہے۔ اس میں لاتعداد بوریا نشین علما، بے شمار اصحاب درس وتدریس اور ان گنت ارباب فتویٰ وقضا پیدا ہوئے بعض مقامات پر مختلف اوقات میں اور بعض علاقوں میں ایک ہی عہد میں متعدد علما و فقہا نے خدمات انجام دیں اور خلق کثیر نے ان سے کسب علم اور اخذ فیض کیا۔

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں اس نواح میں جن حضرات نے فیض رسانی کی مسندیں آراستہ کیں، ان میں مولانا محمد نعیم کشمیری کا اسم گرامی کشمیر کی تاریخ میں محفوظ ہے جو کشمیر کے فقہائے احناف میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ والد کا نام نامی محمد مقیم تھا۔

محمد نعیم کا مولد و منشا کشمیر ہے۔ ان کے چچا مولانا محمد اکبر کشمیری تھے جو بمبئی چلے گئے تھے اور جن کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ ان کی وفات ۱۲۷۲ھ کو بمبئی میں ہوئی اور وہیں ان کا مدفن ہے۔ محمد نعیم نے انہی سے استفادہ کیا اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ ایک اور بزرگ شیخ عبدالرحیم کی صحبت ورفاقت اختیار کی اور ان سے اخذ طریقت کیا۔

علوم متداولہ کی تحصیل اور تصوّف وطریقت کے حصول کے بعد مولانا محمد نعیم نے اپنے عم محترم مولانا محمد اکبر کشمیری کی مسند سنبھالی اور درس وتدریس اور فتویٰ نویسی میں نامور ہوئے۔

مولانا محمد نعیم کشمیری نے ۲۷۔ رمضان المبارک ۱۲۴۷ھ کو انتقال کیا۔[۸۷]

---

۸۷ تاریخ کشمیر ــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۵۔

۸۶ — محمد وجیہ کلکتوی

بہار اور بنگال کے علاقوں کو بے شمار علما و فقہا کے مولد و منشا ہونے کا فخر حاصل ہے۔ بالخصوص صوبہ بہار کے بلاد و قصبات اور دیہات میں وسیع پیمانے پر اہل علم نے درس و تدریس کے ہنگامے بپا کیے اور مخلوق خدا کو فیض پہنچایا۔ ان حضرات کے تذکرے فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں ہو چکے ہیں، زیر تصنیف کتاب میں بھی ان علاقوں کے بہت سے ماہرین فقہ اور مصنفین و مدرسین کا ذکر موجود ہے۔ ان خوش بخت حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد وجیہ تھے، جن کے والد کا نام مولا بخش اور دادا کا قاضی اکبر علی صدیقی بہاری تھا۔ یہ خاندان اصلاً صوبہ بہار سے تعلق رکھتا تھا۔ محمد وجیہ کی ولادت اور نشو و نما بھی بہار ہی کے کسی مقام میں ہوئی۔ وہ فقہ حنفیہ کے عالی قدر علما میں سے تھے۔ اپنے عہد کے بہت بڑے شیخ، جلیل القدر عالم اور مانے ہوئے فقیہ تھے۔ کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ میں رئیس المدرسین کے منصب رفیع پر فائز ہوئے اور علما و طلبا کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ کلکتہ میں قیام کی وجہ سے "کلکتوی" کہلائے۔

ابو داؤد کے شارح صاحب عون المعبود مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اپنی ایک قلمی کتاب "تذکرۃ النبلا" میں ان کا ذکر کیا ہے اور یہ کتاب نزہۃ الخواطر کے فاضل مصنف سید عبدالحی حسنی کے ذاتی کتب خانے رائے بریلی میں محفوظ ہے۔

مولانا محمد وجیہ کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ شیخ عبداللہ السراج مکی ۱۲۵۶ھ میں ہندوستان تشریف لائے تو ان سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ شیخ مکی ان کے علم و فضل اور وسعت معلومات سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی تعریف کی۔[۲۸۸]

---

[۲۸۸] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۶ بحوالہ تذکرۃ النبلا۔

۸۷ — مولانا محمدؐ یعقوب دہلوی

مولانا محمد یعقوب فاروقی دہلوی جید عالم معروف شیخ، ممتاز محدث اور فقیہ تھے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے، مولانا محمد فضل کے بیٹے اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے — ۲ ر ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے اور اپنے جلیل القدر نانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کی گودِ شفقت میں تربیت پائی۔ تفسیر جلالین اور علم نحو کی کتاب شرح جامی کے کچھ حصے اُن سے پڑھے۔ باقی کتب درسیہ شاہ رفیع الدین دہلوی سے پڑھیں۔ سندِ علم و طریقت شاہ عبدالعزیز سے حاصل ہوئی۔ ایک عرصے تک دہلی میں درس و افادے کا سلسلہ جاری رکھا اور علماء و طلبا کی ایک بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا، جن میں نواب محمد صدیق حسن خاں بھی شامل ہیں۔

۱۲۵۸ھ کو اپنے برادر کبیر حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے ساتھ دہلی سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

یہ حضرات علم و کمال کے اعتبار سے ارضِ ہند کی شمعِ فروزاں تھے۔ ان کا وجود باعثِ برکت اور موجبِ رحمت تھا۔ ان سے خلقِ کثیر نے علمی اور رُوحانی فیوض حاصل کیے اور مرتبۂ عالی پایا۔ ان کی فیض رسانیاں صرف برِصغیر پاک و ہند تک محدود نہ تھیں، پورا عالم اسلام ان کے فضل و کمال کی فراوانیوں سے سعادت اندوز ہوا۔ آج بالخصوص برِصغیر کے مختلف مقامات میں جو قال اللہ وقال الرسول کی دلنواز صدائیں بلند ہو رہی ہیں، وہ انہی پاک باز حضرات کی سعیِ مسلسل کا نتیجہ ہے۔ ان کے تعلیم و تربیت کے دائرے بہت وسعت پذیر تھے، اس عالم خاکی کی فضاؤں میں ان کے خلوص و للہیت کے جھنڈے ہمیشہ لہراتے رہیں گے اور مخلوق خدا کے علم و ادراک میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا رہے گا۔

اس عالم کبیر، محدث جلیل اور فقیہ نامدار نے جو مولانا محمد یعقوب فاروقی دہلوی کے نام سے موسوم تھے، جمعہ کے روز ۲۷ ر ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

۸۸ — مفتی محمد یوسف فرنگی محلی

مفتی محمد یوسف بن مفتی محمد اصغر بن مفتی احمد ابو الرحم بن مفتی یعقوب بن عبد العزیز انصاری فرنگی محلی لکھنوی۔

مفتی محمد یوسف ۱۲۲۳ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی گود میں پرورش پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو اپنے والد مکرم مفتی محمد اصغر انصاری سے تعلیم کا آغاز کیا۔ مفتی ظہور اللہ لکھنوی سے بھی استفادہ کیا اور مفتی نور اللہ لکھنوی کے حضور بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان تمام حضرات کو علم فقہ اور دیگر علوم میں دسترس حاصل تھی۔

مفتی محمد یوسف کے والد گرامی مفتی محمد اصغر حکومت اودھ لکھنؤ کی طرف سے وہاں کی عدالت دیوانی میں منصب افتا پر فائز تھے۔ ۱۹ ر رجب ۱۲۵۵ھ کو ان کا انتقال ہوا تو یہ عہدۂ جلیلہ لائق بیٹے کے سپرد کر دیا گیا، اس لیے کہ یہ بھی والد کی طرح علم و آگاہی کی منزلیں طے کر چکے تھے اور اصحاب فضل میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۱۲۷۲ھ تک وہ اس منصب پر متمکن رہے اور نہایت دیانت و امانت سے یہ نازک خدمت انجام دی۔ اسی اثنا میں اودھ کی حکومت ختم ہو گئی اور انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس سے عہدۂ افتا کا منصب بھی متاثر ہوا۔ اب وہ تمام امور سے منقطع ہو کر گھر میں بیٹھ گئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ تقریباً پانچ سال اسی طرح گزر گئے۔

۱۲۷۷ھ کو انھیں جون پور کے اصحاب علم نے دعوت دی اور وہ وہاں کے مدرسہ حنفیہ امامیہ کے مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۲۸۶ھ تک وہاں خدمات تدریس انجام

دیں۔ اسی اثنا میں حج بیت اللہ کا شوق پیدا ہوا، اور سفرِ حجاز پر روانہ ہو گئے۔ رمضان کے آخری دنوں میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور شوال کے آخر میں مدینہ منورہ کا عزم کیا اور مدینہ منورہ ہی میں وفات پائی۔

مفتی محمد یوسف انصاری فرنگی محلی دیارِ ہند کے مشاہیر اور کبار اساتذہ میں سے تھے۔ درس و افادہ میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور علما و طلبا نے ان سے خوب استفادہ کیا۔

اللہ نے ان کو تصنیف و تالیف کے ذوق سے بھی نوازا تھا لیکن زیادہ تر انھوں نے درسی کتابوں پر تعلیقات و حواشی سپردِ قلم کیے۔

۱۔ حاشیہ شرح سلّم، قاضی مبارک گوپاموی۔

۲۔ حاشیہ شرح سلّم، ملا حسن۔

۳۔ حاشیہ شمس بازغہ، ملا محمود جونپوری۔

۴۔ تکملہ حاشیہ شمس بازغہ، ملا حسن۔

۵۔ حاشیہ بر طبعیات الشفا۔

۶۔ حاشیہ شرح وقایہ تا مبحث مسح بالرأس۔

۷۔ تعلیقات تفسیر بیضاوی۔

۸۔ تعلیقات صحیح بخاری۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمے میں ان کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"علمائے فرنگی محل میں مفتی محمد یوسف فرنگی محلی نے ہنومان گڑھی کے جہاد کے موقع پر مولوی امیر الدین علی کی تحریک کو حکومتِ اودھ کے اشارے پر سخت نقصان پہنچایا۔ مولوی عبدالرزاق فرنگی محلی کو جہاد سے باز رکھا مجاہدین کی جماعت میں جہاد کے خلاف وعظ کہا اور جہاد کے خلاف فتویٰ دیا۔ تذکرہ علمائے فرنگی محلی نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہے۔

مفتی محمد یوسف کے ملا حسن اور میر زاہد پر حواشی کے چند نسخے دار المصنفین میں ہیں، جن میں سے ایک پر مولانا عبد الحکیم فرنگی محلی کے دستخط بتاریخ ۱۲۷۳ھ ثبت ہیں۔''

مفتی محمد یوسف حج کے موقع پر مدینہ منورہ گئے تو وہاں بیمار ہو گئے، اور ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ کو وہیں ان کا انتقال ہوا۔ جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔ ان کے ممتاز شاگردوں میں مولوی محمد فاروق چریا کوٹی شامل ہیں۔[۸۹]

۸۹ —— مولانا محمود سورتی

ارضِ ہند کے جن علاقوں میں مدت مدید تک علم کے جھنڈے گڑے رہے اور جہاں کی فضاؤں میں عرصۂ دراز تک اصحابِ فضیلت کے علم لہراتے رہے، ان میں صوبۂ گجرات کا شہر سورت بھی شامل ہے۔ اس صوبے کی خاک میں کتنے ہی علم کے خزینے مدفون ہیں اور کتنے ہی فضل و کمال کے حامل افراد اس کی مٹی میں آسودہ ہیں۔ پہلی صدی ہجری سے لے کر اب تک بزرگانِ دین کا ایک جمِ غفیر وہاں آباد ہوا، جنھوں نے قدم قدم پر اسلام کی شمعیں روشن کیں اور ایک دنیا کو راہِ حق اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی تلقین کی، وہ اپنی اس تلقین اور کوشش میں کامیاب رہے اور ان کی سعی مسلسل اور جذبۂ صادق سے اثر پذیر ہو کر بحرِ ہند کے کنارے بحیرہ عرب سے ہم آغوش ہو گئے۔

قافلۂ صدق کے ان ارکانِ باہمت میں تیرھویں صدی ہجری کے مولانا محمود بن عبد القادر بن عبد الاحد سورتی باعکنطہ کا نام بھی صفحاتِ تاریخ میں مرقوم

---

[۸۹] تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۴۸۵، ۴۸۶ — تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ص ۲۲۰، ۲۲۱ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۳۵ — تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۲۰۶ — احوالِ علمائے فرنگی محل ص ۸۲، ۸۳ — حدائق الحنفیہ ص ۴۸۶۔

ہے، جو شافعی المسلک فقیہ تھے اور اصول اور علوم عربیہ میں کامل درک رکھتے تھے۔ محمود باعکنظہ سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اپنے عمِ محترم مولانا ابراہیم بن عبدالاحمد باعکنظہ سے علم حاصل کیا جو وقت کے کبار علمائے سورت میں سے تھے اور جن کا انتقال ۲۷ رجب ۱۲۸۲ھ کو ہوا۔

مولانا محمود سورتی فحول علما میں سے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ ان کا تجارتی کاروبار بہت وسیع تھا اور ہر لحاظ سے لوگ اُن سے متاثر تھے۔ اس دور کے ہر طبقۂ فکر کے لوگ مسائل شرعی میں انہی سے رجوع کرتے تھے اور ان کے فتوے کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

اس فقیہ نامدار نے غرۂ ربیع الاوّل ۱۲۸۶ھ کو سورت میں وفات پائی۔[۹۰]

۹۰۔ مولانا محمود جون پوری

یو۔پی کے شہر جون پور کو شیراز ہند کہا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ کسی زمانے میں مجمع علما اور مرکز اہل کمال تھا۔ یہ شہر پورب میں واقع ہے اور علمی اعتبار سے اس کی تاریخ نہایت شان دار ہے۔ ہر دور میں یہ ایک مردم آفریں قطعۂ ارض رہا اور اس کی زرخیز مٹی سے بکثرت اربابِ فضل پیدا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس کے باکمال ارکان میں سے مولانا محمود بن کرامت علی بن امام بخش صدیقی جون پوری کا نام کتب تذکرہ و رجال میں مذکور ہے۔ یہ مسلکاً حنفی تھے، اور اپنے زمانے کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔

مولانا محمود کی ولادت و تربیت جون پور میں ہوئی۔ ان کے والدِ گرامی مولانا کرامت علی جون پوری کا شمار اکابر فقہائے ہند میں ہوتا تھا، ان کی وفات ۳ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ کو بنگال کے شہر رنگ پور میں ہوئی۔ لائق بیٹے نے

---

[۹۰] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۶ بحوالہ حقیقت سورت۔

بہت سی درسی کتابیں باپ سے پڑھیں۔ ان کے بھائی احمد بھی جلیل القدر علما کے زمرے میں گردانے جاتے تھے، کچھ کتابوں کی تکمیل ان سے کی۔ پھر عازمِ لکھنؤ ہوئے۔ وہاں مفتی یوسف انصاری لکھنوی کا سلسلۂ درس جاری تھا اور وہ اپنے عہد اور علمائے کبار اساتذہ میں سے تھے، مولانا محمودؒ جون پوری نے ان سے اکتسابِ علم کیا۔ ایک بزرگ شیخ عبداللہ قندھاری تھے، ان سے فنونِ ریاضی کی تعلیم حاصل کی تصوّف وسلوک سے بھی لگاؤ تھا۔ اس کے لیے اپنے والد محترم مولانا کرامت علی سے وابستہ رہے۔

علوم رسمیہ اور فنونِ متداولہ سے فارغ ہونے کے بعد مولانا محمود جون پوری نے خود تدریس و تذکیر کا سلسلہ شروع کیا اور اللہ کی مخلوق کو فیض یاب کرنے کی طرح ڈالی۔ بہت اچھے واعظ تھے اور نماز جمعہ کے بعد بالالتزام جامع مسجد میں وعظ کہتے تھے، جس میں جون پور شہر اور قرب وجوار کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ باہمت اور مستقل مزاج عالم دین تھے۔ ابتدائے قرآن سے سلسلۂ وعظ شروع کیا تھا جو طویل عرصے تک چلا۔

مولانا ممدوح بہت بڑے فقیہ تھے اور علوم میں درک رکھتے تھے۔ متدین و متقی، عابد و زاہد، ذکی و فہیم اور صاحبِ ورع و دیانت تھے۔ ۱۲۹۶ھ کی کوئی تاریخ تھی کہ اچانک نمازِ عشا کے بعد رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔[۹۱]

۹۱۔ مولانا محمود بخش صدیقی کاندھلوی

کاندھلہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک مشہور شہر ہے، جس کے متعدد علماءُ فقہا کا تذکرہ سلسلہ فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں بعض مقامات پر ہوچکا ہے۔ یہ شہر دہلی سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ تیرھویں صدی ہجری

۹۱ؔ مفید المفتی ص ۱۴۵، ۱۴۶ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۶

ہیں کاندھلہ میں ایک بزرگ مولانا محمود بخش پیدا ہوئے، جن کے والد کا نام شیخ الاسلام، دادا کا قطب الدین اور پر دادا کا عبد القادر تھا۔ نسباً صدیقی تھے۔

مولانا محمود بخش متقی اور صالح عالم دین تھے۔ علم فقہ اور باقی علوم رسمیہ میں درک رکھتے تھے۔ صاحبِ تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی کی اولاد سے تھے اور ہر اعتبار سے اچھی شہرت کے مالک تھے — کاندھلہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ان کے بڑے بھائی اپنے دور کے ذی علم آدمی تھے۔ محمود بخش نے انہی سے تعلیم کا آغاز کیا اور تمام مروجہ علوم کی کتابیں نہایت محنت اور توجہ سے پڑھیں، یہاں تک کہ علم میں پختگی حاصل ہوگئی، فتویٰ نویسی کے اہل قرار پائے اور تدریس کی ذمے داریاں سنبھال لیں۔

مولانا محمود بخش صدیقی کاندھلوی کا شمار ممتاز علما میں ہوتا تھا۔ حلیم الطبع متواضع، منکسر المزاج، عالی کردار، اخلاقِ حسنہ کی دولت سے مالا مال اور عبادت گزار عالم تھے۔ درس و تدریس کو مشغلۂ حیات قرار دے لیا تھا، ہمیشہ اسی میں مصروف رہے اور اسی کارِ خیر میں زندگی بسر کر دی۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا جو تبلیغ اسلام اور ترویج علم کا ذریعہ بنے۔

کاندھلے کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲۸۵ھ کو وفات پائی[۹۲]۔

۹۲ — مولانا محی الدین عثمانی بدایونی

علمائے بدایوں میں مولانا محی الدین عثمانی بدایونی حلقۂ اہل علم میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ والد کا نام عبد القادر اور دادا کا فضل رسول تھا۔ مشاہیر فقہائے احناف میں سے تھے۔ ۱۲۴۳ھ کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ خاندان کے تمام افراد پڑھے لکھے تھے۔ محی الدین نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو والد کے حلقۂ درس

---

[۹۲] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۷

میں شامل ہوئے اور کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ اخذِ طریقت بھی انہی سے کیا۔ اپنے مذہب و مسلک میں نہایت متعصب تھے اور مخالفوں پر شدت سے تنقید کرتے تھے۔ اس ضمن میں کسی قسم کی رواداری یا مداہنت کے قائل نہ تھے۔ ان کا اصل مشغلہ تصنیف و تالیف اور فتویٰ نویسی تھا۔ اس میں اُنھوں نے بہت نام پیدا کیا اور مختلف مسائل کی اپنے خاص نقطۂ نظر سے وضاحت کی۔ بعض کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔ ان کی تعلیقات و حواشی اور تصنیفات میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں:-

۱۔ حاشیہ میر زاہد رسالہ۔

۲۔ حاشیہ کلیاتِ قانون بوعلی سینا۔

۳۔ شمس الایمان: ردِّ وہابیت میں ایک رسالہ۔

مولانا محی الدین بدایونی نے جو معقولات و منقولات کے ماہر علما میں سے تھے، ۶ ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ کو سہارن پور میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۹۳]

۹۳۔ سیّد محی الدین ویلوری

جنوبی ہند میں تیرھویں صدی ہجری کے جن علما و فقہا نے خدماتِ دینی سرانجام دیں ان میں سیّد محی الدین ویلوری قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۲۰۷ھ ان کا سالِ ولادت ہے۔ عارف باللہ، عالمِ اجل اور حافظِ قرآن تھے۔ تفسیر و حدیث اور فقہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن ویلور میں ایک مدرسہ قائم کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ علاقہ مدراس میں علم کی جو روشنی پھیلی، وہ اُن کے فیضِ عام کا پرتو ہے۔ ہمیشہ

۹۳؎ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۲ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۷، ۴۶۸۔
ــــ تذکرۃ الواصلین، ص ۲۵۵۔

تعلیم و تدریس کی مسند بچھائے رکھی اور علما و طلبا کی کثیر تعداد کو مستفید فرمایا۔
سید ممدوح تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں مندرجہ ذیل کتابوں کے نام کتب تذکرہ و رجال میں محفوظ ہیں۔

۱۔ جواہر الحقائق۔

۲۔ فصل الخطاب۔

۳۔ جواہر السلوک۔

اس نامور عالم و فقیہ نے ۳۔ محرم ۱۲۸۹ھ کو مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔
وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے مولوی رکن الدین باپ کے جانشین ہوئے[۹۲]

۹۴ــــ شاہ مخصوص اللہ دہلوی

خاندان ولی اللہی کے ممتاز رکن شاہ عبدالرحیم دہلوی کے پرپوتے، شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ رفیع الدین دہلوی کے بیٹے شاہ مخصوص اللہ دہلوی بہت سی خصوصیات کے حامل تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

تدین و تقویٰ، رشد و صلاح، زہد و عبادت اور فقاہت و فراست میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مدرسے میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔ ان کے تلامذہ کی وسعت پذیر فہرست میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کا اسم گرامی شامل ہے۔

جدل و نزاع سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ کبھی کوئی ایسی بات نہ کی جو دوسرے کے لیے تکلیف و اذیت کا باعث ہو۔ تدریس و تعلیم اور تبلیغ و

۹۲ء تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۲۔

اشاعت کا وہی انداز اختیار کیے رکھا جو آبا و اجداد کا تھا۔ دہلی میں جب وہابیت اور اصحاب مقابر کے درمیان نزاع پیدا ہوا، اور فریقین کے اسلوب کلام میں شدت آئی تو شاہ صاحب ممدوح نے خاموشی کو ترجیح دی۔ اور اپنی توجہ صرف درس و تدریس تک محدود رکھی۔ آخر عمر میں سلسلۂ درس و تدریس سے بھی کنارہ کش ہو گئے تھے اور گوشہ نشینی اختیار کر کے صرف ذکر الٰہی اور اللہ کی عبادت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ان کی زندگی نمونۂ اسلاف تھی۔ تمام علوم متداولہ پر یکساں عبور تھا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ قمری حساب سے رمضان ۱۲۷۳ھ میں بپا ہوا تھا۔ تذکرہ علمائے ہند کی روایت کے مطابق شاہ صاحب نے اسی سال یعنی ۱۲۷۳ھ میں وفات پائی، مہینے اور تاریخ، کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن نزہۃ الخواطر میں بتایا گیا ہے کہ جنگ آزادی سے تقریباً دو سال قبل ۱۳۔ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ کو راہیٔ ملک بقا ہوئے [۹۵]

۹۵ ـــــ مولانا مراد اللہ لکھنوی

لکھنؤ کے انصاری خاندان میں ایک بزرگ مولانا مراد اللہ بن نعمت اللہ بن نور اللہ انصاری لکھنوی گزرے ہیں جو علم و مشیخت اور فقاہت میں تیرھویں صدی ہجری میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے اور فقہائے حنفیہ میں مختلف علوم سے متعلق خاص شہرت کے مالک تھے۔

مراد اللہ کا مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ ان کے والد مفتی نعمت اللہ لکھنوی تھے جو اپنے عہد کے جیّد عالم تھے اور علم و فضل کی وجہ سے فیض آباد کے منصب افتا

---

۹۵ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۳ ـــــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۸، ۴۶۹
ـــــ حیات ولی ص ۶۳۴، ۶۳۵ ـــــ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۱۳، ۱۱۴

پر متمکن ہو گئے تھے۔ مراد اللہ نے انہی سے علم حاصل کیا اور ایک عرصے تک ان سے منسلک رہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد لکھنؤ میں خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور طویل مدّت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

لکھنؤ سے عازم گجرات ہوئے اور بڑودہ میں سلسلۂ درس شروع کیا۔ وہاں بھی کثیر تعداد میں اہلِ علم ان سے مستفید ہوئے ۔۔ وہیں سے ۱۲۷۹ھ کو حج بیت اللہ کا عزم کیا اور حج و زیارت کی نعمت سے متمتع ہوئے حجاز سے واپس وطن آرہے تھے کہ مرض اسہال میں مبتلا ہوئے اور اسی عارضے سے اپنے والد (مفتی نعمت اللہ) کی زندگی میں وفات پائی۔ ان کا سنِ وفات ۱۲۸۱ھ ہے [۹۶]

مفتی نعمت اللہ کا انتقال اس سے اٹھارہ سال بعد ۱۲۹۹ھ کو ہوا رحمہا اللہ تعالیٰ۔

۹۶ ـــــ سیّد مُرتضیٰ حسینی لکھنوی

لکھنؤ ہی کے ایک اور عالم سید مرتضیٰ بن مصطفیٰ بن اسد علی بن عبدالبدیع بن محی الدین حسینی لکھنوی تھے، جن کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر فقہا اور جیّد علما میں ہوتا تھا۔

سیّد مرتضیٰ حسینی کی نشو و نما لکھنؤ شہر میں ہوئی اور اپنے چچا سید مخدوم حسینی سے جو اس دور کے ممتاز عالم اور مدرس تھے، حصول علم کا آغاز کیا۔ حدیث اور فقہ کی کتابیں انہی کے حلقۂ درس میں پڑھیں۔ پھر منطق اور فلسفے کی طرف

---

۹۶ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۶۹، ۴۷۰

متوجہ ہوئے تو اس کے لیے مولانا محمد مبین انصاری لکھنوی سے رجوع کیا اور ان کی خدمت میں رہ کر ان علوم کی تکمیل کی۔ پھر دل میں علمِ طب کے حصول کا شوق پیدا ہوا تو اس عہد کے مشہور طبیب حکیم رضی الدین امروہوی کے دروازے پر دستک دی اور اُن سے علم طب پڑھا۔

سیّد مرتضیٰ حسینی تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو چکے تو لکھنؤ میں انگریزوں کی سفارت میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسی سلسلے میں کلکتے بھی گئے اور ایک عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے اور اودھ کے نواب سعادت علی خاں کے دورِ حکومت میں لکھنؤ کی مسندِ افتا پر متمکن ہوئے اور وہاں کے مفتی قرار پائے۔

اب سفرِ حیات نے ایک اور موڑ کاٹا اور غازی الدین حیدر کے ایّام حکومت میں امیر المجاہدین سیّد احمد شہید سے رابطہ قائم ہوا۔ ان کے تدین و تقویٰ سے متاثر ہو کر ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے۔

نصیر الدین حیدر کے زمانے میں منصبِ افتا سے استعفیٰ دے دیا تھا اور تمام علائق سے منقطع ہو کر یادِ خدا کو ہمہ وقتی معمول ٹھہرا لیا تھا۔

سید مرتضیٰ حسینی کی ایک قلمی کتاب کا نام "کشکولا" ہے جس میں صرف و نحو، لغت و بلاغت اور علوم ادبیہ کے اہم مسائل جمع کیے گئے ہیں۔ سید ممدوح کا خط نہایت عمدہ تھا۔

اس عالم و فقیہ نے جمعہ کے روز ۸ شوال ۱۲۵۰ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی۔[۹۶]

۹۷- سیّد مرتضیٰ بلگرامی زبیدی

ارضِ ہند کے جن اصحاب علم اور اربِ کمال کی شہرت پوری اسلامی دُنیا

---

۹۶ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۷۰۔

ہیں پہلی، ان میں سید مرتضیٰ بن محمد بن قادری بن ضیا۔ اللہ حسینی واسطی بلگرامی کا اسمِ گرامی لائقِ تذکرہ ہے۔ وہ تیرھویں صدی ہجری کے شیخ و امام، عالم و محدث اور ماہرِ فقہ و لغت تھے۔ علمِ نحو، ادب و معانی، اصول و کلام اور انساب میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ شعر و شاعری میں درک حاصل تھا۔ وہ ہندوستان کی سکونت ترک کر کے علاقہ یمن کے ایک مقام "زبید" میں جا بسے تھے، اس لیے زبیدیؒ کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں بلگرام کے بہت سے اہلِ علم کا تذکرہ ہو چکا ہے، اس شہر میں متعدد علما و فقہا اور زہاد نے جنم لیا اور اپنی بے پناہ خدمات کی بنا پر بے حد شہرت پائی۔

بلگرام فضل و کمال کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا ہے۔ یہ ایک مردم خیز شہر تھا۔ نہایت ذہین و فطین لوگ اس میں پیدا ہوئے۔ اس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع ہردوئی کا ایک بہت قدیم اور مشہور قصبہ ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ٹھٹیرے آباد تھے، جن کو قنوج کے راجپوتوں نے حملہ کر کے شہر سے نکال دیا تھا اور اس پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں بلگرام، قنوج سرکار کے ماتحت ایک پرگنہ تھا۔

محمود غزنوی نے جب ہندوستان پر حملے کیے تو ۴۰۹ھ (۱۰۱۸ء) میں قاضی محمد یوسف عثمانی گازرونی نے اس شہر کو فتح کیا اور یہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ غزنوی سلطنت زوال پذیر ہوئی تو مقامی ہندوؤں نے مسلمان حکمران کو بلگرام سے مار بھگایا اور اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس وقت بلگرام کا حاکم راجہ سری کو بنایا گیا تھا، اس نے اس شہر کا نام بدل دیا اور اپنے نام پر اس کا نام "سری نگر" رکھا۔

سلطان شمس الدین التمش کے عہدِ حکومت میں ابو الفرح واسطی کے ایک جانشین سید محمد صغریٰ نے ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں ایک مضبوط اور مسلح شاہی

فوج کے ساتھ بلگرام پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ مسلمانوں کا اس پر دوبارہ قبضہ تھا۔ اب اس کا نام بدل دیا گیا اور اسے سری نگر کے بجائے پھر "بلگرام" کہا جانے لگا۔

۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) کو اس شہر میں مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی فوجوں کے درمیان زبردست معرکہ ہوا تھا، جس میں ہمایوں کی فوج کو شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا ــــ ۱۰۰۲ھ کو جلال الدین اکبر بادشاہ نے ایک فرمان کے ذریعے اس شہر میں شراب اور دیگر منشیات کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔

بلگرام کے سادات جو وہاں کے عثمانی اور فرشوری شیوخ پر ہر میدان میں سبقت لے گئے تھے، تصنیف و تالیف، علم و ادراک، شعر و ادب اور عمل و تدبیر میں ممتاز ہوئے۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات نے بالخصوص بہت نام پایا۔

۱۔ سید محمد طاہر بلگرامی:۔ متعدد اوصافِ علمی کے حامل تھے۔ ۹۵۰ھ کو وفات پائی۔

۲۔ میر سید عبد الواحد بلگرامی:۔ کئی کتابوں کے مصنف اور شارح ہیں، شاہدی تخلص کرتے تھے۔ ان کی ایک مشہور کتاب سبع سنابل ہے۔ ۳ رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ کو فوت ہوئے۔

۳۔ سید فیروز مدگرامی:۔ ممتاز فقیہ اور عالم تھے۔ ۵ محرم ۱۰۶۶ھ کو رحلت فرمائی۔

۴۔ قاضی یوسف بلگرامی:۔ عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بلگرام کے منصبِ قضا پر متمکن تھے۔ ۵ ذلقعدہ ۱۰۸۴ھ کو انتقال ہوا۔

۵۔ سید ضیاء اللہ بلگرامی:۔ علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ ۲۵ شعبان ۱۱۰۴ھ کو عالمِ آخرت کی راہ لی۔

۶ ۔ میر سیّد عبد الواحد بلگرامی :۔ واحد اور ذوقی ان کا تخلص تھا۔ ہندی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ۲ محرم ۱۱۳۴ھ کو قتل ہوئے۔

۷ ۔ سیّد عبد الجلیل بلگرامی :۔ علامۂ وقت اور شیخ دوراں تھے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ کو دہلی میں انتقال ہوا، اور ان کی وصیّت کے مطابق ۶ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ کو ان کی میت بلگرام لے جا کر ان کے والد میر سیّد احمد بلگرامی کے پہلو میں دفن کی گئی۔

۸ ۔ سیّد طفیل محمّد بلگرامی :۔ معقول و منقول کے جامع تھے۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔

۹ ۔ سیّد طیّب بلگرامی :۔ فضلا و شیوخ میں سے تھے۔ ۷ رجب ۱۱۵۲ھ تاریخِ وفات ہے۔

۱۰ ۔ سیّد آل محمد بلگرامی :۔ علومِ ظاہری و باطنی اور رفعہ میں اُونچے مرتبے کے مالک تھے۔ ۱۵ رمضان ۱۱۶۴ھ کو راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔

۱۱ میر سید محمد شاعر بلگرامی :۔ جلیل القدر عالم اور بہترین شاعر تھے۔ ۱۴ ربیع الاوّل ۱۱۰۱ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۱۸۵ھ کو انتقال کیا۔

۱۲ ۔ میر سیّد غلام علی آزاد بلگرامی :۔ دیارِ ہند کے نہایت مشہور عالم اور بہت بڑے مصنّف، مورخ اور شاعر تھے۔ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۰۰ھ کو وفات پائی۔

۱۳ ۔ سیّد علی بلگرامی :۔ مشہور فرانسیسی محقق ڈاکٹر لیبان کی کتاب کا "تمدّن عرب" کے نام سے ترجمہ کیا۔ ۱۳۲۹ھ کو ہردوئی میں فوت ہوئے۔

اسی بلدۂ علم و عرفان کے ایک بزرگ سیّد مرتضیٰ بلگرامی تھے، جن کے آباؤ اجداد عراق کے شہر "واسط" کے رہنے والے تھے۔

سیّد مرتضیٰ ۱۱۴۵ھ کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو

اپنے شہر (بلگرام) کے اساتذہ سے حصولِ علم کا آغاز کیا۔ پھر وہاں سے نکلے اور یو پی کے ایک شہر "سندیلہ" پہنچے۔ سندیلہ کے بعض علما سے استفادہ کرنے کے بعد "خیر آباد" کا عزم کیا اور وہاں کے اہلِ علم سے مستفید ہوئے۔ خیر آباد سے الٰہ آباد گئے، الٰہ آباد میں اس وقت دیارِ ہند کے ممتاز عالم مولانا محمد فاخر الٰہ آبادی کا ہنگامۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے۔ بعد ازاں دہلی کے لیے رختِ سفر باندھا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے حلقۂ تدریس میں شرکت کا اعزاز حاصل کیا، پھر "سورت" پہنچے، جسے اس زمانے میں اہلِ کمال کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ وہاں مولانا خیر الدین بن زاہد سورتی کے دائرۂ شاگردی میں شمولیت کی اور سال بھر وہاں اقامت گزیں رہے۔ سورت سے ۱۱۶۴ھ کو حجاز مقدّس روانہ ہوئے، وہاں سے "زَبید" کا عزم کیا جو علاقۂ یمن میں واقع ہے اور جسے اُس عہد میں "دار العلم" کی حیثیت حاصل تھی۔ زَبید کے متعدد علما و اساتذہ کے حضور دامنِ ادب تہہ کیا۔

سیّد مرتضیٰ کو چاروں مذاہبِ فقہ کے علما و مشائخ سے سند و اجازہ کا شرف حاصل ہوا اور مختلف بلاد و امصار کے اہلِ علم سے استفادے کے مواقع میسّر آئے۔ ان کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے اور یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے عصر اور علاقوں میں علمی اعتبار سے بہت اُونچے درجے کے مالک تھے۔

سیّد ممدوح متعدد مرتبہ مکّہ مکرمہ گئے اور انھوں نے کئی حج کیے، وہاں کے بہت سے اصحابِ فضل سے ملاقات کی اور ان سے مستفید ہوئے۔ پہلی دفعہ ۱۱۶۴ھ کو مکّہ مکرمہ گئے تو سیّد عبد الرحمٰن عیدروس سے ملاقات ہوئی اور ان سے بعض کتابوں کا درس لیا اور پھر اُن سے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔

سیّد عبد الرحمٰن عیدروس وسیع القلب اور عالی فکر عالم تھے۔ ایک دفعہ اُنھوں نے سیّد مرتضیٰ کے سامنے مصر کے علما و امرا اور ادبا و شعرا کی اس انداز سے تعریف کی کہ وہ اس سے بہت متاثر ہوئے اور حریمِ دل میں مصر جانے اور وہاں

کے اہلِ علم سے ملاقات کا شوق کروٹ لینے لگا چنانچہ وہ ۹ صفر ۱۱۶۷ھ کو مصر پہنچے اور وہاں کے ایک مقام "خان الصاغة" میں اقامت اختیار کی۔ اُس وقت مصر میں بہت سے جیّد علما مصروفِ استفادہ تھے، سیّد مرتضیٰ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے فیض حاصل کرنے لگے۔ ان تمام علما و اساتذہ نے ان کو سند و اجازہ سے مفتخر فرمایا اور اس ہندی عالم کے علم و فضل، جودتِ طبع، حفظ و اتقان، فہم و فراست، وسعتِ نظر اور عمقِ فکر کا لوہا مانا اور حدیث و فقہ میں ان کے عبور و استحضار کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ اب مزید تعلیم اور علما سے ملاقات کے لیے انھوں نے علاقۂ مصر کے دیگر مقامات کا رُخ کیا۔ وہ "رُشید" اور "دمیاط" پہنچے اور وہاں کے اہلِ علم سے سماعِ حدیث کیا۔ پھر "اسیوط" اور "بلادِ صعید" کو روانہ ہوئے اور وہاں کے علما سے شرفِ لقا حاصل کیا۔

کم و بیش تین سو علما سے مستفید ہونے کے بعد اُنھوں نے شادی کی اور "عطفة الغسال" میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہاں ایک ایسی عظیم الشان کتاب کی تصنیف کا آغاز کیا جس کی وجہ سے ان کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور عالمِ اسلام کے تمام اطراف و اکناف میں ان کے علوِّ مرتبت اور رسوخ فی العلم کی دھوم مچ گئی۔ یہ کتاب لغت سے متعلق ہے اور اس کا نام "تاج العروس" ہے۔ یہ کتاب اُنھوں نے دس ضخیم جلدوں میں مکمل کی اور اس کی تصنیف پر چودہ سال دو مہینے صَرف ہوئے۔ اس کی تصنیف کے بعد مصنفِ نامدار نے ایک عظیم دعوت کا اہتمام کیا، جس میں بہت سے شیوخِ وقت، علمائے عصر اور طلبائے علم شریک ہوئے، جنھوں نے بالاتفاق ان کی فضیلتِ علمی، وسعتِ معلومات اور فنِ لغت میں ان کی مہارتِ تامہ کی شہادت دی اور ان کے فضل و کمال کو بے حد خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان کے تبحّرِ علمی کی دل کھول کر تعریف کی اور ان کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کیا اور انھیں مستحقِ تعظیم و تکریم گردانا۔

۱۱۸۹ھ کے اوائل میں وہ قاہرہ (مصر) کے ایک علاقہ "سویقۃ اللالہ" میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہاں کے علما و زعما نے ان سے از حد اکرام و توقیر کا برتاؤ کیا اور بہت سے ہدایا و تحائف ان کی خدمت میں پیش کیے۔ اس علاقے میں انھوں نے پند و موعظت کا سلسلہ شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اس نواح میں ان کی شہرت پھیل گئی اور قرب و جوار سے عوام و خواص کثیر تعداد میں ان کی مجالسِ علمیہ میں حاضر ہونے لگے۔ وہ چونکہ غیر ملکی تھے اور ان کی وضع قطع علمائے مصر سے ہم آہنگ نہ تھی۔ پھر وہ فارسی، ترکی اور کرجی زبانوں سے بھی خوب آشنا تھے اور ان میں روانی سے گفتگو کرتے تھے، لہٰذا لوگوں نے ان کی بہت مالی امداد کی اور انھیں مال و دولت سے بے نیاز کر دیا۔

اس علاقے میں علمی اعتبار سے ان کا اس درجے شہرہ ہوا کہ وہاں کے علما و طلبا اچھی خاصی تعداد میں اُن سے درسِ حدیث لینے لگے اور اس باب میں چند ہی روز میں وہ مرجعِ خلائق ہو گئے۔

وہ حاضرینِ مجلس کو حدیث مسلسل بالاوّلیّۃ سُناتے اور اس سماع کی بنا پر انھیں تحریری سند و اجازہ مرحمت فرماتے۔ ایک مرتبہ چند علمائے ازہر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازہ کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا "بنیادی کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے" چنانچہ انھوں نے آپ سے تنہائی میں صحیح بخاری پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ صحیح بخاری کا درس شروع ہوا تو بہت سے علما اس میں شریک ہونے لگے، جن میں بعض کتب خانوں کے مہتمم اور مساجد کے متولی بھی تھے۔ اس سے سیّد مرتضیٰ کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا، اور اہلِ علم کے حلقوں میں ان کو پہلے سے کہیں زیادہ احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ حاضرینِ درس کی تعداد بہت بڑھ گئی اور دُور و نزدیک سے علما و طلبا استفادے کی غرض سے شاملِ درس ہونے لگے۔ صحیح بخاری کے اس درس میں وہ ایسے علمی و فنی اور لغوی و فقہی نکات بیان کرتے جو اس سے

قبل مصر کے مدرسین و اساتذہ نے کسی سے نہ سُنے تھے۔ لوگ اس سے نہایت متاثر بھی ہوتے اور ان کے وسعتِ معلومات پر اظہارِ تعجّب بھی کرتے۔ ان کا اسلوبِ کلام اور اندازِ بیان ایسا تھا کہ مشکل سے مشکل مسائل کی پیچیدہ گرہیں سامعین کے سامنے کھلتی چلی جاتیں۔

صحیح بخاری کے اس درس کے علاوہ شہر کی ایک بڑی مسجد میں ایک اور درس کا اہتمام کیا گیا۔ اس درس کے لیے ہفتے میں کچھ دن مقرر تھے۔ جن دنوں بخاری کا درس نہیں ہوتا تھا، ان دنوں میں نماز عصر کے بعد سیّد مرتضیٰ شمائلِ ترمذی پڑھاتے تھے۔ اس درس کی وجہ سے ان کی شہرت و عظمت کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔ درس کا طریقہ مصری علما کے مروّجہ طریقے سے مختلف تھا، اس لیے طلبا و علما اس میں کثیر تعداد میں شریک ہوتے اور بہت دلچسپی لیتے۔

علاقے کے بعض متموّل افراد اور اصحاب ثروت نے بھی اپنے گھروں میں ان کے درس و تدریس کا انتظام کیا۔ جب وہ درس کے لیے کسی کی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے تو اُونچے ذہن و فکر کے کچھ طلبا اور مقری اور کاتب ان کے ساتھ ہوتے۔ درس کے وقت ان کے سامنے عنبر، عود اور لوبان جلایا جاتا اور تمام صحن یا کمرۂ درس خوشبو سے معطر ہو جاتا۔ درس کے اختتام پر سیّد مرتضیٰ اپنے خاص انداز سے درود شریف پڑھتے اور پھر تمام شرکائے درس کے نام لکھ لیے جاتے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کے نام بھی ضبطِ تحریر میں لائے جاتے، دن اور تاریخ بھی لکھی جاتی اور آخر میں سید مرتضیٰ ناموں کی اس فہرست کے نیچے اپنے دستخط ثبت فرماتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔

۱۱۹۱ھ میں عبدالرزاق آفندی جو اپنے علاقے کے بہت بڑے رئیس تھے، رُوم (ترکی) سے مصر تشریف لائے۔ ان کو سیّد مرتضیٰ کے درسِ حدیث کا پتا چلا اور اس کی شہرت ان کے کانوں تک پہنچی تو ملاقات کے لیے حاضر ہوئے اور ان سے مقاماتِ حریری پڑھانے کی درخواست کی۔ چنانچہ ان کی درخواست منظور ہوئی

اور وہ مقاماتِ حریری پڑھنے لگے۔ سیّد ممدوح اس طریقے سے انھیں مقاماتِ حریری پڑھاتے کہ الفاظ کے لغوی معنے ان کے ذہن میں پیوست ہوتے چلے جاتے۔

ایک دفعہ محمد پاشا ان کی خدمت میں آیا اور پہلی ہی ملاقات میں ان کی فراوانیٔ علم سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان کی کفالت اپنے ذمے لے لی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ان کے تبحرِ علمی کا ہر سو چرچا تھا اور اہلِ علم پر ان کے فضل و کمال کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ دُور دراز کے قبائل کے لوگ ان سے پوری طرح باخبر ہو گئے تھے۔ تمام اسلامی ملکوں کے اساتذہ و علما ان سے متاثر بلکہ مرعوب تھے اور ہر علاقے میں ان کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مختلف ممالک و قبائل کے اربابِ علم اور اصحابِ حکومت کی طرف سے انھیں خطوط آتے اور تحائف پیش کیے جاتے تھے۔ حجاز، ترکی، ہندوستان، یمن، نجد، شام، بصرہ، عراق، سوڈان، فزان اور الجزائر وغیرہ ممالک کے سلاطین و امرا کی طرف سے خطوط اور وفود آتے اور ہر ملک کی جانب سے وہاں کا کوئی خاص تحفہ نہایت عقیدت و احترام سے ان کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔ ایک مرتبہ حاکمِ فزان نے ایک عجیب و غریب شے پیش کی جس کی شکل بھیڑ کی سی تھی اور سر بچھڑے کا سا۔ یہ تحفہ سیّد مرتضیٰ نے سلطانِ ترکی عبدالحمید کی اولاد کو بطور ہدیہ بھیج دیا تھا۔

عرب کے مغربی ممالک کے لوگ تو اُن سے انتہائی متاثر تھے اور کہا کرتے تھے کہ جو شخص حج کرنے گیا اور مرتضیٰ زبیدی کی زیارت سے محروم رہا تو گویا اس کا حج ادھورا رہا — ایامِ حج میں ان کی قیام گاہ پر لوگوں کا ہمیشہ ایک ہجوم رہتا اور ہر شخص کے ہاتھ میں سیّد مرتضیٰ کے نام ایک خط ہوتا۔ جس شخص کو سیّد ممدوح کی طرف سے اس کے خط کا تحریری جواب مل جاتا، وہ اس کو نہایت متبرک سمجھتا اور بحفاظتِ تمام اپنے پاس رکھتا اور اِسے اپنے سفرِ حج کی نشانی قرار دیتا۔ وہ یہ بھی یقین رکھتا کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا — جس شخص کو اُس کے خط کا جواب نہ ملتا وہ حسرت و افسوس کا اظہار کرتا اور لوگ اُسے لائقِ ملامت ٹھہراتے۔

سید مرتضیٰ بہت بڑے شاعر بھی تھے اور ان کے شعر بہت مشہور ہیں، ان کی اہلیہ نے ۱۱۹۴ھ کو وفات پائی۔ اس سے وہ نہایت مغموم ہوئے۔ اس موقع پر انھوں نے بعض انتہائی دردناک شعر کہے، جن میں سے چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:

مضت فمضت عنی بها کل لذة ‏ تقربها عینای فانقطعا معا

لقد شربت کاساً سنشرب کلنا ‏ کما شربت لم یجد عن ذاک مدفعا

فمن مبلغ صحبی بمکة اننی ‏ بکیت فلم اترک لعینی مدمعا

یعنی وہ اس دنیا سے چلی گئی اور اس کے جانے کے ساتھ ہی دنیا کی تمام لذتیں ختم ہوگئیں۔

اس نے موت کا پیالہ پی لیا اور عنقریب ہم سب اسے اسی طرح پئیں گے جیساکہ اس نے پیا، موت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

میرے دوستوں میں سے مکّے میں کون یہ پیغام پہنچائے گا کہ میں اتنا رویا کہ آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ باقی نہ رہا۔

بیوی کی وفات ان کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا اور اس صدمے سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ گوشہ نشینی اختیار کرلی اور اپنے گھر کا دروازہ بند کرکے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد کسی کے تحفے تحائف قبول نہیں کیے۔

سید مرتضیٰ زبیدی کا جسم کمزور اور رنگ سنہری تھا۔ داڑھی معتدل اور باریک تھی۔ ہمیشہ عمدہ لباس پہنتے اور خوش وخرم رہتے تھے۔ لیکن بیوی کی وفات کے بعد چہرے سے خوشی کے آثار معدوم ہوگئے تھے اور حزن وملال کے نشان اُبھر آئے تھے۔

ان کی تصنیفات کی تعداد سو سے زیادہ ہے، جن میں سے بعض چھپ چکی ہیں اور بہت سی بصورتِ مخطوطات بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اتحاف السادة المتقین بشرح احیاء علوم الدین:۔ یہ مطبوعہ ہے۔

مطبع امینیہ قاہرہ نے ۱۳۱۱ھ کو بیس ضخیم جلدوں میں شائع کی۔ فاس (مراکش) میں ۱۳۰۲ھ سے ۱۳۰۴ھ تک تیرہ جلدوں میں طبع ہوئی۔

۲۔ تاج العروس فی شرح القاموس :۔ فن لغت میں نہایت عمدہ تصنیف ہے جو دس ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے، جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، مصنفِ شہیر نے یہ کتاب چودہ سال اور دو مہینے میں مکمل کی۔ اس کتاب کی وجہ سے انھوں نے انتہائی شہرت حاصل کی اور یہ کتاب اہل علم میں بہت مقبول ہوئی۔ ان کی زندگی ہی میں اسے قبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس کا ایک نسخہ بادشاہِ روم (ترکی) نے کتابت کرا کے اپنے کتب خانے میں محفوظ کیا۔ ایک نسخہ سلطان دارفور نے لکھوایا۔ ایک نسخہ سلطانِ مغرب نے اپنے لیے کتابت کرایا۔ ایک امیر اللواء محمد بیگ الوالاہیہ نے طلب کیا اور اپنی مسجد کے اس کتب خانے میں محفوظ کیا جو جامع ازہر کے قریب ہے۔ یہ نسخہ اُس نے ایک ہزار ریال میں حاصل کیا تھا۔ یہ کتاب اب جدید انداز میں کویت سے شائع ہو رہی ہے۔ کئی جلدیں چھپ چکی ہیں۔ چوبیس جلدوں میں مکمل ہوگئی۔

۳۔ تکملہ القاموس :۔ ان الفاظ کی لغوی تشریح جو تاج العروس میں درج ہونے سے رہ گئے تھے اور بعد میں درج کیے گئے۔

تاج العروس پر اُس دَور کے متعدد اصحابِ علم نے نظم و نثر میں تقریظات لکھیں، جن میں شیخ عبدالرحمٰن عیدروس (متوفی ۱۱۹۲ھ) شیخ حسن الجداوی (متوفی ۱۲۰۲ھ) شیخ عطیہ الجہوری (متوفی ۱۱۹۰ھ) شیخ عیسیٰ البداوی (متوفی ۱۱۸۲ھ) شیخ محمد بن ابراہیم العوفی (متوفی ۱۱۹۱ھ) شیخ حسن الہواری (متوفی ۱۲۱۰ھ) شیخ علی بن صالح الشاذری (متوفی ۱۱۸۵ھ) شیخ محمد الجنیر تباوی (متوفی ۱۲۰۷ھ) شیخ علی صعیدی (متوفی ۱۱۸۹ھ) شیخ احمد الزردیر (متوفی ۱۲۰۱ھ) شیخ علی الفناوی (متوفی ۱۱۹۸ھ) اور شیخ محمد بغدادی مشہور بہ السویدی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

۴ ۔ الجواهر المنیفه فی اصول ادلة مذهب الامام ابی حنیفه :۔ ۱۲۹۲ھ کو مصر سے شائع ہوئی ۔ اس میں حضرت امام ابوحنیفہ کے مذہب فقہی کی احادیث رسول ؐ سے تائید کی گئی ہے ۔ کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے ۔ حصّۂ اوّل میں ایمانیات اور حصّۂ ثانی میں عبادات کا بیان ہے ۔ احناف کے نقطۂ نظر سے یہ ایک اہم کتاب ہے ۔

۵ ۔ تنبیه المعارف البصیر علی اسرار حزب الکبیر :۔ مصر میں طبع ہوئی ۔ ابوالحسن شاذلی کی حزب الکبیر کی شرح ہے ۔

۶ ۔ نشوة الارتیاح فی بیان حقیقة المیسر و القداح :۔ ۱۳۰۲ھ کو لیدن میں چھپی ۔

۷ ۔ بلغة الاریب فی مصطلح آثار الحبیب :۔ ۱۳۱۶ھ کو مصر میں طبع ہوئی ۔

۸ ۔ شرح حدیث ام زرع ۔

۹ ۔ رفع الکمال عن العلل ۔

۱۰ ۔ تخریج حدیث شیّبتنی هود ۔

۱۱ ۔ تخریج حدیث نعم الادام الخل ۔

۱۲ ۔ المواهب الجلیله فیما یتعلق بحدیث الاوّلیّه ۔

۱۳ ۔ المرقاة العلیه بشرح الحدیث المسلسل بالاوّلیّه ۔

۱۴ ۔ العروس المجسلیه فی طرق حدیث الاوّلیّه ۔

۱۵ ۔ حسن المحاضرہ فی آداب البحث والمناظرہ ۔

۱۶ ۔ اٰنالة المنیٰ فی سر الکنیٰ ۔

۱۷ ۔ القول المبتوت فی تحقیق لفظ التابوت ۔

۱۸ ۔ رساله فی اصول الحدیث ۔

۱۹ ۔ رساله فی اصول المعمّی ۔

۲۰۔ کشف المغطی فی الصلوٰۃ الوسطیٰ۔

۲۱۔ الاحتفال بصوم الستِ من شوال۔

۲۲۔ ایضاح المدارک عن نسب العوانک۔

۲۳۔ اقرار العین بذکر عن نسب الی الحسن والحسین۔

۲۴۔ الابتہاج بذکر امر الحاج۔

۲۵۔ الفیوضات العلیہ بمافی سورۃ الرحمٰن من اسرار الصیغۃ الالٰہیہ۔

۲۶۔ التصریف ضروری علم التعریف۔

۲۷۔ العقد الثمین فی طرق الالباس والتلقین۔

۲۸۔ اتحاف الاصفیاء بسلاسل الاولیاء۔

۲۹۔ اتحاف بنی الزمن فی حکم قہوۃ الیمن۔

۳۰۔ اتحاف الاخوان فی حکم الدخان۔

۳۱۔ المقاعد العندیہ فی شاھد النقشبندیہ :۔ یہ ایک سو پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔

۳۲۔ الدرۃ المضیہ فی الوصیۃ المرضیہ :۔ دو سو بیس اشعار پر مشتمل ہے۔

۳۳۔ ارشاد الاخوان الی الاخلاق الحسان :۔ ایک سو بیس اشعار۔

۳۴۔ الفیۃ السند :۔ پندرہ سو اشعار اور دس کراسوں پر محتوی۔

۳۵۔ شرح صیغۃ ابن مشیش۔

۳۶۔ شرح صیغۃ البدوی۔

۳۷۔ شرح ثلاث صِیَغ :۔ ابوالحسن البکری کی ثلاث صِیَغ کی شرح۔

۳۸۔ شرح سبع صِیَغ المسمّٰی مدلائل القرب :۔ سید مصطفیٰ البکری کی صیغ کی شرح۔

۳۹۔ الازھار المتناثرہ فی الاحادیث المتواترہ۔

۴۰ - تحفۃ العید -

۴۱ - تفسیر سورۃ یونس علیٰ لسان القوم -

۴۲ - لقطۃ العجلان فی لیس فی الامکان ابدع مما کان -

۴۳ - القول الصحیح فی مراتب التعدیل والتجریح -

۴۴ - التحبیر فی حدیث المسلسل بالتکبیر -

۴۵ - الامالی الحنفیہ :- یہ کتاب ایک جلد میں ہے اور اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) میں محفوظ ہے -

۴۶ - الامالی الشیخونیہ :- دو جلدوں میں ہے اور قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) میں محفوظ ہے -

۴۷ - معارف الابرار فیما للکنی والالقاب من الاسرار -

۴۸ - العقد المنتظم فی امہات النبی صلی اللہ علیہ وسلم -

۴۹ - الفوائد الجلیلہ علیٰ مسلسلات ابن عقیلہ -

۵۰ - النفحۃ القدسیہ لواسطۃ البضعۃ العیدروسیہ -

۵۱ - حکمۃ الاشراق الیٰ کتاب الآفاق :- اس کا قلمی نسخہ قاہرہ میں موجود ہے -

۵۲ - شرح الصدر فی اسماء اھل البدر -

۵۳ - التفتیش فی معنی لفظ الدرویش -

۵۴ - رفع نقاب الخفاء عمن انتمیٰ الیٰ وفاء وابی وفاء -

۵۵ - اعلام الاعلام بمناسک حج بیت اللہ الحرام -

۵۶ - رشف سلاف الرحیق فی نسب حضرۃ الصدیق -

۵۷ - القول المبتوت فی تحقیق لفظۃ یاقوت -

۵۸ - لقط اللآلی من الجوھر الغالی :- یہ استاد حفنی کی اسانید ہیں جن کی اجازت مصنف شہیر کو ۱۱۶۷ھ میں ملی جس سال کہ وہ مصر گئے -

۵۹ - ھدیۃ الاخوان فی شجرۃ الدخان -

۶۰۔ اتحاف سید الحی بسلاسل بنی طی۔

۶۱۔ ترویح القلوب بذکر ملوک بنی ایوب۔

۶۲۔ کشف اللثام عن آداب الایمان والاسلام۔

۶۳۔ مختصر العین:۔ لغت سے متعلق ہے۔

۶۴۔ التکملة والصلہ:۔ دو جلدوں میں۔ مخطوطہ۔

۶۵۔ عقد الجمال فی بیان شعب الایمان۔

۶۶۔ تحفة اسماعیل:۔ شیخ العرب اسماعیل کی مدح میں۔ یہ مخطوطہ قاہرہ میں موجود ہے۔

۶۷۔ تحقیق الوسائل لمعرفة المکاتبات والرسائل۔

۶۸۔ جودۃ الاقتباس فی نسب بنی عباس۔

۶۹۔ الروض المعطار فی نسب السادات آل جعفر الطیار:۔ مخطوطہ قاہرہ میں موجود ہے۔

۷۰۔ سفینة النجات المحتویہ علی بضاعة مزجاۃ من الفوائد المنتقاۃ۔

۷۱۔ غایة الابتہاج لمقتضی اسانید مسلم بن الحجاج۔

۷۲۔ عقد اللآلی المتناثرہ فی حفظ الاحادیث المتواترہ۔

۷۳۔ العقد المکلل بالجواہر الثمین۔

۷۴۔ زہر الاکمام المنشق عن جیوب الالہام لشرح صیغة سیدی عبد السلام۔

۷۵۔ رشفة المدام المختوم للبکری۔

۷۶۔ معجم شیوخہ۔

۷۷۔ دفع الشکوی وترویح القلوب فی ذکر ملوک بنی ایوب۔

۷۸۔ المربی الکابلی فیمن روی عن الشمس البابلی:۔ اس کا قلمی نسخہ قاہرہ میں موجود ہے۔

۷۹۔ برنامجہ :۔ سیّد مرتضیٰ نے اسے سیّد باسط علی قادری بلگرامی کے لیے مصر میں تحریر کیا، اس میں اُنھوں نے اپنے ان کم وبیش تین سو اساتذہ کا ذکر کیا ہے، جن سے انھوں نے استفادہ کیا۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں موجود ہے۔

۸۰۔ اسانید الطرق الثلاثہ :۔ قلمی نُسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں محفوظ ہے۔

۸۱۔ تخریج احادیث خیرالانام :۔ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

۸۲۔ مناقب اھل الحدیث :۔ محدثین کے مناقب وفضائل سے متعلق۔

۸۳۔ عقد الجواھر الثمین فی تخریج حدیث اطلبوا العلم ولکان بالصین۔

ان کتب و رسائل کے علاوہ انھوں نے اور بھی متعدد چھوٹے بڑے رسائل تصنیف کیے۔ ابتدائی سات کتابوں کے علاوہ غالباً اور کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی — بہت سی غیر مطبوعہ کتابوں کے قلمی نسخے قاہرہ، حیدر آباد (دکن) اور دنیا کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں اور بعض کتب و رسائل دست بُردِ زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، سیّد مرتضیٰ بہت بڑے شاعر بھی تھے، ان کے چند اشعار جو اُنھوں نے اپنی بیوی کی وفات پر کہے، گزشتہ سطور میں لکھے جا چکے ہیں، چار شعر اور ملاحظہ ہوں جو پند و نصیحت سے متعلق ہیں :۔

توکل علی مولاک واخش عقابہ — وداوم علی التقوی وحفظ الجوارح

وقدم من البر الذی تستطیعہ — ومن عمل یرضاہ مولاک صالح

واقبل علی الفعل الجمیل وبذلہ — الی اھلہ مااستطعت غیر مکالح

ولا تسمع الاقوال من کل جانب
فلا بد من مثن علیک وقادح

ترجمہ :-

اللہ پر توکل کرو اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہو۔ ہمیشہ تقویٰ اختیار کیے رکھو اور ارتکابِ گناہ سے اعضا و جوارح کی حفاظت کرو۔

جس قدر طاقت ہو، نیکیوں کی طرف دوڑو، ہر وہ عمل جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے، عمل صالح ہے۔

بہترین کاموں کو اپنا مرکزِ توجہ بنائے رکھو اور جہاں تک ممکن ہو، لوگوں میں اچھائیاں پھیلاؤ، لیکن اس میں (یہ احتیاط ضروری ہے کہ) کسی سے ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔

اِدھر اُدھر کی باتیں سننے سے گریز کرو، تمھارے لیے مضبوط عزم و ارادے کے حامل اور اصحابِ فہم و تدبیر ہونا ضروری ہے (تاکہ کوئی غلط کردار اور غلط گفتار آدمی اپنی باتوں سے تمھیں متاثر نہ کر سکے)۔

بلاشبہ سیّد مرتضیٰ سوادِ ہند کے جلیل القدر عالم تھے۔ اُنھوں نے ہر موضوع پر کتابیں لکھیں اور نہایت علمی کام کیا۔ ان کی تگ و تازِ علم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ فنِ لغت میں تو وہ مرتبۂ امامت پر فائز تھے اور اس کے تمام گوشوں پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔

اُنھوں نے جوں ہی شعور کی آنکھیں کھولیں، اپنے ملک ہندوستان کے مشاہیر علما و اساتذہ سے اکتسابِ فیض میں مصروف ہو گئے اور ہر اُس دروازے پر دستک دی جہاں سے اُنھیں حصولِ خیر کی توقع ہو سکتی تھی۔ جس ذی علم شخصیت کے حضور اُنھوں نے اپنا دامنِ طلب پھیلایا، اللہ نے انھیں کامیاب و کامران فرمایا۔ یہ ایک عظیم سعادت تھی جو ان کے حصّے میں آئی۔

ہندوستان کے اساتذہ سے استفادے کے بعد وہ بحرِ ہند کی موجوں پر سوار ہوئے اور جزیرۂ عرب کو عبور کرتے ہوئے حجازِ مقدّس پہنچے۔ کئی حج کیے اور وہاں کے اربابِ فضیلت سے مستفید ہوئے۔ پھر یمن کے سرسبز و شاداب مقام "زبید"

کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ اس کے بعد دریائے نیل کے ساحل پر اُترے اور مصر میں سکونت اختیار کی۔ اب ان کا مرکز بلدۂ علم و کمال قاہرہ تھا، جہاں وہ ہر لحاظ سے بامِ عروج پر پہنچے۔ اُنھوں نے ہر اعتبار سے بھرپور زندگی گزاری اور جہاں گئے وہاں کے آسمانِ علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ان کو اللہ نے انتہائی احترام سے نوازا اور ان کی عزّت و حشمت کا سایہ لمحہ بہ لمحہ پھیلتا اور دراز ہوتا گیا۔ عمالِ حکومت، امرائے سلطنت، اربابِ منبر و محراب، اصحاب درس و تدریس غرض ہر شعبۂ حیات کے لوگوں نے ان کو مستحقِ تکریم گردانا اور ان سے حصولِ فیض کو اپنے لیے باعثِ خیر و برکت قرار دیا۔

بیوی کی وفات کے بعد ان کے گلستانِ طبع پر خزاں چھا گئی تھی اور وہ شگفتگی جو ان کے قلب و ضمیر کا خاصہ تھی، باقی نہ رہی تھی۔ امورِ دنیا سے منقطع ہو کر گوشہ گیری اختیار کر لی تھی اور گھر کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ گئے تھے درس و تدریس کے ہنگامے ختم کر دیے تھے، لوگوں سے میل جول ترک کر دیا تھا اور ردائے سکوت اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے ــــ وہ آفتاب جو ہندوستان سے طلوع ہو کر کئی سال سے یمن اور مصر کی علمی فضاؤں کو منور کر رہا تھا، اب اپنی نورانی کرنیں سمیٹ چکا تھا ــــ اس اثنا میں یکایک طاعون کے مہلک مرض نے سر نکالا اور چند ہی روز میں پورے مصر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جمعے کا روز تھا کہ سید مرتضیٰ اپنے گھر کے سامنے کی مسجد میں گئے، جو "مسجد کردی" کہلاتی تھی، نماز جمعہ سے فارغ ہو کر ابھی مسجد ہی میں بیٹھے تھے کہ طاعون کا مرض ان پر حملہ آور ہوا۔ وہ کسی طرح گھر پہنچے اور کواڑ بند کر کے بیٹھ گئے۔ کسی کو کوئی پتا نہ تھا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ دو دن اور دو راتیں اسی حالت میں کٹیں۔ بالآخر اتوار کو ان کی حیاتِ مستعار کا خاتمہ ہو گیا، عالمِ تنہائی میں ان کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ یہ شعبان کا مہینہ اور سن ۱۲۰۵ھ تھا۔ ان کی موت کی کسی کو کوئی اطلاع نہ تھی، ان کا وقتِ اخیر

کس طرح گزرا، اس کا کسی کو علم نہیں سب لوگ اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار اور بیماری سے پریشان تھے اور بیک وقت کئی کئی میتیں لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر قبرستان کی طرف جا رہی تھیں۔ ایسے نازک حالات میں کسی کو دوسرے کا کیا علم ہو سکتا تھا۔ پیر کے روز باشندگانِ قاہرہ کو پتا چلا تو شہر کے لوگوں نے ان کے گھر کا رُخ کیا اور ان کا جنازہ دروازے سے باہر نکالا۔

اس عالمِ اجل نے اپنی زندگی میں خود ہی سیدہ رقیہ کے مزار کے قریب ایک جگہ منتخب کر لی تھی، وہیں انھیں دفن کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ان کی زندگی کا ایک الم انگیز اور دردناک پہلو یہ ہے کہ اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، نہ کوئی بیٹا نہ بیٹی — اللّٰھمّ اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔[۹۷]

۹۸ — قاضی مصطفیٰ فاروقی گوپاموی

گوپامئو (یوپی) کے علما و مشائخ اور فقہا و اصولیین میں ایک بزرگ قاضی مصطفیٰ تھے، جن کے والد کا نام خیرالدین اور دادے کا خیراللہ تھا۔ نسلاً فاروقی تھے۔

قاضی مصطفیٰ کا مولد و منشا گوپامئو ہے جو ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک شہر ہے۔ اس شہر کی خاک سے متعدد علما و فقہا نے جنم لیا اور حلقۂ علم و فضل میں مشہور ہوئے — قاضی ممدوح کچھ بڑے ہوئے تو مولانا محمد زمان اور مولانا محمد اکرام

۹۷ھ ابجد العلوم ص ۸۰۷، ۸۱۵، ۸۶۵ — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۴ تا ۲۲۶ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۷۰ تا ۴۷۹ — حدائق الحنفیہ ص ۴۵۸ تا ۴۶۱ — الاعلام ج ۷، ص ۲۹۷ — تاریخ الکامل ابن اثیر الجزری حاشیہ عبدالرحمٰن الجبرتی مصر ج ۵ ص ۱۰۰ — اتحاف النبلاء ص ۴۰۷، ۴۰۸ — قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

سے حصولِ علم کا آغاز کیا اور پھر انہی سے تکمیلِ علوم کی۔ یہ دونوں بزرگ قاضی عبدالغنی فاروقی گوپاموی کے شاگرد تھے۔

اس زمانے میں علومِ ظاہری سے فراغت کے بعد علمِ باطنی کی تحصیل لازمی سمجھی جاتی تھی۔ قاضی مصطفٰیؒ نے بھی علمِ طریقت و تصوّف کے حصول کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور اس کے لیے وہ اس دور کے ایک بزرگ شیخ قدرت علی چشتی کی خدمت میں گئے اور ان سے خرقۂ طریقت حاصل کیا۔

یہ وہ دور تھا جب کہ مدراس میں بہت سے اصحابِ فضل و کمال اقامت گزیں تھے، اور وہاں کے منصبِ امارت پر قاضی مصطفٰیؒ کے ایک چچا زاد بھائی فائز تھے۔ قاضی ممدوح نے بھی مدراس کا عزم کیا، چونکہ یہ نعمتِ علم سے بہرہ ور تھے، اس لیے انھیں مدراس کی مسندِ تدریس پر متمکن کر دیا گیا۔ بعد ازاں یہ مدراس کے قاضی مقرر کر دیے گئے، ان کی صلاحیتیں جب مزید اجاگر ہوئیں تو انھیں مدراس کا "قاضی القضاۃ" بنا دیا گیا۔ اس کے بعد تمام عمر اس منصب پر فائز رہے ـــ انھیں "قاضی مصطفٰیؒ علی خان بہادر کہا جاتا ہے۔ غالباً "خان بہادر" کا لقب ان کو والئ مدراس نے دیا تھا۔

ان کی صرف دو تصنیفات کا علم ہو سکا ہے۔

ایک فارسی کے دیوانِ شعری کا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبعِ موزوں رکھتے تھے، اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ دوسرے "تذکرۃ الانساب" کا۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۱۹۲ھ کو "چینیاپٹن" میں لکھی جو جنوبی ہند کا ایک شہر ہے۔

فقہیات پر انھیں عبور حاصل تھا، اسی لیے پہلے مدراس کے "قاضی" اور پھر قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے تھے۔

"قاضی مصطفٰیؒ گوپاموی نے ۱۲۳۴ھ کو وفات پائی"[۹۹]

---

۹۹ نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۴۸۱، ۴۸۲۔ بحوالہ مہرِ جہاں تاب

۹۹ ـــ مولانا مصطفٰے رفیقی کشمیری

وادیٔ کشمیر کے ان مشاہیر علمائے حنفیہ میں جنھوں نے تیرھویں صدی ہجری کے فقہا و اصولیین میں قابل قدر خدمات انجام دیں، مولانا مصطفٰی رفیقی کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ ان کے والد کا اسمِ گرامی طیّب اور دادا کا احمد تھا ـــ مولانا طیّب اپنے دور میں کشمیر کے مشہور فقہا میں گردانے جاتے تھے۔ یہ ۱۰۔شوال ۱۲۶۶ھ کو فوت ہوئے۔

ان کے دادا کا نامِ نامی مولانا احمد رفیقی تھا۔ یہ بھی تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز کشمیری فقہا میں سے تھے۔ ان کی وفات ۲۲ رجب ۱۲۱۹ھ کو ہوئی۔ مولانا احمد کے والد کا نام مصطفٰے تھا۔ یہ بھی صاحبِ علم بزرگ تھے۔ غرض یہ تمام خاندان علم و عمل اور فقہ و اصول میں خاص شہرت کا حامل تھا۔

مولانا مصطفٰی رفیقی کی ولادت ۱۲۲۶ھ کو ہوئی اور حدیث و فقہ کی تعلیم اپنے والد مکرم مولانا طیّب سے حاصل کی۔ حدیث کی سند بھی انہی سے لی۔ بعض علوم مروّجہ کی تحصیل دیگر علما سے بھی کی اور تشنگانِ علوم کے زمرے میں بڑی شہرت پائی۔

علم سے فراغت کے بعد درس و افادہ کا وہی سلسلہ شروع کیا جو ان سے قبل ان کے آبا و اجداد کا شیوہ تھا۔ خلق کثیر نے ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا اور علوم متداولہ سے بہرہ یاب ہوئی۔ ان کے شاگردوں میں زیادہ تر تعداد کشمیری اہل علم کی ہے جن میں مولانا بہاؤالدین، مولانا احمد، مولانا احسن اور مولانا عبدالشکور رفیقی شامل ہیں۔

مولانا مصطفٰی رفیقی عالم باعمل، فاضلِ کامل، فقیہ و محدث، بہترین مقرر، عربی و فارسی کے ادیب، اچھے مؤرخ اور شاعر تھے۔ اس کشمیری عالم نے جمعۃ المبارک کے روز ۱۴۔ ربیع الاوّل ۱۲۹۴ھ کو آخرت

اختیار کیا۔[1]

۱۰۰۔۔ مولانا مظفر حُسین کاندھلوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں "کاندھلہ" ایک مشہور شہر ہے جس میں بہت سے علما و فقہا پیدا ہوئے۔ ان میں ایک عالم مولانا مظفر حسین کاندھلوی تھے۔ جو مولانا محمود بخش کاندھلوی (متوفی ۱۲۵۸ھ) کے فرزندِ گرامی تھے۔ یہ خاندان کئی پشتوں سے خدمتِ علم و دین میں معروف تھا اور ان میں سے ہر بزرگ اپنا ایک مقام رکھتا تھا۔

مولانا مظفر حسین اپنے عہد کے شیخ کبیر، عالم نبیل، فقیہ نامدار اور متقی و صالح شخص تھے۔ اتباعِ سنت، شریعت میں استقامت، کلمۂ حق میں عزیمت اور پاک بازی اور تورّع میں اپنی مثال آپ تھے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ تمام عمر لقمۂ مشتبہ حلق میں نہیں اتارا۔ اگر بے خبری میں کوئی ایسی چیز مُنہ میں چلی بھی گئی تو معدے نے اُسے قبول نہیں کیا، فوراً اُگل دیا۔ یہ اللہ کا بہت بڑا انعام تھا جو انھیں نصیب ہوا۔

مظفر حسین کی ولادت اور نشو و نما کاندھلہ میں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے حلقۂ درس میں شمولیت کی اور ایک مدت تک ان سے منسلک رہے۔ ۱۵ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۵ھ کو مفتی صاحب ممدوح کا انتقال ہوا تو مظفر حسین نے دہلی کا عزم کیا اور مولانا محمد یعقوب دہلوی کے حلقۂ درس میں شریک ہوگئے۔ مولانا محمد یعقوب دہلوی ایک جلیل القدر عالم تھے۔ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کے چھوٹے بھائی اور

---

[1] حدائق الحنفیہ ص ۴۸۹ —— نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۸۲ —— تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۶۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے تھے۔ ۱۲۵۸ھ کو اپنے بڑے بھائی (شاہ محمد اسحاق دہلوی) کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے اور مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی۔

مولانا مظفر حسین نے امیر المجاہدین سیّد احمد شہید سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا اور ان سے مستفیض ہوئے۔

مولانا ممدوح نے سنّتِ مطہرہ کی حمایت اور بدعت کی تردید کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ ان کے زمانے میں کسی عورت کا شوہر فوت ہو جاتا تو دوسری جگہ اس کا نکاح نہیں کیا جاتا تھا اور وہ تمام عمر گھر میں بیٹھی رہتی اور اسی طرح زندگی گزار دیتی تھی۔ یہ ہندوانہ رسم تھی جو ہندوستان کے مسلمانوں میں رواج پذیر ہو گئی تھی۔ مولانا اسمٰعیل شہید اور سیّد احمد شہید نے اس غلط اور غیر شرعی رسم کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی، ان کے رفقائے عالی مقام نے بھی اس کے خلاف جدوجہد کی۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی نے بھی اس رسم کی شدید مخالفت کی اور بہت سی بیوہ عورتوں کے نکاحِ ثانی کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں جاہل اور اسلامی احکام سے ناواقف مسلمانوں کی طرف سے انھیں سخت مصائب و محن میں مبتلا کیا گیا، مگر وہ اس غیر شرعی رسم کو ختم کرنے کے لیے برابر کوشاں رہے۔

مولانا مظفر حسین نے دو حج کیے۔ پہلے حج کے لیے وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تو مکہ مکرمہ گئے، پھر حج سے فارغ ہو کر مدینہ منوّرہ پہنچے، اور بخیریت وطن واپس آ گئے۔ کچھ عرصے بعد حج ثانی کا قصد کیا۔ مکہ مکرمہ پہنچے تو ان کے اُستاد مکرم مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی کا انتقال ہو گیا، ان کی نماز جنازہ پڑھی اور تجہیز و تکفین کی۔ اس کے بعد حج کیا اور مدینہ منوّرہ روانہ ہو گئے لیکن راستے ہی میں بیمار پڑ گئے۔ حالتِ مرض ہی میں مدینہ منوّرہ پہنچے تو اللہ کی آغوشِ رحمت میں چلے گئے۔ یہ جمعرات کی شب ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ

کا واقعہ ہے۔[101]

۱۰۱ — مولانا مظہر علی عظیم آبادی

عظیم آباد کسی زمانے میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ کا نام تھا۔ وہاں علما و فضلا اور فقہا و صلحا کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا ہوئی اور ان تمام حضرات نے مختلف گوشوں میں نہایت شہرت حاصل کی۔ ان میں سے بعض بزرگوں کا تذکرہ "فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری" کی جلد دوم کے مقدمے میں کیا جا چکا ہے اور بعض کے حالات وکوائف سلسلہ فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں متعدد مقامات پر معرض بیان میں آچکے ہیں۔

عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک عالم دین مولانا مظہر علی تھے، جو اپنے عہد کے شیخ اور صالح عالم تھے۔ حلقۂ احناف سے تعلق رکھتے تھے اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں درک و عمق میں مشہور تھے۔ عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے اور علما و طلبا کی کثیر تعداد نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مشہور کتاب "قسطاس البلاغہ" کے مصنف شیخ محمد سعید ان کے تلامذہ کی وسیع فہرست میں شامل ہیں۔

مولانا مظہر علی عظیم آبادی نے ہفتے کے روز ۶ صفر ۱۲۴۷ھ کو وفات پائی اور ان کے شاگرد شیخ محمد سعید نے یہ تاریخ نکالی۔

آہ شنبہ ساوس ماہ صفر یوم الرحیل[102]

۱۰۲ — سیّد معز الدین کڑوی

سیّد معز الدین کڑوی فحول علمائے فقہ میں سے تھے۔ سیّد خیرات علی

---

[101] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۸۳، ۴۸۴۔

[102] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۸۴۔

حسینی مشہدی کاظمی کڑوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ فقہ و اصول کے علمائے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ احمد آباد نارہ کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ کے اجل اساتذہ سے اکتساب علوم کیا۔ ذہن ثاقب اور فہم کامل رکھتے تھے۔

سید معز الدین حسینی کڑوی ان اصحاب علم حضرات میں سے تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے بدو شعور ہی میں فضل و کمال کی تمام نعمتوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ ان کا اسلوب کلام اور منہج تفہیم نہایت مؤثر تھا، جو بات زبان سے نکالتے سامعین کے ذہن میں پیوست ہوتی چلی جاتی۔ درسیات پر عبور حاصل تھا اور چھوٹی عمر ہی میں ہر گوشۂ علم پر حاوی ہو گئے تھے۔

اس عالم کبیر نے عین عالم جوانی میں ۱۲۵۵ھ کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ اعمال حسنہ اور پاکیزہ کردار کے سوا کوئی شے بطور یادگار نہیں چھوڑی۔ ان کا مرقد احمد آباد نارہ میں ہے، جہاں ان کے دیگر بزرگ مدفون ہیں۔ ایک شاعر نے ان کی تاریخ وفات ان اشعار سے نکالی۔

مشفقی مولوی معز الدین — کرو رحلت چوزیں جہان بجنان

سال فوتش چنیں رقم کردن — آہ او بود بے نظیر جہاں[۱۰۳]

۱۰۳ـــــ مولانا معشوق علی جون پوری

مولانا معشوق علی جون پوری اپنے عصر کے جید عالم اور ممتاز فقیہ تھے۔ مولانا غلام حسین جون پوری کے بیٹے تھے جو کہ حساب، ہیئت، ہندسہ وغیرہ فنون ریاضی کے نامور عالم تھے۔

مولانا معشوق علی حنفی المسلک تھے اور مولانا فتح علی فاروقی جون پوری کے بھانجے تھے[۱۰۴]۔ ولادت و تربیت جون پور کے مرکز علم و علما میں ہوئی اور

---

[۱۰۳] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۷ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۸۵۔

[۱۰۴] مولانا فتح علی جون پوری، فاروقی النسل تھے اور نہایت صالح (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

وہیں کے اساتذہ سے حصولِ علم کیا۔ بعد ازاں مزید تعلیم کے لیے دیارِ ہند کے ارباب علم کی خدمت میں حاضری دی۔ شیخ احمد یمنی سے جو تیرھویں صدی ہجری کے بہت بڑے ادیب و عالم تھے، فنونِ ادبیہ کی تحصیل کی۔

نہایت ذہین و فطین اور قابل آدمی تھے، کتابوں پر گہری نظر تھی اور مختلف علوم و فنون کے بارے میں ماہرانہ رائے رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاضی مقرر کر دیے گئے تھے جو ایک نہایت اہم اور نازک منصب ہے۔

محکمۂ قضا پر متمکن ہونے کے باوجود زیادہ تر درس و افادہ میں مصروف رہتے اور طلبا کی اچھی خاصی جماعت ان کے حلقۂ درس میں موجود رہتی اور وہ اس کو بہترین شغل قرار دیتے۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ کثیر المطالعہ عالم تھے اور کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کے انتہائی شائق تھے۔ منقول ہے کہ اس زمانے میں پانچ ہزار کتابیں ان کے کتب خانے میں جمع تھیں۔ عربی کے بہترین ادیب تھے۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا۔

۱۔ ایک بڑی اچھی کتاب اخلاق کے بارے میں تصنیف کی۔
۲۔ ایک کتاب "الفرائض الاسلامیہ" کے نام سے لکھی جو وراثت سے متعلق ہے۔
۳۔ دیوان متنبی کے کچھ اجزا کی شرح سپردِ قلم کی۔

اس عالم و فقیہ نے ۶ رمضان ۱۲۶۸ھ کو وفات پائی۔[۱۰۵]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) اور پرہیزگار عالمِ دین تھے۔ اعمال جون پور میں ایک گاؤں (منڈیاہو) تھا، وہاں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے شہر جون پور کے اساتذہ سے علم حاصل کیا، پھر سید احمد شہید بریلوی سے وابستہ ہو گئے اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ سید صاحب نے ان کا نام فتح علی سے بدل کر عبدالقدوس رکھ دیا تھا۔ اس عالم اجل نے علاقہ پنجاب میں وفات پائی۔

[۱۰۵] تاریخِ شیراز ہند جون پور ص ۶۲، ۶۳، ۷ ـ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۷ ـ نزہۃ الخواطر ۷، ص ۴۸۵

۱۰۴۔ مولانا معین الدین انصاری سہسوانی

صوبہ یوپی کے مشہور شہر "سہسوان" کے بہت سے علما و فقہا کا ذکر "فقہائے ہند" کی مختلف جلدوں میں ہو چکا ہے۔ اس شہر کے ایک ممتاز عالم و فقیہ مولانا معین الدین انصاری سہسوانی تھے۔ ان کے اسلاف مغل بادشاہ جہاں گیر کے عہد سے وہاں کی جامع مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے آ رہے تھے اور علم و معرفت اور ورع و تقویٰ میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ سہسوان اور اس کے قرب و جوار میں ان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

تیرھویں صدی ہجری میں اس خاندان کے ایک بزرگ مولانا معین الدین انصاری گزرے ہیں، جن کو تفسیر و حدیث، فقہ و اصول اور دیگر علوم مروجہ میں درک حاصل تھا۔ وعظ و تذکیر، تبلیغ دین، اشاعتِ سنت اور ترویج اسلام میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ بدعات اور غیر شرعی رسوم و رواج سے انھیں شدید نفرت تھی اور اس کا برسرِ عام رد کرتے تھے۔ کلمۂ حق کہنے میں بے باک تھے اور اس سلسلے میں کسی بڑے چھوٹے کی قطعاً پروا نہ کرتے۔ جس بات کو کتاب و سنت کی روشنی میں صحیح سمجھتے، اس کا برملا اظہار کرتے۔ اور جو غلط ہوتی، اس کی سب کے سامنے نکیر کرتے۔

ان کے بعض واقعات "حیات العلماء سہسوان" (صفحہ ۳۵ تا ۳۷) میں مولانا سید عبدالباقی سہسوانی نے بیان کیے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں کس درجے جری تھے۔ لیکن اس سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں پیدا ہوئے اور اپنے شہر سہسوان ہی میں نشو و نما پائی۔ متداولہ علوم و فنون کی تحصیل کے لیے پہلے رامپور گئے اور وہاں کے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ پھر عازم لکھنؤ ہوئے،

وہاں کے بعض علماء سے اخذِ علم کیا۔ اس کے بعد دہلی روانہ ہوئے اور وہاں مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی، مولانا عبدالحی بڑھانوی اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کے حلقہائے درس میں شامل ہوئے اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ وہ ان بزرگوں کے طریق وعظ وارشاد اور نہج تقریر سے خاص طور پر متاثر ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طالب علمی ہی کے زمانے میں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا اور یہ سلسلہ اپنے اساتذۂ دہلی کے اسلوب پر شروع کیا۔

علوم سے فراغت کے بعد سہسوان آئے تو درس و تدریس کے ساتھ ساتھ شہر اور قصبات و قریات کے دورے شروع کر دیے اور لوگوں میں خالص کتاب و سنت کی تبلیغ کرنے لگے۔ کسی کے گھر سے کھانا نہ کھاتے، اپنا خرچ ساتھ لے کر جاتے اور خود ہی روٹی پکا کر کھاتے۔ یتیموں، مسکینوں اور بیوہ عورتوں کی بہت مدد کرتے اور جو پیسہ ہاتھ آتا اُن میں تقسیم کر دیتے۔ شادی بیاہ اور غمی کے مواقع پر جو غیر شرعی رسمیں مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں، ان کی شدید مذمت کرتے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ جماعت کی پابندی پر زور دیتے۔ جو لوگ نماز کے وقت گھروں میں بیٹھے رہتے انھیں کھینچ کر مسجد میں لاتے اور جو جماعت میں شامل ہونے میں تساہل سے کام لیتے ان کو سختی کے ساتھ شامل جماعت ہونے کی تاکید کرتے۔ اس سلسلے میں اتنے نازک احساس کے مالک تھے کہ مار پیٹ پر اُتر آتے۔ جس نے ذرہ ادھر ادھر کی بات کی اور مسجد میں جانے سے گریز کی راہ اختیار کی، اُس پر ڈنڈا اٹھا لیا اور اس وقت تک آرام نہ لیا جب تک اس کو مسجد میں لے جانے میں کامیاب نہ ہو گئے۔ یہ کام بلا خوف و خطر کرتے اور اس میں امیر غریب یا حاکم و محکوم کے درمیان کوئی امتیاز روا نہ رکھتے، اپنے شہر سہسوان میں بھی یہ خدمت دھڑلے سے انجام دیتے رہے اور اس کے قرب و جوار کے قصبات و دیہات میں بھی۔

اشاعتِ دین کے اس انداز سے متعلق لوگوں کے دلوں پر ان کا رعب طاری ہو گیا تھا اور سخت سے سخت لوگ بھی ان سے خوف کھاتے تھے۔ جدھر کو نکل جاتے بے عمل اور بے نماز لوگوں پر دہشت طاری ہو جاتی۔

ایک مرتبہ شہر کے ایک محلے سے گزر رہے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا، قریب کی مسجد میں جانے لگے تو دیکھا کہ وہاں تحصیل دار کا دفتر ہے اور مسجد سے ملحق ہے، اور اذان کی آواز وہاں پہنچ رہی ہے، لیکن نماز کے لیے نہ تحصیل دار اٹھا اور نہ اس کے ماتحت مسلمان عملے کے کسی شخص میں کوئی حرکت پیدا ہوتی۔ تحصیل دار ویسے ہی ایک با اختیار اور بڑا افسر ہوتا ہے، مگر وہ تحصیل دار بہت سخت مزاج اور مغرور بھی تھا۔ معین الدین انصاری تحصیل دار کے دفتر جا پہنچے اور اسلام علیکم کے بعد اس سے مخاطب ہو کر کہا "آپ مسلمان ہیں؟" بولا "ہاں! مسلمان ہوں"۔ فرمایا "مسلمان ہو تو چلو مسجد میں جا کر نماز پڑھو اور اپنے ماتحت مسلمان عملے کو بھی مسجد میں لے کر جاؤ"۔ وہ اس قسم کے اسلوبِ کلام کو سننے کا عادی نہ تھا۔ انتہائی غصے سے مولانا کو دیکھا، لیکن وہ اپنی بات پر اڑے رہے اور مسجد میں جانے اور نماز باجماعت پڑھنے پر اصرار برابر جاری رہا۔ نماز کے فضائل بھی بیان کیے اور نہ پڑھنے کی وعید بھی سنائی۔ بالآخر آگے بڑھے اور اُسے کھینچ کر کرسی سے نیچے اُتار لیا۔ تمام عملہ خاموش بیٹھا دیکھتا اور سنتا رہا۔ پھر اس کا بازو پکڑ کر مسجد میں لے آئے، دوسرے لوگوں کو بھی مسجد میں جانے کا حکم دیا۔

نماز ہو چکی تو نماز کی فضیلت، ارکانِ اسلام کی اہمیت اور دیگر امورِ شرعیہ سے متعلق نہایت مدلل اور مؤثر تقریر کی اور اس درجے نرمی اور پیار سے احکامِ دین بیان کیے کہ حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس کے بعد وہ تحصیل دار بھی پکا نمازی ہو گیا اور باجماعت نماز ادا کرنے لگا اور اس کے ماتحت کام کرنے والے مسلمان بھی نماز باجماعت کے پابند ہو گئے۔

سہسوان کے جوار میں ایک گاؤں "سید پور" ہے۔ ایک مرتبہ وہاں گئے تو لوگوں کو حسبِ معمول احکامِ شرع کی بجا آوری کی تلقین کی۔ غیر اسلامی رسوم و رواج کی مذمت فرمائی اور بدعات و محدثات کا رد کیا۔ ایک شخص کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ تارکِ نماز ہے، مگر یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ اُسے کھینچ کر مسجد میں لے جانا چاہا تو وہ ڈر کر بھاگ اُٹھا، مولانا بھی اس کے پیچھے بھاگے۔ وہ ایک درخت پر چڑھ گیا، مولانا بھی درخت پر چڑھ گئے۔ وہ نیچے کود پڑا، مولانا بھی فوراً کود پڑے اور اس کا

تعاقب کرنے لگے۔ وہ بھاگتا ہوا کنوئیں میں گر گیا، مولانا بھی دوڑتے ہوئے بے خبری میں کنوئیں میں گر گئے اور پانی میں غوطے کھانے لگے ــــ آس پاس کے لوگ بھاگ کر آئے اور دونوں کو کنوئیں سے نکالا۔ خدا کا شکر ہے کہ دونوں زندہ سلامت رہے۔

حیات العلماءؒ کے مصنف مولانا عبد الباقی لکھتے ہیں کہ وہ مولانا کی وفات سے چونتیس سال بعد ۱۲۹۶ھ میں خود سید پور گئے اور اس شخص سے ملے جس کے پیچھے مولانا بھاگے تھے۔ اس نے اور بعض دوسرے لوگوں نے واقعہ کی تصدیق کی اور بتایا کہ اس دن سے وہ شخص نماز با جماعت کا پوری طرح پابند ہے اور اپنے افرادِ خاندان اور دوسرے لوگوں کو بھی نماز کی تاکید کرتا ہے۔

مولانا معین الدین انصاری کسی غیر مسلم یا غیر متشرع مسلمان حاکم کی تکریم نہ کرتے، جس گاؤں میں وعظ و نصیحت کے لیے جاتے، وہاں کے لوگوں کے گھر سے کھانا نہ کھاتے۔ کھانے پینے کا انتظام خود ہی کرتے، کسی کو تکلیف دینا اور کسی پر بوجھ بننا ان کی عادت کے خلاف تھا۔ غربا و مستحقین کی خود بھی مالی امداد کرتے اور اصحابِ ثروت کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور ان کے مواعظ و نصائح سے خلقِ کثیر کے عقائد کی اصلاح ہوئی اور ان کے عمل کی دنیا بدلی۔

آخرِ عمر میں زیادہ تر ضلع بلند شہر کے ایک قصبے "ڈبائی" میں قیام کرنے لگے تھے، ان کا مقصد وہاں کے لوگوں کی اصلاح و تعلیم اور ان کو مسائلِ دین سے آگاہ کرنا تھا ــــ وہیں کے ایک شقی القلب نے اُن کے کھانے میں زہر ملا دیا، اس کے اثر سے نمازِ فجر کے بعد اور طلوعِ آفتاب سے قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے مہینے کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ حادثہ ۱۲۷۲ھ کے اوائل میں پیش آیا۔

ڈبائی میں ان کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی تو منقول ہے کہ اس قصبے کی کل آبادی سے تین گنا زیادہ لوگ شریکِ جنازہ تھے اور سب حیران تھے کہ انسانوں کا یہ انبوہِ کثیر کہاں سے آیا اور اتنی جلدی ان کی موت کی اطلاع انھیں کیسے ہوئی ــــ اس کے بعد

میت کو سہسوان لایا گیا اور وہاں جنازہ پڑھا گیا تو اس میں بھی حاضرین کی کثرت کا یہی حال تھا۔

مولانا سید عبدالباقی سہسوانی لکھتے ہیں کہ جس رات مولانا کی وفات ہوئی، اُسی رات میرے والد مکرم مولانا سید سراج احمد رحمۃ اللہ علیہ نے خواب دیکھا کہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں۔ صبح کو یہ خواب مولانا بزرگ علی مارہروی سے بیان کیا تو اُنھوں نے فرمایا، کسی عالم دین اور داعی حق کا انتقال ہو گیا ہے۔ چنانچہ اُسی دن شام کو مولانا معین الدین انصاری کی میت سہسوان آگئی اور اُسے سہسوان کی خاک میں دفن کر دیا گیا۔

۱۰۵ ــــــ مولانا مملوک علی صدیقی نانوتوی

صوبہ یوپی کے ضلع سہارن پور میں ایک گاؤں کا نام "نانوتہ" ہے۔ یہ گاؤں گنگوہ سے بارہ میل مغرب میں، دیوبند سے سولہ میل مشرق میں، سہارن پور سے اٹھارہ میل شمال میں اور تھانہ بھون سے نو میل جنوب میں واقع ہے۔ علم وعمل کی تاریخ میں یہ گاؤں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ کسی زمانے میں یہ ایک مردم آفریں گاؤں تھا۔ اس میں بہت سے علما و فقہا پیدا ہوئے، جنھوں نے نہ صرف خطۂ ہند میں شہرت پائی بلکہ پوری دنیائے اسلام میں نامور ہوئے اور بے شمار لوگوں نے ان کے علم وعرفان کی فراوانیوں سے استفادہ کیا ــــ ان میں ایک عالم دین مولانا مملوک علی تھے جو نسلاً صدیقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، چھپالیسویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

نانوتہ میں آمد اور سکونت

مولانا مملوک علی کا خاندان سمرقند میں آباد تھا اور دین وتقویٰ کے لحاظ سے سمرقند اور اس کے نواح میں اس خاندان کی بڑی شہرت تھی۔ مولانا ممدوح کے شجرۂ نسب پر نگاہ ڈالیں تو ان کی پندرھویں پشت میں ایک بزرگ قاضی

مظہر الدین کا نام آتا ہے "سیرتِ یعقوب و مملوک" کے مصنّف پروفیسر محمد انوار الحسن (فیصل آباد) "مکتوباتِ یعقوبی" کے مقدمہ (صفحہ ۳) کے حوالے سے مولانا مملوک علی کے فرزندِ گرامی مولانا محمد یعقوب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سلطان سکندر لودھی نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مرحوم کے احداد میں سے جناب قاضی مظہر الدین رحمۃ اللہ علیہ کو جن کا مزار جہاں آباد (دہلی) میں ہے، ۸۷۱ھ میں سمرقند میں طلب فرما کر شرفِ حضوری بخشا[۱۰۶] علاوہ دیگر اعزازہائے فراواں کے عہدۂ قضا جہاں آباد ارزانی فرمایا۔ چونکہ مقام نانوتہ قریباً وسط کاٹھا میں واقع ہے اور یہاں کے اہل ہنود، اقوام راجپوت و گوجر، روڑہ وغیرہم کا بہت جتھا تھا، اور یہ لوگ نہایت سرکش و سخت متعصب، بدخواہِ مسلمانان تھے، پس ان لوگوں کی سرکشی مٹانے کے لیے اور اس علاقے کو مطیع و منقاد کرنے کی جہت سے جناب قاضی مظہر الدین کے صاحبزادوں میں سے قاضی میراں بڑے صاحب کو واسطے اقامت و سکونت قصبہ نانوتہ کے ارشادِ شاہی ہوا، اور علاوہ املاک و جاگیرات کے عہدۂ قضا وہاں کا مرحمت فرمایا[۱۰۷]۔"

---

[۱۰۶] یہاں مکتوباتِ یعقوبی کے مرتب امیر احمد عشرتی صدیقی کو سہو ہو گیا ہے، اور پروفیسر محمد انوار الحسن نے بھی اس پر غور نہیں فرمایا۔ ۸۷۱ھ میں ہندوستان کا بادشاہ سکندر لودھی نہ تھا، بلکہ اس کا باپ بہلول لودھی تھا، جس نے ۸۵۵ھ سے ۸۹۴ھ تک اس ملک پر حکومت کی۔ یہ بادشاہ ہندوستان میں لودھی خاندان کی حکومت کا بانی تھا۔ اس کی وفات کے بعد ۸۹۴ھ میں اس کا بیٹا سکندر لودھی تختِ ہند پر متمکن ہوا، اور اس نے ۷، ذلقعدہ ۹۲۳ھ کو اُس دور کے دار السلطنت آگرہ میں وفات پائی۔ قاضی مظہر الدین، بہلول لودھی کے زمانے میں ہندوستان آئے ہوں گے۔ اگر سکندر لودھی کے زمانے میں آئے ہیں تو ۸۷۱ھ کا سن صحیح نہیں۔

[۱۰۷] سیرت یعقوب و مملوک ص ۱۹، ۲۰ بحوالہ مکتوباتِ یعقوبی مقدمہ ص ۳۔

ان سطور سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں :

۱۔ مولانا مملوک علی کے اسلاف، لودھی خاندان کے عہدِ حکومت میں سمرقند سے ہندوستان آئے اور لودھی حکمران کی دعوت پر آئے۔

۲۔ ان کے اوّلین بزرگ جو واردِ ہند ہوئے، قاضی مظہر الدین صدیقی تھے۔

۳۔ قاضی مظہر الدین صدیقی کے بیٹے بھی ان کے ساتھ تھے۔

۴۔ قاضی ممدوح کے علم وکمال کی شہرت ہندوستان میں لودھی حکمران تک پہنچ گئی تھی، اسی لیے ان کو یہاں آنے کی دعوت دی۔

۵۔ قاضی مظہر الدین کو بادشاہ نے دہلی کے منصب قضا پر مامور کیا۔

۶۔ ان کے بیٹے قاضی میراں بڑے بھی صاحبِ علم بزرگ تھے، انھیں نانوتے کا قاضی مقرر کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے نانوتہ اس عہد میں محلِ وقوع کے اعتبار سے اس نواح کا ایک اہم مقام تھا اور وہاں محکمۂ قضا قائم کرنا بادشاہ کے نزدیک ضروری تھا۔

۷۔ قاضی میراں بڑے صاحب کو بادشاہ کی طرف سے جاگیر عطا کی گئی۔

۸۔ قاضی میراں کو نانوتے میں آباد کرنے کی بڑی وجہ وہاں کے غیر مسلموں کا زور توڑنا اور اس علاقے میں اسلام کی نشر واشاعت کا اہتمام کرنا تھا۔

۹۔ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ وہ اس میں کامیاب رہے اور اس پورے علاقے کو علم وعلما کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔

۱۰۔ لودھی حکمرانوں کے نزدیک ہندوستان میں تبلیغِ اسلام اور ترویجِ دین کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

بہرحال قاضی مظہر الدین اس خاندان کے پہلے آدمی تھے جو ایک لودھی حکمران کی دعوت پر ہندوستان آئے اور جنھیں دہلی کا قاضی مقرر کیا گیا۔ ان کے بیٹے میراں بڑے صاحب کو نانوتے کا عہدۂ قضا تفویض کیا گیا۔ "میراں بڑے صاحب"

کا اصل نام کیا تھا، اس کا علم نہیں ہو سکا۔ یہ علمی اعتبار سے یا نیکی اور دین داری کی رُو سے اس دَور کی "بڑی" شخصیت ہوں گے جنھیں "بڑے صاحب" کہا جاتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ دہلی اور نانوتے کے منصب قضا کے سوا نہ تو ان باپ بیٹے کے حالات کہیں مرقوم ہیں اور نہ ان سے لے کر مولانا مملوک علی تک درمیان کی تیرہ چودہ شخصیتوں کے بارے میں تذکرہ و رجال کی کتابوں میں کسی چیز کا سراغ ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی علمی تاریخ بالکل خاموش ہے۔

ولادت

مملوک علی ۱۲۰۴ھ (۸۹ — ۱۷۸۸ء) کو نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے، باپ کا نام احمد علی، دادا کا غلام شرف اور پردادا کا عبداللہ تھا۔

تعلیم

ابتدائی درسی کتابیں اپنے گاؤں نانوتہ کے بعض اساتذہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد عازم دہلی ہوئے۔ دہلی اس زمانے میں اسلامی اور دینی علوم و فنون کا گہوارہ تھا اور تحصیلِ علم کے لیے ملک کے دور دراز علاقوں سے لوگ وہاں جاتے تھے۔ مملوک علی جب دہلی گئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی زندہ تھے۔ وہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے تبرکاً علمِ نحو کی کتاب "ہدایت النحو" کے چند اسباق پڑھے۔ بعد ازاں شاہ صاحب کے ممتاز و معروف شاگرد مولانا رشید الدین خاں کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور اُن سے فنونِ مروّجہ اور علومِ متداولہ کی تکمیل کی۔

سلسلۂ درس و تدریس

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مولانا مملوک علی کب اور کتنی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اس دور کے حالات اور قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حصولِ علم سے فراغ کے بعد اُنھوں نے دہلی ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا،

چونکہ وہ تمام اصنافِ علم پر عبور رکھتے تھے اور معقول و منقول کے ماہر تھے، لہٰذا بہت جلد طلبا کا اچھا خاصا حلقہ ان کے گرد قائم ہو گیا تھا۔ ان کے اُستاد مولانا رشید الدین خاں دہلی کالج میں مدرس تھے، لائق شاگرد نے بھی یکم جون ۱۸۲۵ء کو وہیں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔

یہاں دہلی کالج کے بارے میں بھی چند سطور لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ابتدا میں اس کا نام مدرسہ غازی الدین تھا جو ۱۷۹۲ء میں غازی الدین خاں فیروز جنگ نے دہلی میں اجمیری دروازے کے پاس قائم کیا تھا۔ مدرسے کے ساتھ ایک شاندار مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ اس مدرسے میں عربی اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ تینتیس سال تک اس مدرسے میں ان علوم کی تدریس کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔ ۱۸۲۴ء میں مدرسے میں صرف نو طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے اور مولوی عبداللہ انھیں تعلیم دیتے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ کالج میں تبدیل ہو گیا اور اس کا نام "دہلی کالج" رکھا گیا۔ اس کا پرنسپل مسٹر ٹیلر کو بنایا گیا۔ مولوی رشید الدین خاں کو اس میں عربی کا اوّل مدرس مقرر کیا گیا، سو روپے ماہانہ ان کی تنخواہ تھی۔

۱۸۲۸ء میں سر چارلس مٹکاف برٹش ریذیڈنٹ کمشنر کی سفارش سے دہلی کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا۔ اسی سال لوکل فنڈ کے تعلیمی بجٹ سے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کالج کو دو سو پچاس روپے دینے کی منظوری دی گئی، جس سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں سخت اضطراب پیدا ہوا۔

۱۸۳۰ء میں حکومت اودھ کے وزیر نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں بہادر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دہلی کالج میں عربی اور فارسی کی تعلیم و ترقی کے لیے ایک لاکھ ستّر ہزار روپے دینے کی پیش کش کی[۱]۔ لیکن ابھی یہ بات چل ہی رہی تھی کہ نواب صاحب اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اس اثنا میں دہلی کے لوگوں نے ایک الگ کالج

---

[۱] کانفرنس گزٹ، علی گڑھ ۱۵ر نومبر ۱۸۳۰ء

کھولنے کی کوشش کی، لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو یو پی کے لیفٹیننٹ گورنر لارڈ بنٹینگ نے ایک ریزولیوشن کے ذریعے دہلی کالج سے تمام مشرقی علوم کی تعلیم بند کردی۔ یہ علوم عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں پر مشتمل تھے۔ اس سے اہلِ ملک کو شدید ذہنی کوفت ہوئی اور لوگوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا۔ خود کالج کے کچھ انگریز مدرسوں نے اس پر احتجاج کیا۔ چنانچہ بعض نے کالج کی تدریس سے استعفا بھی دے دیا۔ اس کے بعد لارڈ میکالے کا تقرر ہوا۔ یہ انتہائی متعصب شخص تھا، اس کی تقرری سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو مزید تکلیف پہنچی۔

لارڈ بینٹنگ کی جگہ لارڈ آکلینڈ یوپی کا لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوا تو اس نے ۲۴ نومبر ۱۸۳۹ء کو ایک چھٹی کے ذریعے آرڈر جاری کیا اور کالج میں علوم مشرقی کی دوبارہ تعلیم دی جانے لگی۔ لیکن اس سے کچھ عرصہ بعد دہلی کالج سے علوم مشرقی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس وقت مختلف زبانوں کی تعلیم کے اعداد و شمار مندرجہ تحت تھے۔

۱۔ انگریزی کے طالب علم ۱۹۹
۲۔ فارسی کے ۵۷
۳۔ عربی کے ۳۹
۴۔ سنسکرت کے ۲۶

۱۸۷۷ء تک یہ کالج قائم رہا، پھر اسی سال بند کر دیا گیا اور اس کا سٹاف گورنمنٹ کالج لاہور میں بھیج دیا گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کا پرنسپل لائنز بھی یہی چاہتا تھا۔

یہ تھا دہلی کالج کی تاریخ کا ایک مختصر سا خاکہ ــــ آئیے اب اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹیں اور مولانا مملوک علی کے حالات و سوانح بیان کرنے کی کوشش کریں۔

دہلی کالج میں تقرر

مولانا مملوک علی یکم جون ۱۸۲۵ء کو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر دہلی کالج میں

اُستاد مفرر ہوئے، اس وقت ان کی عمر بتیس تینتیس برس کی تھی۔ اپنے اُستاد مولانا رشید الدین خان کے ساتھ ہی نائب مدرس کی حیثیت سے ان کا تقرّر عمل میں آیا تھا، مولانا رشید الدین خان عربی کے صدر مدرس مقرر ہوئے تھے اور ان کی تنخواہ سو روپے ماہانہ تھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی ایک کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" (ص ۱۸۱) میں لکھا ہے کہ مولانا مملوک علی کا دہلی کالج میں تقرّر ان کے استاد مولانا رشید الدین خاں کے بعد ہوا۔ ان کے عربی الفاظ ہیں :۔ نصب مدرسا فی دھلی کالج۔ بعد شیخہ یعنی اپنے اُستاد (مولانا رشید الدین خان) کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرّر کیے گئے ——— مولانا سندھی کی یہ بات صحیح نہیں۔ مولانا مملوک علی کو ان کے استاد مولانا رشید الدین خاں کی زندگی میں اور ان کے ساتھ ہی دہلی کالج میں عربی کے نائب مدرس بنایا گیا تھا۔

مولانا مملوک علی کے ساتھ ہی عربی کے دوسرے نائب مدرس مولوی سیّد محمدؒ کو بنایا گیا تھا۔ اس سے تقریبًا پانچ سال بعد ۳۰ اکتوبر ۱۸۳۰ء کو شعبۂ عربی میں مولا سدید الدین بن مولانا رشید الدین کا اور پھر چار سال بعد ۵ اکتوبر ۱۸۳۴ء کو مولانا سبحان بخش شکارپوری کا تقرّر ہوا۔[۱۰۹]

تنخواہ میں اضافہ

مولانا مملوک علی یکم جون ۱۸۲۵ء کو دہلی کالج میں ملازم ہوتے تھے، نومبر ۱۸۴۱ء (یعنی سولہ سال) تک ان کا مشاہرہ پچاس روپے رہا۔ ۸ نومبر ۱۸۴۱ء کو مسٹر ٹامسن وزیٹر دہلی کالج نے ایک رپورٹ لکھی، جس میں ان کی تنخواہ میں اضافے کی سفارش کی اور لکھا کہ ان کی تنخواہ اسّی روپے ماہانہ کر دی جائے۔[۱۱۰] اس سفارش پر پورا عمل تو

---

۱۰۹ ملاحظہ ہو "مولانا محمد احسن نانوتوی" (ص ۳۰، ۱) بحوالہ رپورٹ جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن ۳-۱۸۴۲ء

۱۱۰ دیکھیے ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی کتاب "مولانا محمد احسن نانوتوی" (ص ۳۰، ۱) بحوالہ رپورٹ جنرل کمیٹی ۸ نومبر ۱۸۴۱ء

نہ ہوا، البتہ دس روپے بڑھا دیے گئے اور انھیں ساٹھ روپے تنخواہ ملنے لگی۔

اسی اثنا میں نواب حامد علی خاں (متولّی) نے مولوی جعفر علی کو (جو مسلکاً شیعہ تھے اور جن کی ولادت ۲ صفر ۱۲۲۲ھ کو اور وفات ۸ صفر ۱۳۱۴ھ کو ہوئی) دہلی کالج میں سو روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ نواب حامد علی خاں چاہتے تھے کہ مولوی جعفر علی کو صدر مدرس مقرر کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اس سے مولانا مملوک علی کی حق تلفی ہوتی تھی جو کم و بیش سولہ سال سے خدمت انجام دے رہے تھے۔ کالج کے اربابِ انتظام نے اس سلسلے میں مفتی صدر الدین آزردہ سے رائے طلب کی تو انھوں نے مولانا مملوک علی کے علم و فضل کو سراہا اور صدر مدرسی کے لیے ان کی سفارش کی۔ لیکن مجلسِ انتظامیہ نے نواب حامد علی خاں (متولّی) کے مقرر کردہ مولوی جعفر علی کو ان کے منصب سے علیحدہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور مولانا مملوک علی کی صدر مدرسی کا معاملہ کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ بالآخر نومبر ۱۸۴۱ء ہی میں مولانا مملوک علی کو صدر مدرس بنا دیا گیا اور سو روپے ان کی تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۱۸۴۳ء کو مولوی جعفر علی دہلی کالج کی ملازمت سے الگ ہو گئے۔

مسٹر ٹامسن نے مولانا مملوک علی کے علم و فضل کی بہت تعریف کی ہے۔ ان کے انگریزی الفاظ جنرل کمیٹی کی رپورٹ (مورخہ ۳ نومبر ۱۸۴۱ء) میں مرقوم ہیں۔ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:-

"مولانا مملوک علی عربی کے بہت بڑے فاضل ہیں اور دہلی شہر میں ان کا بہت احترام کیا جاتا ہے"۔

دہلی کالج میں مولانا کی تدریسی مساعی کے نتائج

دہلی کالج میں مولانا مملوک علی اور دیگر علمائے دین نے جو تدریسی خدمات انجام دیں، ان کے نہایت اچھے نتائج نکلے اور ایسے اصحابِ علم میدانِ عمل میں آئے جن کی مساعی سے پورا ہندوستان متاثر ہوا۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی بالخصوص لائقِ تذکرہ ہیں:-

۱- مولانا محمّد مظہر نانوتوی:- تحصیلِ علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد بریلی کالج میں تبادلہ ہو گیا۔ ۱۳۰۲ھ کو سہارن پور

میں لاولد فوت ہوئے۔

۲۔ مولانا محمد منیر نانوتوی :۔ مئی ۱۸۶۱ء کو بریلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔

۳۔ مولانا محمد احسن :۔ پہلے بنارس، پھر بریلی کالج میں منصب تدریس پر فائز ہوئے۔

۴۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی :۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والدِ گرامی تھے، بریلی کالج میں پڑھاتے رہے، پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے اور پنشن پانے کے بعد دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کیے گئے۔

۵۔ مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی :۔ بریلی، پیلی بھیت اور سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔

۶۔ شمس العلما مولوی ضیاء الدین دہلوی :۔ دہلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔

۷۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ :۔ کئی قسم کی تصنیفی و علمی خدمات انجام دیں۔

۸۔ شمس العلما محمد حسین آزاد :۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

۹۔ پیرزادہ محمد حسین، (سیشن جج)

۱۰۔ شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد :۔ ان کی بہت سی علمی مساعی کے علاوہ، بہت بڑی خدمت قرآنِ مجید کا اُردو ترجمہ ہے۔

۱۱۔ خواجہ محمد شفیع جج۔

۱۲۔ خان بہادر میر ناصر علی۔

۱۳۔ مولوی کریم الدین پانی پتی۔

۱۴۔ مولوی جعفر علی۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات ہیں جنھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی اور ان میں سے اکثر ملک کے تعلیمی نظام سے وابستہ ہوئے۔ انگریزی

حکومت کی باقاعدہ ملازمت کی اور جس حسن و خوبی سے اپنے مفوّضہ فرائض انجام دیے اس کی خود حکومت نے تحسین کی اور اس کا بہتر صلہ دیا۔

چند تلامذہ کرام

مولانا مملوک علی کے تلامذہ کی فہرست بہت وسیع ہے اور یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد فضل و کمال کے مختلف اہم گوشوں میں شہرت پائی اور نامور ہوئے۔ ان بزرگانِ عالی قدر میں درجِ ذیل حضرات خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہیں:۔

مولانا احمد حسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد یعقوب (ابنِ مولانا مملوک علی) نانوتوی، مولانا احمد علی سہارن پوری، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمان دیوبندی، شمس العلما ڈاکٹر ضیاء الدین، منشی جمال الدین مدارالمہام بھوپال، مولانا کریم الدین پانی پتی، مولانا عالم علی مراد آبادی، مولانا سمیع اللہ دہلوی، مولانا قاری عبدالرحمان پانی پتی، مولانا شیخ محمد تھانوی اور دیگر بہت سے بزرگ ——!

مولانا عبید اللہ سندھی نے سر سیّد احمد خاں، منشی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد کو بھی مولانا مملوک علی کے شاگردوں میں شامل کیا ہے —— ڈپٹی نذیر احمد نے تو مولانا ممدوح سے بے شک استفادہ کیا تھا (ملاحظہ ہو مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال و آثار ص ۵۱) لیکن سر سیّد اور منشی ذکاء اللہ نے ان سے کچھ نہیں پڑھا اور وہ دونوں ان کے شاگردوں میں شامل نہیں ہیں۔

مولانا مملوک علی سے ہندوستان کے بہت سے ان جلیل القدر علما نے علم حاصل کیا جو آگے چل کر درس و تدریس کی مسندوں پر فائز ہوئے اور جن سے بے شمار لوگوں کو فیض پہنچا اور پھر اس چشمۂ فیض سے لاتعداد افراد نے اپنی علمی تشنگی بجھائی —— یہ فیض اب تک جاری ہے اور ان کے شاگردوں کے شاگرد

جگہ جگہ علمی و تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور یہ سلسلہ کم و بیش ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے ـــــ اس حیثیت سے مولانا مملوک علی بلاشبہ استاذ العلما تھے اور انھوں نے جو اہم کام شروع کیا، وہ بدستور جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

حج بیت اللہ

مولانا مملوک علی اپنے آبائی وطن "نانوتہ" کی سکونت ترک کر کے مستقل طور پر دہلی میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اور وہاں کے کوچۂ چیلاں میں اپنا ذاتی مکان بنا لیا تھا۔ اُنھوں نے ۱۲۵۸ھ میں حج بیت اللہ کے لیے کالج سے رخصت لی اور اس مبارک سفر پر تشریف لے گئے۔ رجب ۱۲۵۸ھ کو وطن سے روانہ ہوئے، یکم ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ پہنچے اور حج کیا، پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے، اس طرح ایک سال بعد واپس دہلی آئے۔ اس اثنا میں آدھی تنخواہ حکومت کی طرف سے انھیں ملتی رہی۔

عوام اور حکومت کے نزدیک قدر و منزلت

ہر حلقے میں مولانا مملوک علی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ عالم و مدرس کی حیثیت سے انھوں نے بہت شہرت پائی، اہلِ علم بھی ان کی بہت تکریم کرتے تھے، عوام میں بھی ان کو عزت کا مقام حاصل تھا اور حکومت کے حلقوں میں بھی ان کو عالی مرتبت سمجھا جاتا تھا اور ان کے کام اور محنت سے متعلقہ حکام بہت خوش اور مطمئن تھے۔

دہلی کالج میں اُنھوں نے پچیس سال کچھ مہینے خدمتِ تدریس انجام دی، اس اثنا میں تقریباً پندرہ سال عربی کے نائب مدرس رہے اور دس گیارہ سال صدر مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ اس پوری مدت میں کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وہ معتمد علیہ رہے۔ کالج کی رپورٹوں سے (جو پروفیسر محمد ایوب قادری نے اپنی کتاب "مولانا محمد احسن نانوتوی" میں درج کی ہیں) واضح ہوتا

ہے کہ مولانا مملوک علی پر کالج کے تمام انگریز پرنسپل بہت اعتماد کرتے تھے۔ ہر سالانہ رپورٹ میں ان کی توصیف و تعریف کی جاتی تھی اور ان کے کام کو لائقِ اطمینان گردانا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ان کو خود ہندوستان کے گورنر جنرل نے انعام سے سرفراز کیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ۱۵ اور ۱۷ نومبر ۱۸۴۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار منعقد کیا — ۱۷ نومبر کے دربار میں سینتیس حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ مولانا مملوک علی مدرس اوّل کو خلعتِ سہ پارچہ مرحمت ہوا۔ اسی طرح مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعتِ ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر اور مفتی صدرالدین خان بہادر صدر الصدور دہلی کو خلعتِ سہ پارچہ اور ایک گھنٹہ ملا[۱۱۱]۔

اس زمانے میں انگریزی حکومت کی کوشش یہ تھی کہ مغربی علوم اور تعلیم کو ہندوستان کے مسلمانوں میں، بالخصوص دہلی کے مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، ان میں اس کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد میں انگریزی حکومت کامیاب رہی اور مسلمانوں نے جہاں عربی اور فارسی علوم حاصل کیے وہاں انھوں نے انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے حصول کو بھی درخورِ اعتنا قرار دیا۔ بہت سے مسلمان طلبا دہلی کالج اور اس قسم کے دوسرے کالجوں میں داخل ہوئے اور اس کے بہتر نتائج نکلے۔ مولانا مملوک علی اور بعض دیگر علمائے کرام کی کالجوں میں ملازمت اور خدمتِ تدریس کی وجہ سے بھی مسلمانوں میں اس کے لیے ایک کشش اور جاذبیت پیدا ہوئی۔

سیاسیات سے بے تعلقی

مولانا عبید اللہ سندھی کا کہنا ہے کہ ۱۲۵۸ھ میں جب مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی ہندوستان سے ہجرت کر کے حجازِ مقدس تشریف لے گئے تو ان کے

---

[۱۱۱] "مولانا محمد احسن" ص ۱۷۶ بحوالہ دہلی کا آخری سانس ص ۴۶۔

بعد سیاسی تحریک کو جاری رکھنے اور اُس کے انتظام کے لیے ایک بورڈ بنایا گیا تھا جس کے صدر مولانا مملوک علی تھے اور نواب قطب الدین، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی اس بورڈ کے رکن تھے ــــ لیکن مولانا سندھی کی یہ بات قرینِ صحت نہیں۔ اس کی موٹی موٹی تین وجوہ ہیں۔

اوّل:۔ مولانا مملوک علی نے کبھی سیاسیات میں حصہ نہیں لیا۔ ان کی تمام زندگی درس و تدریس میں گزری۔ سیاسی معاملات سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔

دوم:۔ مولانا مملوک علی انگریزی حکومت کے باقاعدہ ملازم تھے، وہ انگریز کی مخالفت کیونکر کر سکتے تھے۔

سوم:۔ دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپل ان کے مدّاح تھے۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا جا چکا ہے، ان کی تدریسی اور تعلیمی سرگرمیوں کی بنا پر ان کی ترقی ہوئی، تنخواہ میں اضافہ ہوا، اور یہ سب انگریز منصب داروں کی سفارش سے ہوا، خود ہندوستان کے گورنر جنرل نے ان کو انعام و اکرام اور خلعتِ سہ پارچہ سے نوازا۔ اگر یہ سیاسیاتِ ملکی میں ملوّث ہوتے تو انھیں ہرگز اس کا مستحق نہ گردانا جاتا۔

ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ اسی عالم دین کو "بڑا عالم" سمجھا جاتا ہے جو انگریزی حکومت کا مخالف رہا ہو۔ اگر مخالفت کا کوئی واضح ثبوت نہ مل سکے تو اس کے معتقدین کھینچ تان کر اس کو انگریز کا مخالف ثابت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ سیاسیات کبھی علم اور قابلیت کے حدود کو ماپنے کا پیمانہ نہیں رہی۔ اگر ایک شخص سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور وہ اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں کا محور و مرکز صرف خدمتِ علم و دین کو قرار دیتا ہے تو اس میں کیا بُرائی ہے ــــ؟ ہر شخص کو سیاست کی عینک سے دیکھنا ایک سیاستدان ہی کی سوچ ہو سکتی ہے، کسی محقق اور اصل واقعات کی تہ تک پہنچنے والے کی سوچ ہرگز نہیں ہو سکتی ــــ اگر مولانا مملوک علی اور اس دَور کے بہت سے دیگر

علمائے کرام نے اپنے عہد کی سیاست میں حصہ نہیں لیا تو کیا ان کے علم وعرفان میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے ؟ وہ وقتی سیاسی ہنگاموں سے دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود جلیل القدر عالم تھے اور ان کی خدماتِ علمی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ لہٰذا اس ضمن میں نہ کوئی معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے ، نہ ان کو کھینچ کر سیاسیات کے اکھاڑے میں لانے کی ضرورت ہے ۔ ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو سیاسی ہنگاموں سے دور رکھا اور درس وتدریس میں مشغول رہ کر بڑے بڑے اصحاب علم کو زیورِ علم سے آراستہ کیا اور "استاذ العلما" کا لقب پایا رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں کسی سیاسی تحریک کو جاری رکھنے اور اس کے انتظام کے لیے نہ کوئی بورڈ بنایا گیا تھا اور نہ کوئی اس کا رکن یا صدر تھا اور نہ اس کی ضرورت ہی تھی ۔

اخلاق وکردار

مولانا مملوک علی بلند اخلاق اور عالی کردار عالم تھے ۔ تواضع ، حلم ، بردباری اور انکسار کا پیکر تھے ۔ علم کے خادم اور علما کے قدر دان تھے طلبا سے نہایت حسنِ سلوک سے پیش آتے اور عمدہ انداز سے ان کو پڑھاتے تھے ۔ تصنّع اور تکلّف سے انھیں نفرت تھی ، سادہ لباس پہنتے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ وعظ وتقریر کی بالکل عادت نہ تھی ۔ ان کا اصل کام درس وتدریس تھا اور تمام عمر اسی میں مشغول رہے ۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے) نہایت مخلصانہ تعلقات تھے مولانا مملوک علی کے فرزند گرامی مولانا محمد یعقوب نانوتوی اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"جب مولوی (مظفر حسین کاندھلوی) صاحب دہلی تشریف لاتے تو والد مرحوم (مولانا مملوک علی) کے پاس ہمارے مکان میں فروکش ہوتے اور والد مرحوم جب وطن (نانوتہ) جاتے ، کاندھلہ ہو کر جاتے ۔ جب وطن لوٹتے کاندھلہ ٹھہر کر دہلی روانہ ہوتے اور یہی حال حاجی امداد اللہ صاحب سے تھا [۱۱۲]

---

[۱۱۲] سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی ، ص ۱۲ ۔

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"مولانا مملوک علی صاحب ہمیشہ دہلی آتے اور جاتے، جب کاندھلہ سے گزرتے تو باہر سڑک پر گاڑی کو چھوڑ کر ملنے آتے۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب اوّل یہ پوچھتے کہ کھانا کھا چکے یا کھاؤ گے؟ اگر کہا کھا چکے تو کچھ نہیں، اور اگر نہ کھائے ہوئے ہوتے تو کہہ دیتے کہ میں کھاؤں گا، تو مولانا پوچھتے کہ رکھا ہوا لا دوں یا تازہ پکوا دوں؟ چنانچہ ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ رکھا ہوا لا دو۔ اس وقت صرف کھچڑی کی کھرچن تھی، اسی کو لے آئے اور فرمایا رکھی ہوئی تو یہی تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ بس یہی کافی ہے۔ پھر جب رخصت ہوتے تو مولانا مظفر حسین صاحب ان کو گاڑی تک پہنچانے جاتے تھے۔ یہی ہمیشہ کا معمول تھا۔[۱۱۳]

بلاشبہ یہ حضرات خلوص و دیانت، نرمی و انکسار اور الفت و مودت کا نمونہ تھے اور ان کی حیاتِ مستعار کا ایک ایک لمحہ ذکرِ الٰہی اور خدمتِ علم و علما میں گزرتا تھا۔ اب دنیا اس قسم کے سراپا عمل لوگوں سے خالی ہو گئی ہے اور ہر طرف مادیت کا دور دورہ ہے۔

تراجم

مولانا مملوک علی کے شب و روز درس و تدریس میں بسر ہوتے تھے اور ہر وقت ان کے گرد حصولِ علم کے شائقین کا مجمع رہتا تھا۔ تصنیف و تالیف سے انھیں دلچسپی بھی نہ تھی اور اس کے لیے فرصت بھی نہ ملتی تھی۔ البتہ دہلی کالج کی طرف سے جن کتابوں کا کسی زبان سے اُردو میں ترجمہ کرایا جاتا تھا، ان میں سے زیادہ تر کی نگرانی ان کے سپرد تھی اور ان پر نظرِ ثانی بھی وہی کرتے تھے۔ کالج کے زمانے میں انھوں نے جن کتابوں کے خود ترجمے کیے وہ مندرجہ تحت ہیں۔

۱۔ جامع ترمذی :۔ یہ کتاب دہلی کالج کے نصاب میں شامل تھی۔ لہٰذا انھوں

---

۱۱۳ حالات مشائخ کاندھلہ ص ۳۴، ۳۵۔

نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا۔

۲۔ تحریر اقلیدس :- دہلی کالج کے ایک انگریز پرنسپل کے کہنے پر ۱۸۴۴ء میں اس کے ابتدائی چار مقالوں اور آخر کے دو مقالوں (گیارھویں اور بارھویں) کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا — مولوی کریم الدین پانی پتی اس ترجمے کی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ترجمہ اُردو زبان میں پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے ہر ایک شکل کو حل کیا۔"

یہ کتاب صرف دو مرتبہ چھپی۔ ۱۸۴۹ء میں ایک سو پچاس کا پیاں اور ۱۸۵۱ء میں تین سو کاپیاں طبع ہوئیں۔

۳۔ تاریخ یمینی : یہ کتاب بھی دہلی کالج میں داخلِ نصاب تھی۔ مولانا ممدوح نے اس کا بھی اُردو ترجمہ کیا۔

۴۔ عربی خط (غیر منقوط) مولوی کریم الدین پانی پتی نے "فرائد الدھر" میں ان کا ایک عربی خط نقل کیا ہے جو غیر منقوط ہے اور شہزادہ فیروز شاہ کے نام ہے[۱۱۴]

وفات

دیارِ ہند کے اس عالمِ اجلّ پر مرضِ یرقان کا حملہ ہو گیا تھا۔ گیارہ دن اس مرض میں مبتلا رہے اور ۱۱۔ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۷ راکتوبر ۱۸۵۱ء) کو عالمِ جاودانی کی راہ لی — شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندانی قبرستان مہندیوں میں شیخ عبدالعزیز شکر بار کے پائیں میں دفن ہوئے — انھوں نے دہلی میں علم حاصل کیا، دہلی میں ہمیشہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور دہلی ہی کی سرزمین میں ابدی نیند سو گئے — اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ دہلی کالج کے پرنسپل نے ۱۳ راکتوبر ۱۸۵۱ء کو مولانا کے انتقال کی اطلاع مجلسِ انتظامیہ کو دی۔

۱۱۴؎ مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۸۱۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی

مولانا محمد یعقوب نانوتوی ان کے عالی قدر فرزند تھے۔ انھوں نے بھی باپ کی طرح بڑی شہرت پائی اور بہت تدریسی خدمت انجام دی۔ ۱۳۔ صفر ۱۲۴۹ھ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ محرم ۱۲۶۰ھ میں جب کہ ان کی عمر صرف گیارہ برس تھی، ان کو اور مولانا محمد قاسم کو مولانا مملوک علی بغرضِ تعلیم نانوتہ سے دہلی لے گئے تھے۔ محمد یعقوب دہلی کالج کے طالب علم رہے اور علوم متداولہ اپنے والد گرامی (مولانا مملوک علی) سے پڑھے۔ علم حدیث کی تحصیل شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی اور مولانا احمد علی سہارن پوری سے کی۔ باپ کی وفات کے بعد تقریباً ایک سال اپنے مکان (کوچہ چیلاں، دہلی) میں رہے۔ اس کے بعد چالیس روپے ماہانہ تنخواہ پر گورنمنٹ کالج اجمیر میں معلم مقرر ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ پانچ سال وہاں رہے۔ بعد ازاں سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ اسی اثنا میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا۔ اس دوران میں وہ اپنے وطن نانوتہ میں مقیم رہے۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو دارالعلوم (دیوبند) قائم ہوا تو اس میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں وہ سرکاری ملازمت سے علیحدہ ہو چکے تھے اور میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے چھاپہ خانہ میں ملازم تھے۔ دارالعلوم (دیوبند) کے وہ سب سے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے، اور تنخواہ تیس روپے ماہانہ تھی۔ انیس سال یہ خدمت انجام دی۔ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ طلبا نے ان سے حصولِ علم کیا جو اپنی بوقلموں خصوصیات کی بنا پر اپنے دور کے اعاظمِ رجال میں شمار ہوئے۔

جلیل القدر باپ کی طرح مولانا محمد یعقوب بھی زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ تصنیف تالیف سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تحریری صورت میں ان کی صرف تین چیزیں دست یاب ہیں (۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی (۲) مکتوبات مولانا محمد یعقوب (حصہ اول) اور (۳) مکتوبات یعقوبی د

بیاض یعقوبی — شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔

اس عالم اجل نے ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۲۱ دسمبر ۱۸۸۴ء) کو ہیضے کی بیماری سے اپنے وطن نانوتہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

تذکرہ نگاروں کا اظہارِ عقیدت

سرسید احمد خاں مرحوم نے جب "آثار الصنادید" لکھی اس وقت مولانا مملوک علی زندہ تھے۔ وہ مولانا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"شاگردِ رشید مولوی رشید الدین خان صاحب، علم معقول و منقول میں استعداد کامل۔ اور کتبِ درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو ان کی لوحِ حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔ ان سب کمال اور فضیلت پر خلق و حلم احاطۂ تقریر سے افزوں۔ اگرچہ زیّ دنیا داروں کی ہے، لیکن سیرت اور سریرت میں درویشانہ .... اب کئی سال سے سرگروہِ مدرسین ہیں کہ مدرسی اوّل اس سے عبارت ہے۔ انشاءِ نظم و نثر کی طرف کم توجہ ہے۔ اگر ایسا فاضل اس طرف بھی متوجہ ہوتا تو یقین ہے کہ اس فن میں اپنے اقران و امثال سے ممتاز ہوتا[115]"

"واقعاتِ دار الحکومت دہلی" کے مصنف بشیر الدین احمد تحریر کرتے ہیں "شیخ عبدالعزیز صاحب شکر بار کے پائیں میں آپ کی قبر کچی ہے۔ جب تک کوئی نہ بتائے نہیں مل سکتی۔ نا قدر دانیٔ زمانہ ملاحظہ ہو کہ آپ کے ہزاروں شاگرد صاحبِ ثروت و اقتدار تھے، مگر اُستاد کو کسی نے بھی نہ پوچھا اور اتنا بھی نہ کیا کہ ایک ہاتھ بھر کا پتھر کا ٹکڑا لگا دیتے کہ اس خاک کے ڈھیر پر سے گزرنے والے فاتحہ تو پڑھ لیتے۔ آپ کا اصل وطن نانوتہ ضلع سہارن پور ہے، مگر جب سے دلّی میں مدرس ہوئے آب و دانہ کی کشش نے جانے نہ دیا۔ آپ مولانا رشید الدین

---

[115] آثار الصنادید، ص ۲۹۲ ؎

خاں کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تمام ہندوستان آپ کے فیض سے مملو ہے[۱۱۶]۔
نواب محمد صدیق حسن خاں ان کے بارے میں رقم طراز ہیں :-

"از اعیانِ دہلی بودند، تلمذِ ایشاں در علوم درسیہ با مولوی رشید الدین خاں است، و از طرفِ فرنگیاں تدریس درجہ اوّل مدرسہ دہلی بایشاں تعلق داشت[۱۱۷]۔"

یعنی وہ (مولانا مملوک علی) دہلی کے اکابر میں سے تھے اور علوم درسیہ میں مولانا رشید الدین خاں کے شاگرد تھے۔ مدرسۂ دہلی میں انگریزوں کی طرف سے جماعتِ اوّل (عربی) پڑھانے کے لیے مقرر تھے۔

مولوی کریم الدین پانی پتی جو مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے، اُستاذ کے فضل و کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بنائے مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی اور اُردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں۔ ہر ایک علم اور فن سے جو ان زبانوں میں ہیں، مہارتِ تامہ ان کو حاصل ہے، اور جس فن کی کتاب اُردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے، اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے۔ گویا اس فن کو اوّل ہی سے جانتے تھے، اور جس کام پر مامور ہیں، اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو[۱۱۸]۔"

مولوی کریم الدین پانی پتی نے اپنی ایک اور کتاب "تذکرہ فرائد الدہر" میں بھی مولانا مملوک علی کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کا تمام وقت درس و تدریس میں گزرتا تھا اور سیکڑوں طلبا ان سے تعلیم پاتے تھے جو طالب علم

---

۱۱۶ واقعات دار الحکومت دہلی، ج ۲، ص ۵۸۴۔

۱۱۷ تاریخ قنوج (قلمی) از نواب صدیق حسن ص ۱۰۰ (مرتبہ ۱۲۷۸ھ) مخزونہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ حبیب گنج کلکشن۔

۱۱۸ تذکرہ طبقات الشعرائے ہند، ص ۴۶۳۔

بھی حصولِ علم کے لیے آتا، وہ اس کو مایوس نہ کرتے اور اس کے دل کو رنج نہ پہنچاتے۔ پوری وسعتِ قلب اور حسنِ اخلاق سے پیش آتے اور اُسے وہ علم پڑھاتے جو وہ پڑھنا چاہتا۔ گھر میں بھی اور مدرسے میں بھی ان کے گرد طلبا کا ہجوم رہتا۔ اس ضمن میں مولوی کریم الدین کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

"گھر اس کا محط الرجال طلبا، مدرسہ اس کا مجمع علما و فضلا، صدہا شاگرد اس ذاتِ بابرکات سے فیض اُٹھا کر اطراف و اقطارِ ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے...... سوائے درس دہی طلبائے مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں...... تمام اوقاتِ گرامی ان کے تعلیم طلبا میں نصف شب تک منقسم ہیں...... ان کی خدمت میں صدہا طالب علم اطراف و جوار میں سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسنِ اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں[۱۱۹]"

مولانا مملوک علی کے تلامذہ کی وسعت پذیر فہرست میں مولانا رشید احمد گنگوہی بھی شامل ہیں۔ مولانا گنگوہی کے حالات میں مولانا عاشق علی میرٹھی نے "تذکرۃ الرشید" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ مولانا مملوک علی کے اسلوب تدریس کے بارے میں مولانا گنگوہی کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

"ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے، لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی، کبھی سبق تھوڑا ہوتا تھا اور کبھی شبہات کا جواب نہ ملتا تھا، مگر جب مولانا مملوک علی صاحب کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہو گیا اور بہت تھوڑے عرصے میں کتابیں ختم کر لیں، گویا استاد نے گھول کر پلا دیا۔ (مولانا گنگوہی) فرمایا کرتے تھے کہ "اس زمانے میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے، مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواعِ مختلفہ سے تقریر کرکے

---

۱۱۹ تذکرہ نرائد الدھر، ص ۴۰۲

شاگرد کے ذہن نشین کر دیں، ایک ہمارے استاد مولانا مملوک علی صاحب اور دوسرے ہمارے استاد مفتی صدر الدین صاحب تھے، رحمۃ اللہ علیہما[۱۲۰]۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی جو مولانا مملوک علی کے فرزند گرامی تھے اور اپنے دور کے جید عالم تھے، اپنے والدِ مکرم کے اسلوبِ تدریس کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا، وہ طرزِ عبارت سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں"[۱۲۱]

سید عبد الحی حسنی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں:-

مولانا مملوک علی صدیقی نانوتوی، شیخ اور عالم کبیر تھے، مولانا رشید الدین خان دہلوی کے شاگرد تھے، فقہ، اصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے، منطق و فلسفہ میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ تمام عمر درس و تدریس میں مشغول رہے اور خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا[۱۲۲]۔

مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں:

"انھوں (مولانا مملوک علی) نے مولانا رشید الدین سے اخذِ علم کیا اور علوم عربیہ، فقہ اور فنون کے حصول میں اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے۔ اپنے استاد مولانا رشید الدین کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر کیے گئے"[۱۲۳]۔

---

۱۲۰ تذکرۃ الرشید، ج ا ص ۳۰، ۳۱

۱۲۱ سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص ۱۸

۱۲۲ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۸۷

۱۲۳ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۸۱ ــــ مولانا سندھی کا یہ کہنا درست نہیں کہ مولانا مملوک علی کو ان کے استاد مولانا رشید الدین خاں کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک علی کو ایک ساتھ ہی یہ منصب تفویض کیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مولانا رشید الدین خان کو شعبہ عربی کا صدر مدرس بنایا گیا تھا اور سو روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ مولانا مملوک علی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

۱۰۶۔ مُلّا مہدی مازندرانی

ہندوستان کے شیعہ علماء و فقہا میں مُلّا مہدی بن محمد شفیع استرآبادی مازندرانی اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کا مولد و منشا ایران کا ایک شہر مازندران ہے۔ سیّد علی طباطبائی اور بعض دیگر اہلِ علم سے تعلیم حاصل کی۔ پھر ۱۲۴۰ھ کو غازی الدین حیدر کے عہدِ حکومت میں لکھنؤ پہنچے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ یہ لکھنؤ میں شاہانِ اودھ کا دور تھا اور بہت سے اہل سنت اور شیعہ اصحابِ علم وہاں موجود تھے اور ان کے باہم مباحثے اور مناظرے بھی ہوتے رہتے تھے۔ لیکن مُلّا مہدی نے ان مباحث و مناظرات میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ وہ ایک فاضل مجتہد تھے اور سب علائق سے منقطع ہو کر تدریس و تصنیف میں مشغول رہتے تھے۔ ان کا گھر ہی ان کا مدرسہ تھا اور وہیں طلبا کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم دیتے تھے اور گھر ہی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ عام لوگوں سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ کسی کے ہاں آمد و رفت تھی۔

مُلّا مہدی مازندرانی نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

۱۔ قناطیس العقول فی قواعد الاصول۔

۲۔ نبارِیس الفرعیات فی نوامیس الشرعیات۔

۳۔ حاشیہ مطوّل۔

۴۔ اصولِ دین سے متعلق ایک رسالہ جو فارسی زبان میں ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے بعض رسائل بھی تحریر کیے جو ان کے دور میں کافی مشہور ہوئے اور اہلِ علم کے مطالعے میں رہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) کا تقرّر نائب مدرس کی حیثیت سے ہوا تھا اور تنخواہ پچاس روپے تھی۔ تاریخ تقرری یکم جون ۱۸۲۵ء ہے۔

اس شیعہ مصنف وفقیہ نے ماہِ ذلقعدہ ۱۲۵۹ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی اور قبرستانِ حسینیہ مجتہد میں دفن ہوئے[۱۲۴]

۱۰۷۔ سیّد مہدی لکھنوی

سیّد مہدی لکھنوی شیعہ عالم وفقیہ تھے اور صاحبِ تصنیفات تھے۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: مہدی بن ہادی بن مہدی بن دلدار علی حسینی لکھنوی۔

سیّد مہدی اکابر علمائے شیعہ میں سے تھے اور مجتہد کے درجے پر فائز تھے۔ اپنے زمانے کے شیخ اور فاضل شخص تھے۔۔۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ ان کے آباواجداد علم کی دولت سے مالامال تھے۔ اپنے والدِ مکرم (سیّد ہادی) سے حصولِ علم کیا اور والد کے عمِّ محترم سیّد محمد بن دلدار علی سے سند لی۔ سیّد مہدی تقریر وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف کا شوق بھی رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے صرف دو کتابوں کا پتا چل سکا ہے اور وہ مندرجۂ ذیل ہیں۔

۱۔ تحفة الصائم۔

۲۔ رسالہ فی الاجتهاد والتقليد۔

سیّد مہدی حسینی لکھنوی نے اپنے والد سیّد ہادی کی وفات کے دو سال بعد ۱۲۷۷ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی[۱۲۵]

---

[۱۲۴] نجوم السماء ص ـــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۹۰، ۴۹۱

[۱۲۵] تکملہ نجوم السماء ص ـ نزہۃ الخواطر، ج ۷، صفحہ ۴۹۱

ن

۱۰۸ــــسیّد ناصر حسین جون پوری

صوبہ یوپی کا شہر جون پور کسی زمانے میں اہل علم کا مرکز اور اصحاب فضل کا مسکن تھا۔ اس میں جہاں اہل سنّت کے علما کثیر تعداد میں فروکش تھے، وہاں شیعہ علما بھی آباد تھے۔ اس شہر کو "شیراز ہند" کہا جاتا ہے، اس لیے کہ مختلف اوقات و ادوار میں بے شمار مصنفین و مؤلفین، متعدد مدرسین و معلمین اور بہت سے فقہا و علما اس میں اقامت گزین رہے اور ہر مسلک و مذہب کے اصحاب کمال یہاں جمع ہو گئے تھے۔

تیرھویں صدی ہجری میں جن علما و فقہا نے اس شہر کو رونق بخشی، ان میں ایک عالم و فقیہ سیّد ناصر حسین تھے جو سیّد مظفر حسین حسینی جون پوری کے فرزند تھے اور نامور شیعہ عالم تھے۔

سیّد ناصر حسین حسینی جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بعض درسی کتابیں اپنے شہر کے ممتاز حنفی عالم مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری سے پڑھیں اور بعض کی تکمیل مولانا عبدالعلیم انصاری لکھنوی سے کی۔ پھر جون پور کے ایک ممتاز شیعہ عالم گلشن علی کے درس میں حاضر ہوئے۔ ان سے شیعہ امامیہ کی فقہ اور علم کلام کی کتابیں پڑھیں۔

اس کے بعد لکھنؤ گئے، وہاں سیّد محمد نقی کا سلسلۂ درس جاری تھا جو اس دور کے شیعہ مجتہد تھے، ان سے اخذ علم کیا۔ پھر حرمین شریفین کا قصد کیا اور سعادت حج حاصل کی۔ وہاں سے عازم عراق ہوئے اور مختلف مقامات میں گھومے پھرے۔ بعد ازاں ہندوستان آئے۔

سیّد ناصر حسین نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ علم الادب فی مناھج کلام العرب : یہ عربی محاورات سے متعلق ہے اور عربی میں ہے۔
۲۔ ایک رسالہ عربی ادب کے بارے میں۔
۳۔ رشق النبال : یہ اثباتِ متعہ اور تحریفِ قرآن سے متعلق ہے۔
۴۔ ایک رسالہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق۔ اُردو میں۔
۵۔ ایک رسالہ آیت تطہیر کی تفسیر میں۔ اُردو میں۔
۶۔ ایک رسالہ نجاستِ مشرکین کے اثبات میں۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے۔
۷۔ اہل بیت کے مصائب و آلام کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب اُردو میں۔
ان کے علاوہ کچھ اور رسائل بھی تحریر کیے[1]

۱۰۹۔ سیّد نثار علی ظفرآبادی

سیّد نثار علی بن محمد صادق حسینی واسطی ظفرآبادی، جلیل القدر عالم، مشہور شیخ اور ممتاز محدّث تھے۔ ان کی ولادت و تربیت ظفرآباد میں ہوئی۔ جو جون پور کے قریب صوبہ یوپی کا ایک شہر ہے۔ ابتدائی کتابیں ظفرآباد اور جون پور کے اساتذہ سے پڑھیں، پھر الٰہ آباد گئے، وہاں شاہ خوب اللہ کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور شاہ صاحب سے استفادہ کیا۔ شاہ برکت اللہ سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔ پھر دہلی گئے۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا زمانہ تھا اور دہلی کو اس عہد میں گہوارۂ علم کی حیثیت حاصل تھی۔ سیّد نثار علی نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور چار سال ان کے

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۸۱ تا ۸۳ — تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۴۳۷، ۴۳۸۔
نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۹۳، ۴۹۴

حلقۂ درس میں شامل رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے شاہ صاحب سے خوب استفادہ کیا۔ تکمیل علم کے بعد اپنے شہر جون پور گئے اور درس و افادہ کی مسند بچھائی۔ بہت سے علما و طلبا ان سے مستفید ہوئے اور ان کی شہرت گرد و نواح میں پھیل گئی۔

سید نثار علی حدیث و فقہ کے جید عالم تھے اور فلسفہ و منطق میں بھی انھیں درک حاصل تھا۔ متواضع، حسنِ اخلاق سے مالا مال، شیریں گفتار اور عالی کردار تھے۔ لوگوں سے نہایت اچھے مراسم رکھتے تھے اور سب سے حسنِ ظن کا اظہار کرتے تھے۔

اس عالمِ کبیر اور فقیہ نامدار نے جمعۃ المبارک کے دن ۲۷۔ شوال ۱۲۱۵ھ کو "میاں پورہ" میں وفات پائی جو اعمالِ الہ آباد میں ایک گاؤں ہے[2]

۱۱۰ — قاضی نجم الدین علی خاں ثاقب علوی کاکوروی

سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا تو انھیں ایسے علما و فقہا کی تلاش تھی جو "مسلم پرسنل لا" تیار کر کے مسلمانوں کے فقہی مسائل کو ان کے ذہن و فکر کے مطابق نافذ کر سکیں۔ اس عہد کا ہندوستان اپنے علم و فضل میں مشہور تھا۔ خصوصاً صوبۂ اودھ کے قصبات و دیہات کو اس ضمن میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ اسی صوبے کے مشہور و مردم خیز قصبہ کاکوری کے ایک عالمِ دین پر ان کی نظر پڑی اور انھیں "قاضی القضاۃ" کا منصب عطا کیا گیا۔ ان کا کام قرآن و حدیث اور فقہ کے ائمۂ اربعہ کے فتاوے کی روشنی میں مسلمانوں کے مذہبی معاملات کے فیصلے کرنا تھا۔ اس عالم و فقیہ کو "قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین علی خاں علوی بہادر اشرف جنگ ثاقب کاکوروی" کے نام سے

---

[2] تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۹۷۸، ۹۷۹ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۹۴؎

پہچانا جاتا ہے۔

عہدِ اکبری سے قصبہ کاکوری (ضلع لکھنؤ) میں علویوں کے دو ممتاز خاندان آباد ہیں، جن میں ایک خاندان مخدوم زادگان کا ہے جس کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم نظام الدین القاری المعروف بہ شاہ بھکاری کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ دوسرا خاندان ملک زادوں (مولوی زادوں) کا ہے، جس کے نسب کا سلسلہ ملک بہاء الدین کیقباد بن ملا ابوبکر جامی کے ذریعے حضرت علی رض پر منتہی ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں خاندانوں میں ہر دور میں بڑے بڑے مشاہیر فضلا و علما، فقہا و فقرا، اربابِ دولت و ثروت اور صاحبانِ دل پیدا ہوتے ہیں۔

نام و نسب

قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں ملک زادگان کے اس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس کے اسلاف جس قدر باعثِ رشک ہوئے، اسی قدر اس کے اخلاف قابلِ فخر ہوتے ہیں۔ سلسلۂ نسب تیس واسطوں سے حضرت علی رض تک اس طرح پہنچتا ہے۔ نجم الدین علی خاں ثاقب (۱) بن ملا حمید الدین محدث رح (۲) بن ملا غازی الدین شہید (۳) بن ملا محمد غوث (۴) بن ملک ابوالخیر (۵) بن ملک عبد الغفار معروف بہ ملک ابو المکارم (۶) بن ملک عبد السلام (۷) بن ملک میٹھے (۸) بن ملک حافظ چاند (۹) بن ملک حسام الدین (۱۰) بن ملک نظام الدین (۱۱) بن ملک بہاء الدین کیقباد (۱۲) بن ملا ابوبکر جامی[۱] (۱۳) بن خواجہ درویش علی محمد (۱۴) بن خواجہ شیخ احمد جام زندہ فیل (۱۵) بن خواجہ شیخ جامی (۱۶) بن خواجہ ابوطالب جامی (۱۷) بن خواجہ

۱؎ ملا ابوبکر جامی کی شادی ملک اسعد الدین سالاری وزیر اعظم سلطان حسین شرقی فرماں روائے سلطنتِ جون پور کی بیٹی کے ساتھ ہوئی جن کے بطن سے بہاء الدین کیقباد پیدا ہوئے۔ اس وقت سے ننھیالی نسب کے لحاظ سے ان کا لقب ملک قرار پایا۔ اسی بنا پر ان کی اولاد ملک زادے کہلائی۔

محمد شاہ جامی (۱۸) بن خواجہ محمد رضا جامی (۱۹) بن خواجہ موسیٰ جامی (۲۰) بن خواجہ عمران جامی (۲۱) بن خواجہ عثمان (۲۲) بن خواجہ ابو حنیف (۲۳) بن خواجہ اسفند یار (۲۴) بن خواجہ ابوالحسن کوفی (۲۵) بن خواجہ ابو تراب (۲۶) بن خواجہ محمد رضی کوفی (۲۷) بن خواجہ محمد (۲۸) بن حضرت ابوالقاسم (۲۹) بن حضرت محمد ابن الحنفیہ (۳۰) بن حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

ولادت اور تعلیم

قاضی نجم الدین کی ولادت ۱۵۔ ربیع الاوّل ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء) کو کاکوری میں ہوئی۔ مادۂ سال ولادت کسی نے نجم ثاقب نکالا۔[۴]

تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد ملا حمید الدین محدث (۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء) ملا حسن فرنگی محلی اور مولانا غلام یحییٰ بہاری سے حاصل کی۔ بچپن ہی سے بڑے ذہین و طبّاع تھے۔ صاحب سفرنامۂ لندن رقم طراز ہیں کہ: "پندرہ برس کی عمر میں معقولات و منقولات کی کتابوں سے فارغ ہوئے[۵] علم حدیث کی سند شیخ ابوالحسن سندھی سے حاصل تھی۔[۶] صاحب نزہۃ الخواطر نے ان کے بارے میں جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:

"شیخ و فاضل قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں ہندوستان کے مشہور علما میں سے تھے۔ ۱۵۔ ربیع الاوّل ۱۱۵۷ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ اپنے والد سے علم حاصل کیا، پھر شیخ عبدالرشید جون پوری سے جو لکھنؤ میں مدفون ہیں اور شیخ غلام یحییٰ بن نجم الدین بہاری اور ملا حسن بن غلام مصطفیٰ لکھنوی سے تحصیل علم کی اور شاید فنونِ ریاضی کا اکتساب علامہ تفضل حسین کشمیری (م ۱۲۱۵ھ)

---

[۴] باقیات الصالحات۔ مولوی ممتاز الدین حیدر (مخطوطہ)

[۵] سفرنامۂ لندن۔ مسیح الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ (مخطوطہ): ۳۶۴

[۶] تذکرہ مشاہیر کاکوری۔ حافظ شاہ علی حیدر قلندر۔ ص، ۳۴۷

سے کیا تھا۔[۵۷]

علم وفضل

یوں تو تمام علوم وفنون میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، لیکن علم جفر ورمل اور ریاضی میں بڑی دستگاہ تھی۔ سفرنامہ مولوی مسیح الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ[۵۸] کے مندرجہ ذیل واقعے سے آپ کی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے:۔

"نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۶ تا ۱۷۷۵ء) کو خود علم جفر کا بڑا شوق تھا نواب مذکور کو اتفاق سے اس فن میں حکیم ماشاء اللہ خاں سے ایک کتاب مل گئی تھی، جسے وہ نہایت عزیز رکھتا تھا۔ اس کی تصحیح کے لیے فیض آباد اور فیض آباد سے باہر کے علما مقرر ہوئے، مگر کسی سے اس کی صحت نہ ہوسکی۔ قاضی القضاۃ نجم الدین صاحب کو بھی اس کی تصحیح کے لیے طلب کیا گیا۔ انھوں نے محض یادداشت پر اس کی تصحیح شروع کر دی اور ساتھ ہی ایک بسیط شرح بھی لکھنی شروع کر دی۔ خود نواب موصوف روزانہ آکر اس کو دیکھتا اور بہت خوش ہوتا۔ اکثر یہ ہوتا کہ نواب کو آتے دیکھ کر یہ تعظیماً کھڑے ہوجاتے مگر وہ باصرار ان کو بٹھا دیتا اور خود کھڑے ہوکر ان کا کام دیکھتا رہتا۔ نواب نے اپنی تخت نشینی کے بعد یہ طے کر لیا تھا کہ اب کسی کو معافی نہ دی جائے گی، چنانچہ جن جن اشخاص کو معافیاں دی گئی تھیں وہ بھی ضبط کر لی گئیں۔ ملا حمید الدین محدث کاکوروی کو بھی ایک موضع موسومہ "دگھیا" معاف ہوا تھا، وہ بھی ضبط ہوگیا۔ قاضی القضاۃ نجم الدین نے اپنے حسنِ خدمت

---

۵۷ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۹۷

۵۸ حاجی مسیح الدین خاں (بن قاضی علیم الدین خاں بن قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں) سفیر شاہ اودھ و میر منشی گورنر جنرل بہادر (م ۱۲۹۲ھ) کا یہ سفرنامہ اس عہد کے اودھ کی حالت اور انگریزوں کے مستند و دلچسپ حالات میں ایک نادر و نایاب مخطوطہ ہے۔ چودہ سو صفحات پر مشتمل یہ مخطوطہ پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ اس کے ایک باب میں مؤلف موصوف نے اپنے اہل خاندان کے حالات تحریر کیے ہیں۔

اور کارگزاری کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے معافی کی درخواست دی۔ بظاہر اس موضع کی واپسی کی کوئی صورت نہ تھی، لیکن نواب نے ان کی ذاتی لیاقت اور حسنِ عمل کی بنا پر وہ موضع دوبارہ معافی میں دے دیا۔ چنانچہ یہ معافی کا پروانہ لے کر گھر آئے اور حسبِ دستور سابق درس و تدریس میں مشغول ہو گئے[۹]

قاضی نجم الدین علی خاں کے علم وفضل اور کمال کا شہرہ سن کر الماس علی خاں نے ان کو اپنے مدرسے کا منصبِ مدرسی قبول کرنے کو کہا، جسے اُنھوں نے قبول کر لیا۔

منصب قاضی القضاۃ

تذکرۂ مشاہیر کاکوری میں مرقوم ہے کہ "آغاز تیرھویں صدی ہجری میں منجانب ایسٹ انڈیا کمپنی جب عہدۂ قاضی القضاۃ پر تقرّری کی تجویز کلکتہ میں ہوئی تو اس زمانے میں علامہ تفضل حسین خان نے (جو آصف الدولہ بہادر ۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) کے وقت میں کلکتہ میں سفیر تھے، ان کے فضائل وکمالاتِ علمی کا تذکرہ گورنر جنرل بہادر سے کیا، اس وقت اس عہدے میں تقرر کا مسئلہ سرکار انگریزی میں درپیش تھا۔ بہت سے علما کے نام سامنے تھے، خوش قسمتی سے یہی منتخب ہو کر ممالک محروسہ سرکار کمپنی کے اوّل قاضی القضاۃ مقرر ہوئے[۱۰]

انگریزوں نے ان کی صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے منصب قاضی القضاۃ پر ان کو متعین کیا۔ علامہ تفضل حسین خان نے ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں گورنر جنرل بہادر کے حکم سے تقرّری کا خط بھیجا، لیکن والد ماجد نے لائق بیٹے کو اتنی دُور کلکتے نہ جانے دیا۔ مگر جب علامہ موصوف نے بہت اصرار کیا تو اجازت دے دی چنانچہ آپ کلکتے پہنچے۔ اس زمانے میں سر جان شور گورنر تھا، وہ استقبال کے لیے

---

۹ سفرنامہ لندن، ص ۵ - ۳۶۴

۱۰ تذکرہ مشاہیر کاکوری، ص ۳۳۴

آیا۔ قاضی صاحب کو خود پالکی سے اُتارا اور معانقہ کیا۔ آپ جب تک وہاں رہے بڑی عزت و احترام کے ساتھ رہے۔ گورنر جنرل عیدین کے مواقع پر خود ان کے پاس آتا اور معانقہ کرتا تھا[11]

باوجودیکہ آپ ایسے منصب پر فائز تھے جس سے درس و تدریس کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا، لیکن کلکتے کے دورانِ قیام میں آپ نے یہ مشغلہ برابر جاری رکھا، چنانچہ صاحب تذکرہ علمائے ہند آپ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ :۔

بمنصب قضی القضاۃ کلکتہ ممتاز بود، مع ہذا تدریس و افادۂ طلبائے علوم لغایت می کوشید[12]

(باوجودیکہ کلکتہ کے قاضی القضاۃ کے منصب پر ممتاز تھے، لیکن درس و تدریس اور طالبانِ علم کے افادہ کے لیے کوشاں رہتے۔)

ہندوستان کے تمام صوبوں مثلاً اودھ، الٰہ آباد، اکبر آباد، اوڑلیہ، بنگال اور بہار اور ڈھاکہ وغیرہ تمام جگہوں پر آپ کے فتوے پر مسلمانوں کے فیصلے ہوتے تھے۔ پچیس سال عہدۂ قاضی القضاۃ پر متمکن رہے اور نہایت خوبی سے اپنے فرائضِ منصبی انجام دیے۔ اس کے بعد بہ سبب کبر سنی اس عہدے سے مستعفی ہوئے[13]

فولاہ القضاء الاکبر فاستقل بہ خمساً وعشرین سنۃ[14]

(گورنر جنرل نے ان کو قاضی القضاۃ بنایا، اس عہدے پر وہ پچیس سال فائز رہے)

نواب علی حسن خاں سلیم نے تذکرۂ صبح گلشن میں ان کے بارے میں جو کچھ فارسی میں لکھا ہے اس کا اُردو ترجمہ یہ ہے :۔

"ثاقب قاضی القضاۃ محمد نجم الدین خاں بہادر لکھنؤ سے دس میل کے فاصلے پر قصبہ

---

[11] سفرنامہ لندن، ص ۳۷۰ -

[12] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۳۳ -

[13] سفرنامہ، ص ۳۷۰ - [14] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۴۹۷

کاکوری کے رئیس تھے۔ قرب و جوار کے تمام قصبات سے زیادہ یہاں صاحبانِ فضل و کمال و مردم خوش رفتار اور نیک کردار، سچے لوگ تھے۔ آپ کے والد ملا حمید الدین علوم ظاہری و باطنی میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ دادا ملا محمد غوث صاحب فضل و کمال اور علم حدیث میں شہنشاہ عالم گیر کے اُستاد تھے اور آپ دنیاوی و دینی اعتبار سے نجم ثاقب تھے۔ اخلاق و کردار، علوم عقلیہ و نقلیہ، موزوں طبعی و سخن سنجی میں ممتاز تھے۔ کلکتے میں کوئی بھی اہلِ علم آپ کے مرتبۂ قاضی القضاۃ پر نہ پہنچا۔ آخر عمر میں عہدۂ قضا سے مستعفی ہو کر تین سو روپے ماہوار پنشن قبول کر کے قناعت کی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ کلکتے سے وطن روانہ ہوئے۔ راستے میں بنارس کے قریب گویا عالم قدس سے یہ آواز سنی کہ اے نفسِ مطمئنہ اپنے ربّ کی طرف چل۔ ناچار اجل موعود کے تقاضے سے وطنِ اصلی کی طرف رُخ پھیرا۔ یہ واقعہ ۱۲۲۹ھ کا ہے[۱۵]۔

لیاقت اور حسنِ انتظام کی بنا پر آپ کی وفات کے بعد اعزازِ خطاب اور کل تنخواہ بطور پنشن ملی اور پھر آپ کی اہلیہ کو وہ پنشن ملتی رہی[۱۶]۔

گورنر جنرل کا تعزیتی خط

گورنر جنرل بہادر نے قاضی نجم الدین کی وفات پر ان کی اہلیہ کو تعزیتی خط لکھا۔ اس تعزیتی خط سے آپ کی وہ قدر و منزلت جو اُن کے دلوں میں تھی، مترشح ہوتی ہے۔

خط یہ ہے: ”آپ کے شوہر قاضی القضاۃ بہادر کی وفات کا صدمہ سرکار دولت مدار کمپنی کو آپ سے کم نہیں ہوا کہ جس نے ایسے اپنے متمول اور لائق شخص اور فاضل بے بدل کو گم کیا، چونکہ کارخانۂ قضا و قدر میں بجز صبر اور تسلیم کے کوئی چارہ نہیں، للہذا الیقین ہے کہ آپ بھی صبرِ جمیل اختیار کریں گی، اگرچہ آپ کے

۱۵؎ تذکرۂ صبح گلشن، نواب علی حسن خان سلیم، ص ۹۶

۱۶؎ بیاض ڈپٹی امیر حسن صدیقی کاکوروی (مخطوطہ) ص ۳۸۳

چاروں بیٹے[۱۷] اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، آپ کو اپنے بسر اوقات میں احتمال تکلیف کا نہیں، مگر سرکار نے براہِ قدردانی و نام آوری آپ کے شوہر کے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار آپ کی پنشن تا حینِ حیات مقرر کی ہے[۱۸]

تصانیف

قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاںؒ نے درج ذیل تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں:

۱۔ شرح کتاب الجنایات والجرائم فتاویٰ عالمگیری: یہ بسیط شرح انھوں نے جناب گورنر جنرل کی ایماء و فرمائش پر لکھی، تمام انگریزی عدالتوں میں جس قدر فیصلے ہوتے تھے وہ سب اسی شرح کی بنا پر ہوتے تھے۔ یہ شرح سرکار انگریزی کے حکم سے کلکتہ میں فارسی زبان میں طبع ہوئی تھی۔

۲۔ رسالۃ الستۃ الجبریہ فی الجبر والمقابلہ: اس رسالے میں اہم مسائل جبر و مقابلہ کا حل لکھا ہے اور خود ہی اس رسالے کی فارسی شرح بھی لکھی جو مع اصل متن کے کلکتہ سے طبع ہوئی۔

۳۔ رسالہ در بیان تناسب اعضائے انسانی۔

۴۔ رسالہ در بیان سعد و نحس۔

۵۔ شرح اخلاق جلالی۔

۶۔ رسالہ انساب۔

۷۔ کشکول موسوم بہ بیاض رشک ریاض: یہ غیر مطبوعہ ہے۔ سفرنامہ لندن کے مؤلف لکھتے ہیں کہ افسوس ہے یہ بیاض چھپ نہ سکی ورنہ بڑی مفید عام تالیف

---

[۱۷] چاروں بیٹے یعنی (۱) ممتاز العلما قاضی محمد سعید الدین خاں بہادر (۲) مفتی حکیم الدین خاں (۳) قاضی علیم الدین خاں (۴) مفتی خلیل الدین خاں بہادر سفیر شاہِ اودھ۔

[۱۸] یہ پنشن پابندی سے آپ کی اہلیہ کو ان کی زندگی (۱۲۴۹ھ) تک ملتی رہی۔ دیکھیے سفرنامہ لندن، ص ۳۷۲۔

ہوتی کیونکہ اس میں متعدد علوم و فنون کے بہت سے بسیط مضامین و مباحث درج ہیں۔ اس میں ان کے عربی و فارسی اشعار اور قصاید بھی مرقوم ہیں۔ اس بیاض کو پندرہ محافل پر منقسم کیا ہے۔ مثلاً محفل اوّل علم تفسیر سے متعلق اور محفل دوم علم حدیث سے متعلق ہے۔ ان تصانیف و تالیف کے علاوہ معقولات کی کتابوں پر ان کے حواشی بھی ہیں۔

عربی نثر بے تکلفی سے لکھتے تھے۔ عربی میں ان کا ایک مقالہ جو انھوں نے شاہ غلام قطب الدین الٰہ آبادی[۱۹] کی وفات پر لکھا، نواب رضا حسن خاں علوی کاکوروی (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء تا ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء) نے مطارح الاذکیاء و ہدایۃ الاحیاء (صفحہ ۷۷ تا ۸۰) پر نقل کیا ہے۔ اس مقالے سے جہاں نثر نگاری پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تاریخ گوئی میں وہ کتنا ملکہ رکھتے تھے۔

تعمیہ سے تاریخیں ایسی عمدہ تالیف کرتے تھے کہ انتہائی تعجب ہوتا۔ نمونتہً دو درج ذیل کی جاتی ہیں:۔

آپ کے شیخ طریقت حضرت کلید عرفان سیدنا شاہ باسط علی قلندر الٰہ آبادی

---

[۱۹] شاہ غلام قطب الدین الٰہ آبادی، مولانا شاہ محمد فاخر الٰہ آبادی کے بیٹے اور مولانا شاہ خوب اللہ الٰہ آبادی کے پوتے تھے۔ یکم محرم ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) کو پیدا ہوئے۔ علوم ظاہری کی تعلیم مولانا برکت اللہ الٰہ آبادی سے حاصل کی۔ اپنے والد مکرم مولانا محمد فاخر کے مرید اور خلیفہ تھے۔ مثنوی نان و قلیہ (در جواب نان و حلوہ) اور بستان الحنفیہ نیز ایک فارسی دیوان ان کی یادگار ہیں۔ حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے کہ عمرہ کر کے مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ جب مقام تنعیم پر پہنچے تو ذیقعدہ کی آخری تاریخ ۱۱۸۷ھ کو وفات پا گئے۔ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی قبر کے داہنی جانب مدفون ہوئے۔ مولانا نجم الدین نے ان پر عربی میں دردناک مقالہ لکھا اور ان کی تاریخ وفات بھی نکالی۔

اوران کی اہلیہ کا انتقال ایک ہی روز اور ایک ہی وقت ہوا۔ مولانا نجم الدین نے ناسکن انت و زوجك الجنة ابدا سے سالِ وفات ۱۱۹۶ھ نکالا۔ شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی اور ان کی اہلیہ کے مرقد پر یہی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کاکوروی ان کے برادر طریقت کی وفات ۱۲۲۱ھ میں ہوئی، جس پر انھوں نے یہ تعمیہ تاریخ نکالی۔ ھو خالد افی الجنات۔

شاعری

قاضی القضاۃ نے اپنے صاحبزادوں اور مسبوق الذکر تالیفات کے علاوہ عربی اور فارسی کلام بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کا کلام اپنے اندر شوخی، لطافت، رقت قلب، سلاست، برجستگی لیے ہوئے ہے۔

معاصر علما کے نزدیک ان کا مقام بہت بلند تھا۔

وفات

کلکتہ سے مستعفی ہو کر وطن آنے کا قصد کیا۔ چنانچہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں بیمار پڑے اور بنارس پہنچ کر یکایک ۳ ماہ ربیع الاول روز سہ شنبہ ۱۲۲۹ھ کو ۷۲ سال ۱۱ ماہ ۱۹ یوم کی عمر میں وفات پائی، چونکہ وصیت تھی کہ میری نعش منتقل نہ ہو لہٰذا وہیں باغ فاطمان میں دفن ہوئے۔[۲۰]

"تذکرہ علمائے ہند اور نزہۃ الخواطر کے مؤلفین کا ماخذ" مجمع العلما "منظور الدین خاں علوی (مخطوطہ) ہے، اسی لیے صاحب نزہۃ الخواطر نے تحریر کیا ہے:

مات یوم الثلاثاء لثلاث عشرۃ خلون من ربیع الثانی سنۃ تسع وعشرین ومائۃ والف۔[۲۱]

---

[۲۰] سفرنامہ لندن، ص ۳۷۰ — تذکرہ مشاہیر کاکوری، ص ۴۳۷۔

[۲۱] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۹۸۔

۱۳۔ ربیع الثانی بروز سہ شنبہ ۱۲۲۹ھ کو وفات پائی۔

صاحب تذکرہ علمائے ہند لکھتے ہیں:

بروز سہ شنبہ سیزدہم ربیع الثانی یک ہزار و دو صد و بست و نہ ہجری رحلت فرمود[۲۲]

۱۳۔ ربیع الثانی بروز سہ شنبہ ۱۲۲۹ھ کو وفات پائی۔

ڈپٹی امیر حسن صدیقی اپنی بیاض میں لکھتے ہیں:

قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں بہادر مغفور نہایت زبردست فاضل اور بڑے ادیب، بلیغ اور صاحب تالیفات گزرے ہیں۔ ترجمہ فارسی ہدایہ کا جو بحکم گورنمنٹ کیا گیا تھا، آپ کی مشہور و یادگار تالیف ہے۔ جب کلکتہ میں صدر عدالت قائم ہوئی آپ اودھ کے علما میں بذریعہ نواب آصف الدولہ اودھ منتخب ہو کر حسب الطلب گورنر جنرل کلکتہ بھیجے گئے۔ عہدۂ "قاضی القضاۃ" بنگال اور ممالک مغربی و شمالی پر مامور رہے اور پچیس برس تک اپنی خدمت کو نہایت اعزاز اور نیک نامی کے ساتھ انجام دیا۔ آخر عمر میں پنشن حاصل فرما کر روانہ ہوئے اور بنارس میں پہنچ کر ۳۔ ربیع الاول ۱۲۲۹ھ کو انتقال فرمایا اور مقام فاطمین میں دفن ہوئے[۲۳]

آپ کی وفات پر مختلف لوگوں نے قطعہ ہائے تاریخ کہے، جن میں سے منشی فیض بخش علوی کاکوروی مولف "تاریخ فرح بخش" اور مولوی فتح علی جون پوری کے قطعے شامل ہیں۔

اولاد

قاضی نجم الدین کے چار صاحب زادے تھے جو سب کے سب آپ کے آئینۂ کمال

۲۲؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۵

۲۳؎ بیاض، ص ۳۸۳

اور اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ کی صحیح و بیّن تصویر تھے۔ تذکرہ علمائے ہند کے مولف نے لکھا ہے کہ آپ کے تین صاحب زادے ہوئے[۲۴]، یہ درست نہیں ہے۔

ممتاز العلما قاضی محمد سعید الدین خاں بہادر

۱۱۸۰ھ ۱۷۶۶ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد قاضی القضاۃ نجم الدین خاں، ملّا عماد الدین لکنی اور مولوی فضل اللہ نیوتنی سے حاصل کی تعلیم ختم کرنے کے بعد قاضی مقرر ہوئے۔ تمام اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ بغیر آپ کے فتوے کے فوجداری مقدمات کے حکم کا نفاذ نہیں ہوتا تھا۔ اپنے علم و فضل، معاملہ فہمی، ذکاوتِ طبع کی بنا پر حکام اعلیٰ کی نظروں میں بڑی وقعت تھی۔ ۱۵۔ شعبان ۱۲۲۱ھ سال یکم جلوس کو ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی نے ممتاز العلما و خان بہادر کا خطاب دیا۔ پھر اپنی قابلیت کی بنا پر انگریزی حکومت کی جانب سے خورد سال نواب فرخ آباد کے ہاں چھ سو روپیہ ماہوار پر نائب مقرر ہوئے۔

شعر و سخن کا ذوق بڑا اعلیٰ تھا۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۲۱۔ ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) کو کاکوری میں وفات ہوئی اور اپنے مکان محلہ قاضی گڑھی کے قریب دفن ہوئے۔

مفتی حکیم الدین خاں

آپ قاضی القضاۃ کے دوسرے صاحب زادے تھے۔ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ جملہ علوم کی تکمیل اپنے والد اور ملّا عماد الدین لکنی اور مولوی فضل اللہ نیوتنی سے کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ ججی میں سررشتہ دار ہوئے۔ پھر صدر امینی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد عہدۂ صدر الصدوری سے پنشن لے کر کاکوری میں مستقل قیام کیا۔ مطالعے کا بہت شوق تھا۔ انتقال کے وقت بھی ہدایہ کی شرح فتح القدیر پاس تھی۔ ۱۰۔ جمادی الاولیٰ بروز شنبہ ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء) کو وفات پائی

---

[۲۴] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۳۵

اور اپنی والدہ کے حظیرہ واقع محلہ کھاری کنوا ں چاند محل کاکوری میں جانب مغرب دفن ہوئے[۲۵] آپ کے صاحب زادے محی الدین خاں ذوق نے تاریخ کہی:

الحق آں قبلہ دیں قدوۂ خاصانِ خدا　　زیں جہاں بار سفر بست بسوئے دارلبقا
۱۲۶۹ف ۱۸۵۳ء
کلک ما سال وفاتش بہ صد آلام نشست　　روز شنبہ دہم از شہر جمادی الاولی
۱۲۶۹ھ
سمت ۱۹۰۹ء

قاضی علیم الدین خاں

خلف سوم قاضی القضاۃ نجم الدین، اپنے عہد کے جیّد عالم تھے، کتب درسیہ کی تکمیل اپنے والد ماجد، مولانا عبدالواجد خیر آبادی، مولوی فضل اللہ نیوتنی اور ملّا عماد الدین لکھنی سے کی۔ کچھ عرصہ عدالت میں مفتی رہے، پھر قاضی مقرر ہوگئے، جس وقت قضا کا محکمہ تخفیف میں آیا تو دیانتداری، ذہانت و ذکاوت، قوت استعداد کامل اور حسن کارکردگی کے صلے میں صدر اعلیٰ مقرر ہوگئے۔ بیشتر وقت مطالعے میں صرف ہوتا تھا۔ ۱۷ ماہ ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۲ء) کو کاکوری میں وفات پائی اور اپنے بھائی مفتی حکیم الدین خاں کے پہلو میں دفن ہوئے[۲۶]

مفتی خلیل الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ

یہ قاضی نجم الدین کے چوتھے بیٹے تھے۔ ۱۲۰۳ھ/ (۹ - ۱۷۸۸ء) کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ بدو شعور ہی سے بہت ذہین وطباع تھے۔ کچھ درسی کتابیں اپنے والد ماجد سے اور متوسطات اور انتہائی کتابیں مولوی روشن علی جون پوری سے پڑھیں۔ اپنے والد کے ہمراہ کلکتے بھی رہے۔

قاضی نجم الدین نے فتاویٰ عالم گیری کی کتاب الجنایات والجرائم کی شرح گورنر جنرل کی فرمائش پر مرتب کی تو بیٹے (مفتی خلیل الدین خاں) نے ممبر کونسل مسٹر ہا کنٹن کی فرمائش پر جو قاضی نجم الدین خاں کا علوم عربیہ میں شاگرد تھا، درمختار کے باب التعزیرات کی

---

۲۵ سفر نامۂ لندن، ص ۲۷۳ — تذکرہ مشاہیر کاکوری، ص ۱۳۲

۲۶ الضاً، ص ۲۷۳ — الضاً ص ۹ - ۲۸۷

شرح فارسی میں لکھی۔ باپ بیٹے کی یہ دونوں شرحیں گورنر جنرل کے حکم سے طبع ہوئیں۔

مفتی خلیل الدین خاں کو عربی کی نثر نگاری میں بڑا ملکہ تھا۔ علوم حکمت و ریاضی اور ہیئت و فلکیات کے ماہر تھے۔ حکام اعلیٰ نے ان کو ٹھٹھور (ضلع کان پور) میں عہدۂ قضا پر متمکن کر دیا تھا۔ نہایت ذہین اور لائق تھے۔ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) کو اڑتیس سال کی عمر میں غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ تا ۱۸۲۷ء) کے عہد میں پانچ ہزار روپے ماہوار پر سلطنت اودھ کے عہدۂ سفارت سے سرفراز ہوئے۔ مفتی ممدوح نے بہت سے رفاہ عامہ کے کام کیے، تقویٰ و زہد کی نعمت سے بھی متمتع تھے۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے، ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:-

۱۔ شرح باب التعزیرات دُرِّ مختار: فارسی

۲۔ رسالہ فی تحقیق مرضِ ھیضہ: عربی

۳۔ مرآۃ الاقالیم: علم ہیئت کے قواعد سے متعلق غازی الدین حیدر کی فرمائش پر فارسی میں تحریر کی۔

۴۔ رسالہ دربیان جغرافیہ طرق وشوارع احاطہ اودھ: فارسی۔

۵۔ رسالہ طول البلد وعرض البلد وغایۃ النہار:

مفتی خلیل الدین خاں نے ۱۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) کو اٹھہتر برس کی عمر میں کاکوری میں وفات پائی اور خانقاہ کاظمیہ کے قریب اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔[۶۸]

تاریخ وفات مولوی محی الدین خاں ذوقؔ نے ان اشعار سے نکالی۔

نغاں کامروز مولانا خلیل الدین ذوقؔ آنکہ · نہادہ داغ حسرت بردل آں عمِ جلیل ما

بسال رحلتِ آں خاد منزل زد رقم کلکم · بلے گلچیں ز انوارِ جناں آمد خلیل ما

۱۲۸۱ھ

زفاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں علوی کاکوروی کے حیات وسوانح کی ترتیب وتسوید

---

۶۸ تذکرہ مشاہیر کاکوری، ص ۱۵۱

کے سلسلے میں زیادہ استفادہ جناب مسعود انور علوی کاکوروی کے مضمون سے کیا گیا ہے جو جولائی ۱۹۸۴ء کے "المعارف" (لاہور) میں شائع ہوا تھا)

۱۱۱ــــــ مولانا نصر اللہ مارہروی

مولانا نصر اللہ بن ہدایت اللہ بن محمد مارہروی فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ کنبوہ برادری سے تعلق رکھتے تھے اور حنفی المسلک تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔

نصر اللہ کی جائے ولادت "مارہرہ" (صوبہ یوپی) ہے۔ وہیں انھوں نے تربیت کی منزلیں طے کیں۔ کچھ بڑے ہوئے تو مولوی محمد باقر اور مولوی محمد نجابت مشرقی سے حصولِ علم کا آغاز کیا اور درسیات کی تکمیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید آل محمد حسینی مارہروی سے اخذِ طریقت کیا۔ سید آل محمد اپنے عہد کے بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ ۱۷۔ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ کو فوت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سید حمزہ نے باپ کی جگہ تصوف و طریقت کی مسند سنبھالی، یہ بھی تدین و تقویٰ میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ مارہرہ اور اس کے قرب و جوار میں باپ بیٹا دونوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ صاحبِ ترجمہ مولانا نصر اللہ نے پہلے تو سید آل محمد مارہروی سے اکتسابِ فیض کیا، پھر ان کی وفات کے بعد ان کے فرزندِ گرامی سید حمزہ کی صحبت اختیار کی اور عمر بھر ان سے وابستہ رہے۔ درس و افادہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کی تمام مروجہ کتابیں ذوق و شوق سے پڑھاتے تھے اور طلباء ان کے طرزِ تعلیم سے بہت متاثر تھے۔

مولانا نصر اللہ مارہروی نے ۷۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۹۵ھ کو اپنے آبائی شہر "مارہرہ" میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔[۲۸]

---

[۲۸] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۰۰

۱۱۲ــــــ مولانا نصر اللہ خورجوی

مولانا نصر اللہ خاں بن محمد عمر خویشگی خورجوی اپنے وقت کے عالم کبیر اور شیخِ کامل تھے۔ افاغنہ کے مشہور قبیلے خویشگی سے تعلق رکھتے تھے اور فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ ۱۲۲۶ھ کو خورجہ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ مولانا احمد علی عباسی چریاکوٹی اور دیگر علمائے عصر سے حصولِ علم کیا۔ حکیم منصور علی نجیب آبادی سے علم طب پڑھا اور شیخ عبدالعلیم لوہاروی سے اخذِ طریقت کیا۔ جب تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے اور کامل استعداد حاصل ہو گئی تو انگریزی حکومت سے تعرّب پیدا کیا اور ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ یہ ایک بڑا عہدہ تھا جس پر اُنھیں فائز کیا گیا۔ کافی عرصہ یہ منصب ان کے سپرد رہا۔

اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔ وہاں اُن کی نہایت پذیرائی ہوئی اور ریاست حیدر آباد کے شمالی علاقوں کے منصبِ قضا پر متمکن کیے گئے۔ بعدازاں مغربی علاقوں کے قاضی بھی انھیں مقرر کر دیا گیا۔ ریاست حیدر آباد میں ان کو بہت اعزاز حاصل ہوا اور بہت سی مراعات سے سرفراز ہوئے۔

مولانا نصر اللہ خاں خورجوی جلیل القدر عالم اور بہت سے مروّجہ علوم و فنون میں ماہر تھے اور سرکاری ذمہ داریوں کے باوجود درس و افادہ میں انتہائی دلچسپی رکھتے تھے، ان سے علما و طلبا کی کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔

ان میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے جو تحریری خدمت انجام دی، وہ مندرجہ تحت کتابوں کی صورت میں محفوظ ہے:

۱۔ ارشاد البلید فی اثبات التقلید۔

۲۔ شرح خلاصہ کیدانی: یہ مسائل فقہ میں ہے اور فارسی میں ہے۔

۳۔ شرح رباعیات یوسفی: یہ علم طب کے بارے میں ہے۔

۴۔ تاریخ دکن۔

علاوہ ازیں اور بھی کئی کتب و رسائل ان سے یادگار رہیں۔
اس عالم کبیر اور فقیہ نامدار نے ۱۲۹۹ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔[29]

۱۱۳۔۔۔سیّد نصیر الدین حسینی۔ برہان پوری

ہندوستان کا شہر برہان پور کسی زمانے میں علم کا گہوارہ اور علما کا مرکز تھا۔ ان کے تراجم فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں متعدد مقامات پر بیان ہو چکے ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری کے برہان پوری علما و فقہا میں ایک بزرگ سید نصیر الدین گزرے ہیں جن کا لقب عبید اللہ تھا۔ یہ سیّد جلال الدین حسینی برہان پوری کے بیٹے تھے جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے اور اپنے علاقے کے علمائے اکابر میں گردانے جاتے تھے۔ نہایت زاہد و عارف شخص تھے اور "اللہ والے صاحب" کے عرف سے معروف تھے۔

سیّد نصیر الدین حسینی برہان پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو اپنے والدِ گرامی سیّد جلال الدین حسینی کے حلقۂ درس میں شمولیت کی اور علوم مروجہ اور فنونِ متداولہ سے بہرہ مند ہوئے۔ والد کے علاوہ بعض دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کیا اور فقہ و حدیث اور دوسرے علوم میں مہارت حاصل کی۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے اور فروعی اختلافی مسائل میں نہایت متشدد تھے۔ اس زمانے میں "وہابیت" کا بہت چرچا تھا اور انگریزی حکومت نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر "وہابی" اور "باغی" کو مترادف قرار دے دیا تھا۔ جس کو وہابی کہا جاتا، اسے انگریز کا مخالف اور باغی سمجھ لیا جاتا تھا۔ بہت سے علمائے وقت بھی وہابیوں کے مخالف ہو گئے تھے اور ان کے فقہی اور مسلکی رجحانات کو شدّت سے ہدفِ تنقید ٹھہرانے لگے تھے۔ سیّد نصیر الدین برہان پوری کا شمار بھی انہی حضراتِ علما میں ہوتا تھا جو تحریر و تقریر میں

---

[29] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۳۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۰۰، ۵۰۱

وہابیت کی سخت الفاظ میں مخالفت کرتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے نامور فقیہ اور ممتاز عالم تھے۔

سید نصیر الدین تصنیف و تالیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں:

۱۔ ذریعۃ الاستشفاع فی سیر سید المطاع۔
۲۔ الصائقۃ الرابیہ علیٰ فرقۃ الوہابیۃ الکذابیہ۔
۳۔ روضۃ الریحان فی فضائل رمضان۔
۴۔ مستوفی الحقوق فی ذم العقوق۔
۵۔ ایضاع الارتداد۔
۶۔ ساطع الانوار من کلام سید الابرار۔
۷۔ التیسیر فی مہمات التفسیر۔
۸۔ برہان الہدیٰ فی تفسیر الرحمٰن علی العرش استویٰ۔
۹۔ لباب النفائح فی احکام الذبائح۔
۱۰۔ البراہین الساطعہ فی اثبات مذہب اہل السنۃ اللامعہ۔
۱۱۔ تنبیہ الاغنیاء فی فضائل سید الاصفیاء۔
۱۲۔ کشف المعضلات فی ذکر نساء المحرمات۔
۱۳۔ ترغیب المجاہدین وترغیم المعاندین۔
۱۴۔ ہل من مزید فی جواز اللعن علیٰ یزید۔
۱۵۔ المبکیات فی اخبار الشہداء بالطف۔
۱۶۔ لطائف التہذیب۔
۱۷۔ معیار الافراس۔
۱۸۔ شعب الایمان۔
۱۹۔ رسالہ فی تعداد الآیات والحروف والسور والسجدات فی القرآن الکریم۔

۲۰۔ رسالہ عالیہ۔

۲۱۔ تکملۃ منافع المسلمین۔

آخر عمر میں حرمین شریفین گئے۔ مدینہ منورہ پہنچے تو وفات پا گئے۔ یہ ۱۵۔ محرم ۱۲۹۳ھ کا واقعہ ہے۔

تذکرہ علمائے ہند میں مرقوم ہے کہ ۱۲۹۲ھ کو برہان پور میں انتقال ہوا[30]۔

۱۱۴۔ سیّد نصیر الدین دہلوی

جو علمائے کرام اور فقہائے عظام امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جماعتِ مجاہدین سے وابستہ ہوئے اور باقاعدہ میدانِ جہاد میں نکلے ان میں مولانا سیّد نصیر الدین دہلوی متعدد وجوہ سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ ددھیال کی طرف سے حضرت سیّد ناصر الدین حسینی سونی پتی کی اولاد سے تھے اور ننھیال کی جانب سے حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے نواسے تھے۔ آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی اور وہیں پلے بڑھے۔

ابتدا میں تحصیل علم سے بے اعتنائی

ان کے حالات میں یہ عجیب بات مرقوم ہے کہ دہلی میں اپنے ننھیال میں پرورش پائی اور وہیں تربیت کی منزلیں طے کیں، جہاں علم کے دریا بہہ رہے تھے فضیلت کے چشمے اُبل رہے تھے اور ہندوستان کے طول و عرض سے آ آ کر لوگ اس سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ لیکن نصیر الدین کو اپنی عمر کے دورِ اوّل میں اس سے دلچسپی نہ تھی اور حصولِ علم کی طرف اعتنا نہ تھا۔ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کا غلغلۂ درس بلند تھا اور بے شمار علما و طلبا ان سے تحصیل علم میں مشغول تھے، مگر نصیر الدین اس دولت سے بے بہرہ تھے۔ اسی اثنا میں والدہ نے شاہ محمد اسحاق سے ان کی صاحب زادی

---

[30] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۹، ۲۴۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۰۲۔

کے رشتے کے لیے درخواست کی مگر علوم مروّجہ سے عدم التفات کی بنا پر درخواست منظور نہ ہوئی۔

حصولِ علم کا شوق

درخواست کی عدم منظوری نے نصیر الدین کے قلب و ضمیر کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ انتہائی ذوق و شوق سے تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے۔ پھر اس قدر محنت و توجہ سے پڑھنا شروع کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں حدیث و فقہ اور دیگر علوم و فنون کی تمام کتابیں ختم کر لیں اور اپنے عہد کے جلیل القدر علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔

حصولِ علم کی غرض سے وہ پورب کے متعدد شہروں میں گئے اور وہاں کے مشاہیر اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ کلکتے کا عزم بھی کیا اور وہاں کے بعض نامور علما سے تحصیل کی۔ جس زمانے میں سیّد احمد شہید قصدِ حج کے لیے کلکتے تشریف لے گئے تھے۔ سیّد نصیر الدین اس زمانے میں وہیں تھے اور طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے۔

جب فارغ التحصیل ہو گئے اور علوم متداولہ میں کمال حاصل کر لیا تو شاہ محمد اسحاق نے اپنی صاحب زادی کا نکاح ان سے کر دیا ـــــ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ ۱۲۴۰ھ میں شاہ اسحاق وعظ فرماتے اور جہاد کے لیے چندے کی اپیل کرتے تو سید نصیر الدین مدرسے کے دروازے میں کھڑے ہو کر مجاہدین کے لیے فراہمیٔ زر اعانت کی خدمت انجام دیتے تھے ـــــ اس کے بعد حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ جہاد کے لیے انھوں نے خود ہی سرحد پار جانے کا عزم کر لیا۔

مجاہدین کی تنظیم

سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے واقعہ شہادت کے بعد مجاہدین پر کئی عجیب و غریب دور آئے اور ان کے سر رشتۂ نظم کے ٹوٹ جانے کا خطرہ بھی پیدا ہوا، لیکن قدرتِ الٰہی سے پھر ایسے حالات اُبھر آتے جن سے خطرات کے بادل چھٹ جاتے اور مایوسی کی فضا ختم ہو جاتی۔ لیکن اب معاملہ بالکل دگرگوں ہو گیا تھا اور اس پر عظمت

جماعت کا محض ایک ہلکا سا نشان باقی رہ گیا تھا ــــ حالات نہایت تکلیف دہ اور انتہائی مایوس کن تھے ــــ یاس و قنوط اور چاروں طرف پھیلی ہوئی افسردگی کے اس عالم میں صاحبِ ترجمہ مولانا سید نصیر الدین دہلوی کا جوش و جذبہ حرکت میں آیا اور انھوں نے کمرہمت باندھی اور امیر المجاہدین سید احمد شہید کی طرح ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ لوگوں کو اپنے اندازِ خاص سے دعوتِ جہاد دی اور تھوڑی مدت میں ایک ایسی جماعت تیار کرلی جس کے تمام ارکان اس بنیادی فرض کی انجام دہی کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے پر آمادہ رہتے۔

اختلاف سے نفرت

احیائے دین، ردِ بدعات، دعوتِ اسلام اور اشاعتِ توحید ان کی زندگی کا اصل مقصد تھا۔ چھوٹے چھوٹے مسائل و معاملات کے متعلق مسلمانوں میں جھگڑے اور نزاع کی جو صورت پیدا ہو جاتی ہے، اس سے انھیں شدید نفرت تھی۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمان اپنے باہمی اختلافات ختم کردیں اور اسلام کے اصول و اساسیات پر کامل طور سے متحد ہو جائیں ــــ ایک مرتبہ اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی کہ کسی نے کہا، مذہبی معاملات میں اختلاف کوئی نئی بات نہیں ہے، صحابہ کے زمانے میں بھی اختلاف موجود تھا ــــ سید نصیر الدین نے اس کا نہایت شاندار جواب دیا۔ فرمایا ہمیں اکابر کی لغزشوں پر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلاشبہ صحابہ میں بہ تقاضائے بشریت اختلاف کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ہمیں ان کے مکارم و محاسن کی پیروی کرنی چاہیے۔ ان کے اختلافات کو تلاش کرنا اور پھر ان کو بنیاد بنا کر اپنے لیے اختلاف کی گنجائش پیدا کرنا ہمارا کام نہیں ہونا چاہیے۔

امیر دوست محمد خاں سے تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ

سید نصیر الدین عالی ہمت آدمی تھے، وہ بہت بلند مقاصد رکھتے تھے، دوررس نگاہ کے مالک، نہایت مستعد اور صاف ذہن تھے۔ طبیعت میں سلجھاؤ اور سوچ بچار کے پیمانوں میں بڑی وسعت تھی۔ پرانے جھگڑوں میں الجھ کر وقت ضائع کرنا اور

احوال وظروف سے چشم پوشی کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا انھیں معلوم تھا کہ آزاد قبائل کس فطرت کے مالک ہیں اور ان کے کن کن سرداروں نے سید احمد شہید کے زمانے میں کیا کردار ادا کیا تھا۔ وہ پرانی رنجشوں کو بھلا دینا چاہتے تھے اور نئے حالات کی روشنی میں آگے قدم بڑھانے کے خواہاں تھے۔

بعض وجوہ سے والیٔ افغانستان دوست محمد خاں بھی مجاہدین کی حمایت اور ہمدردی سے دست کش ہو گیا تھا۔ لیکن اب وقت نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ سیّد نصیر الدین اس سے مراسم پیدا کرنے اور تعلقات استوار کرنے کے متمنی تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ امیر دوست محمد خاں ایک طرف سکھوں سے برسرِ پیکار تھا تو دوسری طرف انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا، اور یہ دونوں طاقتیں مجاہدین کی حریف تھیں اور انہی سے ان کا مقابلہ تھا۔ یعنی جو کام دوست محمد خاں کر رہا تھا، وہی مجاہدین کا نقطۂ نظر تھا۔ اس لیے سیّد نصیر الدین کی شدید خواہش تھی کہ موجودہ حالات میں امیر دوست محمد خاں سے حلیفانہ اور دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں تاکہ دونوں کے مشترکہ دشمنوں اور حریفوں کا باہمی تعاون سے مقابلہ کیا جا سکے۔

جب سیّد نصیر الدین یہ منصوبہ بنا رہے تھے اس زمانے میں وہ دہلی میں تھے اور زیادہ تر دہلی کی اکبری مسجد میں ان کے شب و روز گزرتے تھے۔ یہ وہ مسجد ہے جس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزندانِ گرامی شاہ عبد القادر محدث اور شاہ رفیع الدین محدث کے درس و تدریس کے سلسلے جاری رہے تھے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید نے تنظیم جہاد کا کام اسی مسجد میں بیٹھ کر شروع کیا تھا۔

سیّد نصیر الدین نے بھی اسی مسجد میں بیٹھ کر اپنے رفقائے خاص سے مشورے کیے اور امیر دوست محمد خاں کے پاس سفارت بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے تمام انتظامات مکمل کر لیے اور ابو احمد علی اور سید ابراہیم سواتی کے نام اس سفارت کے لیے تجویز ہوئے لیکن اچانک بعض ایسے ناخوش گوار واقعات پیش آ گئے کہ اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا، اور امیر دوست محمد خاں کے پاس سفارت نہ بھیجی جا سکی۔ اگرچہ اس وقت سفارت

کی تجویز معرضِ عمل میں نہ آسکی، تاہم یہ واقعہ ہے کہ سید نصیر الدین میدانِ جہاد میں اُتر آنے کے بعد امیر دوست محمد خاں کی دفاعی کوششوں میں ہمیشہ اس کے معاون و مددگار رہے۔[۱۳۱]

قصدِ ہجرت

جیسا کہ پہلے گزر چکا، سید نصیر الدین نہایت باہمت اور عزم و ارادے کے پکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے آزاد علاقے میں جانے اور وہاں از سرِ نو سلسلۂ جہاد شروع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ ملک کے ان حصوں میں دورے کیے جائیں جہاں زیادہ تبلیغِ جہاد نہیں ہو سکی تھی، وہاں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جہاد کے لیے آمادہ کیا جائے۔ لیکن یہ وقت طلب کام تھا اور اس میں بہت تاخیر کا اندیشہ تھا، لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ جو کام جس قدر جلدی ہو سکتا ہے، کیا جائے اور تاخیر سے بچا جائے۔ پھر یہ بات بھی ان کے پیشِ نظر تھی کہ پہلے سے جو بعض ممتاز نقیب مختلف علاقوں میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان کی مساعیِ مخلصانہ سے بھی لوگ متاثر ہوں گے اور میدانِ جہاد میں پہنچیں گے۔ مثلاً مولانا ولایت علی عظیم آبادی حیدر آباد (دکن) میں، مولانا عنایت علی مشرقی بنگال میں، مولانا سید محمد علی رام پوری مدراس میں اور مولانا سید اولاد حسن قنوجی اپنے علاقے میں مشغولِ دعوتِ جہاد ہیں اور ان کی کوشش سے مجاہدین کی آمد کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں قائم رہے گا، اور بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ یہ سلسلہ قائم رہا۔

والدہ سے اجازت

سید نصیر الدین کی والدۂ مکرمہ زندہ تھیں، سفرِ جہاد سے قبل ان سے اجازت لینا ضروری تھا۔ والدہ کی تمنا تھی کہ کسی دن ماہِ رمضان میں دہلی کی جامع مسجد (یعنی شاہ جہانی مسجد) میں جا کر نماز ادا کی جائے۔ سعادت مند بیٹے نے رمضان ۱۲۵۰ھ (جنوری ۱۸۳۵ء) میں

---

[۱۳۱] سرگزشتِ مجاہدین، ص ۱۳۷

ایک رات نماز تراویح کے بعد والدہ کو ساتھ لیا اور جامع مسجد گئے۔ اُنھوں نے نہایت اطمینان سے نماز پڑھی اور کافی دیر مسجد میں رہیں۔ دُعا کی اور بہت خوش ہوئیں۔ اسی دوران بیٹے نے ماں سے عرض کیا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے :

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ - (آل عمران : ۹۲)

یعنی تم اس وقت تک نیکی کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ جو چیز تمھیں پیاری ہے، وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

یہ آیت پڑھ کر عرض کیا کہ آپ کو میرے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہے۔ میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس کارِ خیر کے لیے مجھے اجازت دیں اور ہماری جُدائی پر صبر و شکیب سے کام لیں ___ یہ الفاظ سنتے ہی بلند بخت ماں نے نہایت خوشی سے بیٹے کو جہاد پر جانے کی اجازت دے دی اور یہ مشکل مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا۔

لمبا سفر اور نہایت مختصر سامان

والدہ کی اجازت کے بعد سفر کی تیاری شروع کر دی۔ وہ بہت لمبے سفر پر جا رہے تھے، مگر سامانِ سفر اتنا مختصر کہ اسے طوالتِ سفر سے کوئی ادنیٰ نسبت بھی نہ تھی۔ ایک چھوٹا سا بستر، چند برتن اور ایک کپڑوں کی جوڑی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں :

(۱) قرآن مجید (۲) تفسیر جلالین (۳) سنن ابی داؤد (۴) مشکوٰۃ (۵) حبل المتین اور (۶) حجۃ اللہ البالغہ میں سے کتاب الاحسان [۳۲]

یہ تھا اس جیّد عالم، ممتاز فقیہ، نامور غازی اور مجاہد کا کُل سامانِ سفر۔

تاریخ روانگی

حادثہ بالاکوٹ سے چار سال بعد، مجاہدین کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ

---

[۳۲] سرگزشتِ مجاہدین، ص ۱۳۹

۳ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ (۲ اپریل ۱۸۳۵ء) کو گھر سے نکلے اور دہلی سے چار میل کے فاصلے پر "عرب سرائے" میں پہلا پڑاؤ کیا۔ وہاں تین دن اقامت گزیں رہے۔ ۶ ذی الحجہ کو وہاں سے چلے اور قطب صاحب میں "حوض شمسی" کے کنارے "مسجد اولیا" کے متصل قیام کیا۔ ۷ ذی الحجہ کو مسجد اولیا سے روانہ ہوئے اور راستے میں تھوڑا بہت قیام کرتے ہوئے ریواڑی جا پہنچے، وہاں ایک باغ میں ٹھہرے اور عید اضحیٰ کی نماز ادا کی۔ ۱۵ ذی الحجہ کو ریواڑی سے جے پور کا عزم کیا۔ وہاں ابھی پہنچے نہ تھے کہ راستے میں ایک مجاہد سید اسحاق وفات پا گئے اور ان کی میت کو جے پور کے قریب واصل خاں کے باغ میں لے جایا گیا۔ تجہیز و تکفین کے بعد نماز جنازہ سید نصیر الدین نے پڑھائی اور اس موقع پر نہایت پُراثر تقریر کی۔

گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور راجپوتانے کا انتہائی تکلیف دہ سفر درپیش تھا۔ وہ اس علاقے کے مختلف مقامات ٹونک، اجمیر، جودھ پور اور جیسلمیر سے ہوتے اور قیام کرتے ہوئے سندھ پہنچ گئے۔ راستے کی تفصیلات بہ درجۂ غایت عجیب و غریب ہیں، جنھیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

پیر کوٹ میں قیام

سندھ میں انھوں نے جس مقام پر قیام کیا، اس کا نام "پیر کوٹ" ہے۔ یہ وہی پیر کوٹ ہے جسے "پیر جو گوٹھ" کہا جاتا ہے۔ یہ عرصۂ دراز سے راشدی سادات کے اس خاندان کا مرکز ہے جو "پیر پگاڑو" کے لقب سے مشہور ہے اور روہڑی سے سولہ سترہ میل جنوب میں اور خیر پور سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پہلا اور اصل پیر کوٹ دریائے سندھ کی خوف ناک لہروں کی زد میں آ کر تباہ ہو گیا تھا۔ پھر اس مقام سے پانچ چھ میل دور مشرق میں موجودہ پیر کوٹ آباد کیا گیا۔

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں پیر صبغت اللہ شاہ راشدی پیر کوٹ کی مسندِ رشد و ہدایت پر متمکن تھے جو نہایت متورع اور متقی بزرگ تھے۔ سید احمد شہید ان کے ہاں پہنچے تو انھوں نے سید صاحب سے پورے تعاون کا عہد کیا اور پھر اس

عہد کو نبھانے میں ہمیشہ مستعد اور سرگرم رہے۔ سید صاحب کی شہادت سے چار سال بعد ان کا انتقال ہوا۔

حُرّوں کی تحریک

پیر صبغت اللہ شاہ راشدی نے اپنے ارادت مندوں اور عقیدت کیشوں میں جہاد کا جذبہ پیدا کرنے کی از حد کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے۔ وہ متبع سنّت بزرگ تھے اور غیر شرعی رسوم و رواج کے شدید مخالف تھے۔ یہاں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ وہ مسند نشین ہوئے تو ان کے بعض قرابت دار مخالفت پر اُتر آئے اور اُن پر قاتلانہ حملے کیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اصحابِ ارادت نے مرشد کی حفاظت و مدافعت کے لیے ایک تنظیم قائم کی جو "حُرّوں کی جماعت" کے نام شہرت پذیر ہوئی۔

پیر صاحب ممدوح نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ حُرّوں کے اس نظام کو اس طرح پھیلایا اور وسیع کیا جائے کہ علاقۂ سندھ اجنبی اقتدار اور غیر ملکی طاقت کے تسلّط سے قطعی طور پر محفوظ ہو جائے اور پھر اس نواح میں خالص اسلامی نظام کے لیے جد وجہد کی جائے۔ سیّد احمد شہید جب جہاد کے لیے سرحد جاتے ہوئے سندھ پہنچے تو پیر صبغت اللہ سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی اور اشتراکِ مقاصد کی بنا پر پیر صاحب نے سیّد صاحب سے کامل تعاون کا فیصلہ کر لیا، لیکن قدرتِ الٰہی کے فیصلے کچھ اور تھے۔

سیّد احمد شہید اور پیر صبغت اللہ کے درمیان جو گفت وشنید ہوئی، اس سے سیّد صاحب اس درجے اثر پذیر ہوئے کہ اپنے اہل وعیال کے قیام وسکونت کے لیے پیر کوٹ ہی کا انتخاب فرمایا۔ حالانکہ اس سے قبل والیٔ ٹونک نواب امیر خاں اور بعض امیرانِ سندھ بھی اپنے ہاں ان کے قیام کے لیے مناسب انتظام کرنے پر بدل وجان آمادہ تھے، لیکن سیّد صاحب کے قلب و ذہن پر پیر صاحب کے دینی جذبات و عواطف کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ انھوں نے اسی مقام کو ترجیح دی۔ واقعۂ بالاکوٹ کے

بعد بھی کئی سال ان کے اہل و عیال پیرکوٹ میں مقیم رہے ــــ یہی وجہ تھی کہ سید نصیر الدین دہلوی نے سندھ میں پیرکوٹ کو اپنی پہلی منزل قرار دیا۔

پیرکوٹ کا کتب خانہ

اس زمانے میں پیرکوٹ کا کتب خانہ جو پیر صبغت اللہ شاہ کی تحویل میں تھا، نہایت نادر و نایاب کتابوں پر مشتمل تھا۔ افسوس ہے پیر صبغت اللہ ثانی کی گرفتاری اور سزائے موت کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں اس کو شدید نقصان پہنچا۔ سید نصیر الدین دہلوی نے یہ کتب خانہ دیکھا تھا۔ ان کے بقول اس کتب خانے میں قرآنِ مجید کا ایک ایسا مترجم نسخہ تھا، جس کے حاشیے پر چار تفسیریں تمام و کمال درج تھیں۔ اوّل تفسیر نیشاپوری، دوم بیضاوی، سوم مدارک، چہارم کشاف ــــ!

علاوہ ازیں تفسیر کشاف، تفسیر کبیر، تفسیر نیشاپوری، تفسیر مقدسی، تفسیر قرطبی، تفسیر قشیری، درِّ منثور وغیرہ بہت سی تفسیریں الگ الگ اس کتب خانے کی زینت تھیں۔

کتبِ حدیث میں صحاح ستہ کے علاوہ مشکوٰۃ، سننِ بیہقی، روضۃ الصالحین اس میں محفوظ تھیں۔

شروحِ حدیث میں سے فتح الباری، قسطلانی، عینی اور کرمانی سے یہ کتب خانہ مزیّن تھا۔

ذخیرۂ فقہ میں سے زیلعی مکمل، بحر الرائق، فتح القدیر، حموی شرح الاشباہ والنظائر موجود تھیں۔

یہ وہ کتابیں تھیں جو صرف مذہبیات سے متعلق تھیں۔ تاریخ و سوانح اور ادب و شعر کی بھی بہت سی کتابیں پائی جاتی تھیں ــــ فارسی دیوانوں کے اس میں تقریباً ایک سو مطلّا نسخے تھے۔ مختلف تفسیروں کی پینسٹھ جلدیں تھیں۔ "شاہنامہ" کے پانچ نسخے نہایت عمدہ تصویروں سے مزیّن تھے۔ احیاء علوم الدین اور فتوحاتِ مکیہ کے کئی کئی نسخے موجود تھے۔[۳۳]

---

[۳۳] سرگزشتِ مجاہدین۔ ص ۱۶۱۔

بعد میں سندھ کا یہ راشدی خاندان اختلافِ مسالک کی بنا پر دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ایک کو "پیر پگاڑو" کے نام سے موسوم کیا گیا اور ایک کو "پیر جھنڈا" کے نام سے ــــ! پیرآف جھنڈا کے دو کتب خانے سندھ کے بہت بڑے کتب خانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ایک پیر محب اللہ راشدی کا کتب خانہ اور ایک ان کے چھوٹے بھائی پیر بدیع الدین راشدی کا ــــ! ان دونوں کتب خانوں میں مخطوطات بھی کثیر تعداد میں ہیں اور مطبوعہ کتابیں بھی۔یہ دونوں بھائی خود بھی جلیل القدر عالم ہیں اور علما کے انتہائی قدر دان بھی ــــ اہل علم بتاتے ہیں کہ ان کے کتب خانوں میں ہر موضوع کی کتابیں موجود ہیں ــــ ان سطور کا راقم اکتوبر ۱۹۸۱ء میں وہاں گیا تھا۔فقط ان حضرات سے ملنا اور ان کے کتب خانے دیکھنا مقصود تھا۔ پہلے نیوسعید آباد گیا جہاں پیر بدیع الدین اقامت گزیں ہیں، معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد تشریف لے گئے ہیں، وہاں سے کراچی جائیں گے اور کئی دن بعد واپسی ہوگی ــــ وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ان کے بڑے بھائی پیر محب اللہ صاحب کے ہاں پہنچا۔وہ بھی موجود نہ تھے اور واپسی کا بھی ایک دو دن میں امکان نہ تھا ــ سخت ذہنی کوفت ہوئی اور میں کسی کو کچھ بتائے اور رُکے بغیر واپس لاہور آگیا۔

سلسلۂ دعوت و تبلیغ

سندھ کے موضع کھڑہ کے پیر بھی اس زمانے میں مشہور تھے، جن میں مخدوم عبدالخالق کو بالخصوص اس نواح میں قدر و منزلت حاصل تھی۔اسی طرح کھڑہ سے صرف ایک کوس کے فاصلے پر موضع گمبٹ تھا، وہاں کے سیّد ابراہیم شاہ کی بڑی شہرت تھی، یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد سے تھے۔سیّد نصیر الدین کے ان دونوں سے مخلصانہ مراسم قائم ہو گئے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی بہت تکریم کرتے تھے ــــ سیّد نصیر الدین کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ سلسلۂ دعوت و تبلیغ میں ہر وقت سرگرم رہتے اور خلافِ سنّت کوئی بات برداشت نہ کرتے۔مخاطب

اگرچہ کتنا بڑا آدمی ہوتا اس کی انھیں ذرہ پروانہ ہوتی اور دلائلِ شرعیہ سے اپنی بات اس کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے۔ اس سلسلے کے بہت سے واقعات میں دو واقعے ملاحظہ ہوں :۔

خود فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ مخدوم عبدالخالق کے ہاں گئے، دیکھا کہ عام لوگوں کی طرح نیز ذکر و شغل میں انہماک کے باعث مخدوم صاحب نماز تاخیر سے پڑھتے ہیں۔ یہ بات انھیں ناگوار گزری اور مشکوٰۃ کی احادیث اور فقہ کی دُرِّ مختار کی روایات ان کے سامنے پیش کیں اور کہا کہ نماز اوّل وقت میں پڑھنی چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ مخدوم صاحب نے ان کی بات مان لی اور نمازیں تاخیر ترک کر دی۔

سیّد ابراہیم شاہ، ختم قادریہ میں ایک تسبیح "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للّٰہ" کی بھی پڑھتے تھے۔ سیّد نصیر الدین نے ان کے خلیفوں کو جو اچھے خاصے عالم تھے، ایسے دلنشین طریقے سے مسئلہ سمجھایا کہ انھوں نے اس کے ممنوع ہونے کا اقرار کر لیا۔۔۔۔۔ علاوہ ازیں سیّد ابراہیم شاہ نماز بھی تاخیر سے پڑھتے تھے، مخدوم عبدالخالق کی طرح اُنھیں بھی اوّل وقت میں نماز ادا کرنے کی تاکید کی اور اس کی فضیلت بیان کی۔ وہ یہ بات بھی مان گئے اور اوّل وقت میں نماز پڑھنے لگے۔

سندھ کے لوگ بہت نیک طینت اور صحیح فطرت تھے۔ قرآن و حدیث کی رُو سے کوئی مسئلہ بیان کیا جاتا تو فوراً مان لیتے اور اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے۔ اس ضمن میں سندھی عوام کی نفسیات اور وہاں کے پیروں کے طرزِ عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے سیّد نصیر الدین لکھتے ہیں :۔

مردمانِ ایں جا بسیار سلیم الطبع اند و ہرگز ہرگز مقابلۂ شریعت نمی کنند، گو کسے مخالفِ طبیعت ایشاں بگوید، مگر مردانِ حق گو ایں جا نیستند و پیرانِ ایں جا را جز اہتمامِ گرفتنِ بیعت مطلبے دیگر نیست۔ بعضے از پیراں حمیّتِ اسلامی ہم دارند، مگر اہتمام در امر بالمعروف نمی کنند۔[۳۴]

---

[۳۴] اخبار مولوی سید نصیر الدین (مخطوطہ) ص ۱۱۔

"یہاں کے لوگ بہت سلیم الطبع ہیں، شریعت کی مخالفت قطعاً نہیں کرتے، اگرچہ کوئی شخص ان کی مرضی کے خلاف بات کہے — البتہ یہاں حق گو آدمی نہیں ہیں۔ یہاں کے پیروں کو بیعت لینے کے سوا کوئی غرض نہیں۔ بے شک بعض پیروں میں حمیتِ اسلامی بھی ہے مگر وہ امر بالمعروف کا اہتمام نہیں کرتے۔"

سیّد نصیر الدین سندھ کے بہت سے مقامات میں گئے اور وہاں کے مختلف میروں اور پیروں سے ملے۔ رانی پور، ہالہ، مٹاری، نوشہرو، خیرپور، حیدرآباد وغیرہ متعدد بلاد و قصبات اور دیہات کے چکّر لگائے اور وہاں کے بڑے لوگوں سے ملاقات کی۔ وہ دراصل سندھ کے کسی علاقے میں بیٹھ کر سکھوں سے جہاد کرنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی اور وہ آہستہ آہستہ سندھ کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ بھی سندھ کے امیروں اور حاکموں نے کچھ معاہدے کر رکھے تھے جو مستقبل میں ان کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئے۔ سیّد نصیر الدین کا ارادہ یہ تھا کہ سندھ کے والی، حکمران، پیر اور سرکردہ لوگ ان کے ساتھ تعاون کریں تو مسلمانوں کی مخالف طاقتوں — انگریزوں اور سکھوں — سے جہاد کیا جائے اور ان کے قدم سندھ کی طرف بڑھنے سے روکے جائیں — لیکن سعیِ بسیار کے باوجود وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مزاریوں کے علاقے میں

سیّد نصیر الدین اور اُن کے ساتھی فقط جہاد فی سبیل اللہ کا عزم لے کر گھر سے نکلے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی اور حکمران رنجیت سنگھ تھا جو سندھ پر بھی نظریں جمائے ہوئے تھا۔ انگریز ہندوستان پر عملاً قابض ہو چکے تھے اور انھوں نے رنجیت سنگھ کے ساتھ کچھ معاہدے کر رکھے تھے، وہ بھی سندھ پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ مزاری قبیلے کے لوگ سکھوں کے بھی شدید مخالف تھے اور انگریزوں کے بھی — سیّد احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید نے چونکہ سکھوں سے لڑتے ہوئے درجۂ شہادت پایا تھا اور بالاکوٹ میں اُن کے اور بھی بہت سے ساتھی شہید ہو چکے

تھے، اس لیے قدرتی طور پر مجاہدین کو سکھوں سے نفرت تھی۔ انگریز سکھوں کے حامی تھے، اس بنا پر وہ ان کے بھی دشمن تھے۔ ان حالات میں انھوں نے مزاریوں کی طرف دستِ تعاون بڑھایا جو کہ ان کے دونوں دشمنوں ــــــ سکھوں اور انگریزوں ــــ کے مخالف تھے ــــــ مزاریوں نے بھی ان کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور اشتراکِ مقاصد نے مزاریوں اور مجاہدین کو اتحاد کی سلک میں پرو دیا ــــ

مزاریوں کا علاقہ خیر پور (سندھ) کے حدود سے متصل ضلع ڈیرہ غازی خاں کے جنوبی حصے پر محیط ہے، جہاں سید نصیر الدین اور ان کے رفقا نے قیام کیا۔

یہاں ایک لطیفہ بھی سنتے جائیے۔ سیّد نصیر الدین دہلوی اور وہ مجاہدین جو دہلی اور ہندوستان کے بعض علاقوں سے ہجرت کر کے بغرض جہاد یہاں آئے تھے، وہ پکے موحد اور متبعینِ کتاب وسنّت تھے، غیر شرعی رسوم سے انھیں سخت نفرت تھی، بدعات و محدثات کے شدید مخالف تھے اور امورِ شرکیہ سے کوسوں دُور بھاگتے تھے۔ یہ لوگ "وہابی" مشہور تھے اور ان کی تحریک کو "تحریک وہابی" کہا جاتا تھا۔ سیّد نصیر الدین کو تو معلوم تھا کہ "مزاری" ایک قبیلے کا نام ہے، لیکن ان کے جن رفقا کو اس کا علم نہ تھا، وہ لفظ "مزاری" پر بدکے، انھیں شبہ ہوا کہ یہ قبر پرست اور مزاروں کو پُوجنے والے لوگ ہیں، ان سے رسم و راہ کیوں پیدا کی جائے۔ پھر جب ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو پتا چلا کہ سید نصیر الدین نے مزاریوں کے ہاں سکونت اختیار کر لی ہے تو انھیں بھی اس سے پریشانی ہوئی ــــ سیّد نصیر الدین کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے رفقا کی غلط فہمی بھی دُور کی اور ہندوستان کے حضرات کو بھی خطوط کے ذریعے اصل معاملے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ مزاری ایک قوم کا نام ہے، مزار پرستی سے اسے کوئی تعلق نہیں، یہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ زبان کے پکّے اور عہد کے سچے ہیں۔ ایک خط میں جو ہندوستان کے ایک شخص کے نام بھیجا، لکھتے ہیں کہ کرم خاں مزاری نے اقرار نامہ لکھ کر دے دیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ پورا تعاون کریں گے اور شریک جہاد ہوں گے۔ یہ خط فارسی میں ہے۔ اس میں مزاریوں کے عہد و پیمان

کے بارے میں سید نصیر الدین لکھتے ہیں:-

ہر کہ در خانۂ ایشاں برود تا جان در تنِ ایشاں ہست، رفاقتِ او می کنند و راسخ العہد و صادق المیثاق بودنِ ایشاں مشہور است۔ چنانچہ بعضے اقوامِ ایشاں درمیان خود دشمنی دارند و جنگ درمیانِ خود می کنند۔ ہر گاہ کہ وعدہ کنند کہ دو سال صلح ہست، ہرگز درمیانِ خود غدر نمی کنند[۳۵]

یعنی جو شخص ان کے گھر چلا جائے، جب تک جان بدن میں رہے، یہ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کا وعدے پر قائم رہنا اور باوفا ہونا مشہور ہے۔ چنانچہ ان کے مختلف گروہوں میں آپس کی دشمنی کی وجہ سے لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، مگر جب عہد کر لیتے ہیں کہ (مثلاً) دو سال کے لیے صلح ہے تو اس کی قطعاً خلاف ورزی نہیں کرتے۔

مزاری دراصل بلوچوں کی ایک مشہور اور بڑی قوم ہے۔ یہ لوگ سترھویں صدی عیسوی کے آخری یا اٹھارھویں صدی کے ابتدائی دور میں اپنے پہلے ٹھکانوں سے اٹھ کر نئی چراگاہوں کی تلاش میں نکلے۔ اس زمانے میں دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر "ناہر" قوم کا قبضہ تھا۔ ناہر دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے جو آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ایک گروہ کا صدر مقام "کن" اور دوسرے کا "بھاگسر" تھا — مزاریوں نے ایک لڑائی میں ناہر قوم کے ایک گروہ کی مدد کی اور اس کے بدلے میں وہ علاقہ اس سے لے لیا جو ضلع ڈیرہ غازی خاں میں روجھان اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے اور پھر مستقل طور پر اس علاقے میں آباد ہو گئے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ صوبہ پنجاب کے بعض زمیندار اور جاگیردار جن زمینوں اور جاگیروں پر قابض ہیں وہ انھیں انگریزی حکومت کی طرف سے کسی نہ کسی "خدمت" کے صلے میں ملی ہیں۔ لیکن مزاریوں کا یہ معاملہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر، ایک گروہ کی مدد کر کے زورِ بازو سے وہ علاقہ حاصل کیا

---

[۳۵] جامع مولوی سید نصیر الدین دہلی، ص ۴۰ -

ہے جو ان کی زمینوں اور جاگیروں پر مشتمل ہے۔ ان کا پنجاب کی سکھ حکومت سے بھی سلسلۂ جنگ جاری رہا اور انگریز سے بھی یہ لڑتے رہے۔

سوال یہ ہے کہ ان کو "مزاری" کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کے متعلق عام طور پر دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے بڑے کا نام مزار تھا، اس کے اخلاف، اس کی نسبت سے "مزاری" کہلائے۔ دوسری یہ کہ ابتدا میں یہ قوم جس ندی پر آباد تھی، اس کا نام "مزار" تھا، اس لیے قوم کا نام مزاری پڑ گیا۔

اکتوبر ۱۹۸۶ء میں پاکستان کے مشہور سیاسی لیڈر سردار شیر باز خاں مزاری لاہور آئے تو میری ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے مزاری کی وجہ تسمیہ پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ سب سے پہلے ہمارے اسلاف جس علاقے میں رہتے تھے، وہاں شیر کو مزار کہا جاتا تھا۔ ایک معرکے میں ہمارے ایک بزرگ نے بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے تو اس سے متاثر ہو کر وہاں کے سردار نے انھیں "مزار" کا خطاب دیا جس کے معنی وہاں کی بولی میں شیر کے ہیں۔ اس کے بعد پوری قوم کو "مزاری" کہا جانے لگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں، یہ قوم بہت بہادر اور جرأت مند تھی۔ سید نصیر الدین دہلوی کو میدانِ جنگ میں بھی اس سے واسطہ رہا اور عام حالات میں بھی۔ انھوں نے اپنے تجربے کی بنا پر ہندوستان میں ایک صاحب کو خط لکھا۔

مزاریاں بہ شجاعت و شہامت ضرب المثل اند، و نیز در اجمیر و جودھپور بذریعہ اخبارِ انگریزی معلوم شدہ بود کہ دریں ولایت قوم مذکور بر بعض محروسہ و مقبوضۂ سکھا غارہ کردند و چارپائے ہا بسیار بہ غارت بُردند۔ بہ طرفے ایں قوم رغبتے می یافتم۔[۳۶]

یعنی مزاری بہادری اور شجاعت میں ضرب المثل ہیں۔ ان کے بارے میں اجمیر اور جودھ پور میں انگریزوں کے ذریعے سے جو خبریں پہنچائی گئیں، ان سے معلوم ہو چکا تھا

۳۶؎ اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۲۹۔

کہ مزاریوں نے سکھوں کے بعض علاقوں پر حملے کیے اور ان کے بہت سے مولیشی لوٹ لیے گئے، لہذا اس قوم کے لیے میرے دل میں ایک کشش اور رغبت پیدا ہوگئی ہے۔

سید نصیر الدین یہ بھی تحریر فرماتے ہیں۔

چوں میرانِ خیر پور زیر دستانِ فرنگیاں و آشتی دارانِ سکھاں اند، قرارِ خود در محروسۂ الیشاں مقرونِ صلاح نمی بینم۔ اگرچہ متوقع چناں است کہ بفضلہ سبحانہ، مسلمانانِ ایں دیار بسیارے از بسیار ہمراہ خواہند شد۔ بخلافِ قوم مزاری کہ نہ از سکھاں خوفے دارند، نہ از فرنگیاں[۳۷]۔

یعنی والیان خیر پور چونکہ انگریزوں کے زیر اثر ہیں اور سکھوں سے بھی ان کی صلح ہے، اس لیے ان کے علاقے میں قیام میرے نزدیک خلاف مصلحت ہے۔ تاہم اُمید کی جاتی ہے کہ اس علاقے کے مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہمارا ساتھ دیں گے ــــ والیانِ خیر پور کے برعکس، مزاریوں کی یہ حالت ہے کہ نہ وہ سکھوں سے ڈرتے ہیں، نہ انگریزوں سے۔

سید نصیر الدین دہلوی، جس زمانے میں مزاریوں کے علاقے میں گئے، اس زمانے میں ان کا سردار، میر بہرام خاں مزاری تھا جو اپنے باپ میر حمل خاں مزاری کی وفات کے بعد ۱۸۰۱ء میں مزاری قوم کا سردار بنا۔ اس نے سید نصیر الدین اور ان کے رفقا کی بے حد پذیرائی کی اور ان کے ساتھ مل کر سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔

بہرام خاں کی شخصیت

بہرام خاں مزاری بہت عقل مند، نہایت مدبر اور فہیم و فریس آدمی تھا۔ ایک شخص موہن لال دہلوی نے انگریزی حکومت کے ملازم کی حیثیت سے مارچ ۱۸۳۶ء میں۔ ان علاقوں کا دورہ کیا تھا جن میں سکھوں اور مزاریوں کے درمیان لڑائیوں اور جھڑپوں کا سلسلہ جاری تھا۔ موہن لال نے بہرام خاں سے بھی ملاقات

۳۷ـ اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۳۰، ۳۱

کی تھی۔ وہ اپنے سفرنامے (ص ۴۲۵، ۴۲۶) میں لکھتا ہے۔

"بہرام خاں دبلا پتلا آدمی ہے اور قد درمیانہ۔ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص گہرے خیالات میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس کی طبیعت میں وہ شرارت اور پستی نظر نہیں آتی جو عام طور پر اس سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ وہ سرداروں کا سا لباس پہنتا ہے، میں نے سنا ہے کہ اس کے پاس بہت روپیہ ہے۔"

سکھوں سے لڑائیاں

مجاہدین اور مزاری متحد ہو چکے تھے اور انھوں نے سکھوں کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیا تھا۔ "روجھان" اور "کن" اس نواح میں فوجی نقطۂ نگاہ سے دو اہم مقام تھے، مجاہدین نے مزاریوں کے تعاون سے وہاں سکھوں پر شدید حملے کیے اور انہیں شکست دی۔ "کن" کے مقام سے سکھ بھاگے تو ان کو کافی نقصان پہنچا اور ان کے بعض بڑے بڑے فوجی مارے گئے۔ ایک شخص ہتو رام نے "باغ و بہار" کے نام سے ۱۸۷۱ء میں ضلع ڈیرہ غازی خاں کی تاریخ شائع کی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس کتاب کے صفحہ ۱۷۵ سے "روجھان" کی لڑائی کے بارے میں ایک اقتباس درج کیا ہے جو یہ ہے:۔

"مولوی نصیر الدین غازی ہندوستانی، علاقہ قندھار سے پھرتا ہوا، بہ جمعیت ایک ہزار سوار و پیادہ وارد علاقہ سندھ ہوا۔ تمن دار مزاری نے مولوی مذکور کو حامی خود بنا کر علاقہ "روجھان" کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا، مگر کاردار متعینہ قلعۂ روجھان بہ سبب پناہ اس قلعے کے بچ گیا۔ مردمان مزاری علاقہ روجھان کو مار تباہ کر کے واپس چلے گئے۔"[۳۸]

---

۳۸ سرگزشت مجاہدین، ص ۱۹۴ ۔۔۔ سید نصیر الدین کے بارے میں ہتو رام کا یہ کہنا غلط ہے کہ وہ قندھار سے علاقۂ سندھ میں وارد ہوئے تھے ۔۔۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا، وہ مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ دہلی سے سندھ آئے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

سکھوں اور مزاریوں کی صلح

زمانہ ہمیشہ کروٹ بدلتا رہتا ہے، کبھی کسی کے حق میں اور کبھی کسی کے مخالف۔ اب وقت نے ایسی انگڑائی لی کہ مزاریوں اور سکھوں کے درمیان مصالحت ہوگئی جو اس زمانے کے حالات کی رُو سے مزاریوں کے حق میں جاتی تھی اور مجاہدین کے خلاف ۔۔۔! یہ بات" اخبار مولوی سیّد نصیر الدین" میں بھی مذکور ہے اور رتنو رام نے بھی اپنی کتاب" باغ و بہار" (صفحہ ۱۷۵) میں ذکر کی ہے۔ ان کے حوالے سے مولانا غلام رسول مہر" سرگزشت مجاہدین" (صفحہ ۲۰۰) میں لکھتے ہیں۔

سیّد نصیر الدین نے لکھا ہے کہ (گورنر ملتان) دلوان ساون مل مجاہدین سے مرعوب ہو کر روجھان، مزاریوں کے حوالے کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ مستند تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دلوان مذکور مزاریوں کی یورشوں سے بہت پریشان ہوگیا تھا جو مجاہدین کی اعانت کے باعث خاص خطرناک صورت اختیار کرگئی تھیں۔ لہٰذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان سے مصالحت کی کوئی صورت پیدا کر کے کش مکش ختم کر دی جائے۔ چنانچہ رحیم خاں لغاری کے ذریعے گفت وشنید ہوئی۔ مزاریوں کے تمام سابقہ حقوق بحال کر دیے گئے اور انھوں نے یہ منظور کر لیا کہ اپنے آپ کو سکھوں کی رعایا سمجھیں گے۔ میر بہرام خاں مزاری کو پہلے ملتان بلایا گیا اور دلوان ساون مل نے اسے ایک ہزار روپے کا خلعت دیا، پھر اسے رنجیت سنگھ نے لاہور بلایا۔ میر بہرام خاں کو طلائی کڑوں کی ایک جوڑی، ایک ہزار روپے نقد اور خلعت، نیز اس کے ساتھ جو پچاس مزاری سوار تھے، انھیں ریشمی کپڑے دیے گئے۔

نئی قیام گاہ

اب حالات کچھ ایسا رُخ اختیار کر گئے تھے کہ سیّد نصیر الدین اور اُن کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) اور پھر مزاریوں کے علاقے میں داخل ہوئے تھے۔ یہاں آکر انھوں نے سکھوں سے جہاد کیا۔

ساتھیوں کے لیے مزاریوں کے ہاں قیام کرنا ممکن نہ رہا اور وہ "کشمور" چلے گئے لیکن یہاں یہ معاملہ تھا کہ کشمور، سکھوں کی عمل داری کے بالکل قریب تھا اور اس کا حاکم خفیہ طور پر ملتان کے گورنر ساون مل سے ساز باز رکھتا تھا۔ ساون مل، مجاہدین کا دشمن تھا اور اس کے فوجی ٹھکانوں پر مجاہدین اور مزاری کئی مرتبہ شب خون مار چکے تھے۔ لہٰذا سید نصیر الدین نے وہاں رہنا مناسب نہ سمجھا اور کسی اور مقام پر چلے گئے۔ اس زمانے میں مجاہدین سے سکھ فوجی نہایت خوف زدہ تھے! اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ مجاہدین جب کشمور میں مقیم تھے، ساون مل نے جو مجاہدین کے قریب ہی فوج لیے بیٹھا تھا، ایک روز اپنی فوج کے ایک دستے کو مجاہدین کے ٹھکانے پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔ اس کا جواب اس کے خود اپنے فوجیوں کی طرف سے اسے ان صاف الفاظ میں دیا گیا۔[۳۹]

تو پیش ما روی، ما ہم ہمراہِ تو می رویم، وإلّا مجال نداریم کہ بر غازیاں شب خون زنیم۔

یعنی تو ہمارے آگے چل، ہم تیرے ساتھ جانے کو تیار ہیں۔ ورنہ ہماری یہ مجال نہیں کہ غازیوں پر شب خون ماریں۔

اس جواب سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجاہدین اگرچہ بہت کم تعداد میں تھے اور ہندوستان کے دُور دراز علاقے سے آئے تھے، لیکن سکھ اپنی طاقت اور حکومت کے باوجود ان سے خائف تھے۔

مجاہدین کی یہ قیام گاہ اگرچہ سندھ کے کسی حاکم کی عمل داری میں تھی، مگر ریاست بہاول پور کی سرحد کے قریب تھی — لہٰذا نواب بہاول خاں اس سے گھبرا اُٹھا، اور خطرہ محسوس کرنے لگا کہ مجاہدین اس کے علاقے میں دست درازی کریں گے حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی اور مجاہدین کو نواب بہاول خاں سے کوئی پرخاش نہ تھی — تاہم وہ فوج لے کر آیا اور مجاہدین کے ٹھکانے سے صرف تین کوس کے فاصلے پر

---

[۳۹] اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) صفحہ ۱۰۹

آ بیٹھا۔ نیز سندھ کے حکمرانوں کے پاس اپنے آدمی بھیجے کہ مجاہدین کو وہاں سے ہٹا لیا جائے اور ادھر نہ آنے دیا جائے۔

نواب بہاول خاں کے پیغام کے بعد سندھ کے حکمرانوں نے سید نصیر الدین کو پیغام بھیجا کہ:

آں صاحب لشکرِ خود را برداشتہ در ملکِ مایاں بر مقام روپا کہ ضلعیست یا جائے دیگر بہ آں لبِ دریائے اباسین یعنی بہ طرف شکارپور ہر جائے کہ پسند خاطر افتند، چھاؤنی لشکرِ خود انداز زند۔[۱۴۵]

آپ اپنے لشکر کو یہاں سے ہٹا کر ہمارے ملک کے موضع روپا میں آ جائیں، جو دریائے سندھ کے اس طرف یعنی شکارپور کی جانب ہے یا کسی اور مقام پر جو آپ کو پسند ہو قیام کر لیں اور اسے اپنی فوج کی چھاؤنی بنالیں۔

چنانچہ سید نصیر الدین وہاں سے اٹھ کر ایک جگہ "مہرو" چلے گئے جو شکارپور سے بارہ پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ سید صاحب ممدوح فرماتے ہیں، یہ جگہ بڑی عمدہ اور کشادہ ہے، یہاں غلہ بھی مطلوبہ مقدار میں میسر ہے، پانی بھی عام ہے، گھاس اور لکڑی بھی بہت ہے، گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے یہاں اچھی چراگاہیں بھی ہیں۔ یعنی ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔

سید نصیر الدین اور ان کے رفقا کا اصل اور بنیادی مقصد جہاد تھا اور اس سلسلے میں وہ وہاں کے رئیسوں، امیروں، حاکموں اور پیروں کا تعاون چاہتے تھے، اور یہ بھی چاہتے تھے کہ مجاہدین مقامی مسلمانوں پر بوجھ نہ بنیں، انھیں محنت مزدوری کے مواقع میسر ہوں تاکہ وہ کچھ کما کر گزر اوقات کر سکیں۔ اس ضمن میں بھی وہ وہاں کے

---

۱۴۵ اخبار مولوی سید نصیر الدین صفحہ ۱۴۳ — منقول ہے کہ شکارپور کے شمالی حصے اور جیکب آباد کے تھوڑے سے جنوبی حصے کو قدیم زمانے میں "روپا" کہتے تھے — اب سرکاری طور پر اس کا یہ نام نہیں ہے، لیکن بتایا جاتا ہے کہ سندھ کے عوام اس خطے کو اب بھی روپا ہی کہتے ہیں۔

مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کے متمنی تھے اور مہرو کا محل وقوع ایسا تھا کہ وہاں یہ سہولتیں حاصل ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

امیرانِ سندھ درصورتِ اقامتِ مایاں دریں ملک و جنگ کردن با کفار سکھاں و فراہم آوردن مسلماناں بہ ہیچ وجہ مانع و مزاحم نیستند، واز سکونتِ لشکر اسلام خواہ از روئے تجارت باشد یا کسبِ دیگر، کسے ناخوش نیست، زیراکہ زمینِ سندھ صدہا کروہ ویران و غیر آباد افتادہ است۔ ہر قدر آبادی بہ عمل آید، خوشنودئ رئیسانِ ایں نواح است[ا]

یعنی سندھ کے امرا دراصل اس علاقے میں مجاہدین کے قیام کرنے، کافر سکھوں سے جنگ کرنے اور وہاں سے جنگ جو مسلمانوں کی فراہمی میں قطعی طور سے مزاحمت نہیں کریں گے۔ ہمارے ساتھی یہاں رہ کر تجارت کریں یا کھیتی باڑی کا سلسلہ شروع کریں یا کوئی اور پیشہ اختیار کر لیں، اس سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سندھ میں سیکڑوں کوس زمین ویران اور غیر آباد پڑی ہے۔ یہاں جتنی آبادی ہو گی، اس علاقے کے رئیسوں کے نزدیک خوشنودی کا باعث سمجھی جائے گی۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سید نصیر الدین اور اُن کے ساتھی مجاہدین کتنا عرصہ مہرو میں اقامت گزیں رہے۔

قلات کے وزیر اعظم کا اصرار

سید نصیر الدین کے قیام سندھ کے زمانے میں اور اس دور میں جب کہ وہ مزاربوں کے پاس مقیم تھے اور سکھوں سے برسرِ پیکار رہتے تھے، قلات کا وزیر اعظم مختار الدولہ محمد حسن بھی انھیں خطوط لکھتا اور قلات تشریف لانے پر اصرار کرتا رہا۔ اپنے خطوط میں وہ ان سے

[ا] اخبار ی مولوی سید نصیر الدین، ص ۱۴۳۔

انتہائی عقیدت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ان کا ادنیٰ خادم ہے۔ ایک خط میں جو انھیں مہرو کے دوران قیام میں ملا، لکھتا ہے۔

این فدوی خدامی داند کہ خود را غائبانہ یکے از غلامان و دامن گرفتگان خادمان عالی می داند[۴۲]۔

کہ خدا گواہ ہے، میں اپنے آپ کو آپ کے غلاموں اور متوسلوں میں شمار کرتا ہوں ایک اور خط میں ان کے ساتھ جہاد میں شرکت کا پختہ عہد کرتا ہے۔

اصلاً خود را از مویدات این امر شریف دین نبویؐ حتی الامکان دریغ نخواہد داشت[۴۳]۔

میں دین نبویؐ کے اس اہم حکم یعنی جہاد کی تائید و حمایت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھوں گا۔

لیکن ان خطوط و مواعید کے باوجود کہا جاتا ہے کہ محمد حسن نہایت چالاک اور زمانہ ساز آدمی تھا۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ سید نصیر الدین ان خطوط سے کہاں تک متاثر ہوئے اور وہ اس کے پاس قلات گئے یا نہیں گئے۔

بلوچستان میں

جب سید نصیر الدین کو کسی طرف سے کوئی اُمید نہ رہی اور سندھ یا اس نواح کے کسی اور علاقے میں محاذ قائم کر کے مخالفین اسلام کے ساتھ جنگ و جہاد کا امکان ختم ہو گیا تو بلوچستان کو روانہ ہوئے اور سبّی، ڈھاڈر، تھل اور چھتیالی وغیرہ میں کچھ مدت قیام کیا۔ شادوزئی، غلزئی، کاکڑ، استرانی اور بزدار وغیرہ قبائل میں تھوڑا عرصہ سکونت اختیار کی۔ کچھی بھی کچھ دن ٹھہرے۔ لورالائی، زوب اور کوئٹہ کے کوہستانی علاقوں میں بھی مقیم رہے۔ ان تمام مقامات پر جانے کا مقصد صرف ایک تھا، اور وہ تھا جہاد فی سبیل اللہ۔ سکھوں کے مقبوضات بہت وسیع ہو چکے تھے اور مسلمان ان کے

---

[۴۲] اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۱۳۴

[۴۳] ایضاً ص، ۱۳۸

ہاتھوں سخت مصائب میں مبتلا تھے۔ سید ممدوح اور ان کے ساتھی، ان سے جہاد کے لیے بے تاب تھے۔ مگر سیاسی حالات میں اس درجے تغیّر رونما ہو چکا تھا کہ جہاد کے لیے جم کر بیٹھنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی ۔۔ اس طول طویل سفر میں متعدد رفقا وفات پا گئے۔ بعض راستے میں غیر مسلموں سے جھڑپوں میں شہید ہو گئے اور بعض اِدھر اُدھر چلے گئے۔ یہ حضرات پھرتے پھراتے ستھانہ پہنچے جہاں مجاہدین کا پہلا مرکز تھا اور وہاں بھی اب چند لوگ باقی تھے مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ ان حالات میں انھوں نے ازسرِ نو کام شروع کیا اور مجاہدین کی فراہمی اور تنظیم کو مرکزِ توجہ ٹھہرایا۔ لوگوں کو دعوتِ جہاد دی اور اس کے لیے باقاعدہ کام کی طرح ڈالی۔

انگریزوں سے جہاد

اس اثنا میں ناگہاں حالات میں تبدیلی آئی اور گردوپیش کی سیاسیات نے انگڑائی لی تو پتا چلا کہ انگریزوں نے افغانستان پر قابض ہونے اور اس کی آزادی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے والیٔ افغانستان امیر دوست محمد خاں کو سخت پریشانی لاحق ہوئی اور اس نے میدانِ مقابلہ میں اُترنے کا عزم کر لیا۔ سیّد نصیر الدین اپنے ساتھیوں کی معیت میں وہاں پہنچے اور امیر دوست محمد خاں کی کمان میں انگریزوں سے لڑائی کا اعلان کر دیا ۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے افغانستان کے حکمران خاندان میں اختلاف پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں، جس میں وہ کامیاب رہے اور نتیجتاً پورے ملک میں خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا، جس نے ایک ہولناک صورت اختیار کر لی۔ دوست محمد خاں کو مجبوراً انگریزوں کے سامنے جھکنا پڑا۔

پھر ایک موقع آیا کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان غزنی کے مقام پر سخت جنگ شروع ہو گئی۔ سیّد نصیر الدین فوراً اپنے مجاہد رفقا کی معیت میں وہاں پہنچے۔ یہاں اُنھوں نے خوب دادِ شجاعت دی اور انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس دوران میں یہ افسوس ناک حادثہ پیش آیا کہ امیر دوست محمد خاں کا ایک قریبی عزیز انگریزوں سے مل گیا اور اس نے قلعۂ غزنی کے تمام اندرونی اور جنگی راز ان کو بتا دیے۔

اس کے بعد انگریزوں نے رات کے اندھیرے میں قلعے کے ایک دروازے پر بارود کے تھیلے رکھے اور انھیں آگ لگا دی۔ اس سے خوف ناک دھماکہ ہوا اور دروازہ اُڑ گیا۔ انگریزی فوج فوراً قلعے میں داخل ہو گئی۔ اس موقع پر دست بہ دست جنگ ہونے لگی، جس میں سیّد نصیر الدین کے بہت سے ساتھی جامِ شہادت نوش کر گئے۔ یہ واقعہ ۲۱ — جولائی ۱۸۳۹ء کو پیش آیا۔

بعض انگریز مورخوں نے لکھا ہے کہ سیّد نصیر الدین ایک ہزار آدمی لے کر کابل کی طرف بڑھے۔ ڈھاڈر کے مقام سے انھوں نے تین سو مجاہدوں کی جمعیت امیر دوست محمد خان کی امداد کے لیے بھیجی۔ یہ لوگ غزنی کی حفاظت پر متعین ہوئے تھے اور وہیں جاں بحق ہو گئے۔

ستھانہ میں

اس کے بعد سیّد صاحب اور ان کے بچے کھچے مجاہد ساتھی سخت مصائب کی منزلیں طے کرتے اور آلام کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے ستھانہ پہنچے، جہاں مولوی نصیر الدین منگوری کو مجاہدین نے اپنا امیر مقرر کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی سیّد نصیر الدین کو مجاہدین نے امیر مقرر کر لیا۔ یہ ۱۸۳۹ء کے اواخر یا ۱۸۴۰ء کے اوائل کی بات ہے۔

عادات و اطوار

سیّد نصیر الدین دہلوی نہایت عمدہ عادات و اطوار کے مالک تھے۔ انتہائی نرم مزاج، حلیم الطبع اور بلند کردار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سب لوگ ان کی عزت کرتے اور تکریم سے پیش آتے تھے۔ تمام طبقوں میں ہر دلعزیز اور عوام و خواص میں احترام کا مقام رکھتے تھے۔ عالم و فاضل اور عابد و زاہد تھے۔ معقول و منقول پر گہری نظر تھی۔ اور حدیث و فقہ میں ماہر تھے۔ کثیر الدعا اور کثیر البکا بزرگ تھے۔ دعا کے لیے بارگاہِ خداوندی میں ہاتھ اُٹھاتے تو اس الحاح و عجز سے دعا کرتے کہ لوگوں کو یقین ہو جاتا کہ یہ دعا ضرور درجۂ قبولیت حاصل کرے گی۔ ایک مرتبہ سندھ کے کسی مقام پر بہت بڑے مجمعے میں دُعا کی، جس کی اثر انگیزی سے حاضرین زار و قطار رونے لگے۔ اکثر لوگوں

پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ بعض لوگ مجذوبیت کے عالم میں کپڑے پھاڑ کر صحرا کی طرف نکل بھاگے۔[۴۴]

ان کی دعوت و تبلیغ بھی انتہائی پُر تاثیر تھی۔ اُونچے مرتبے کے حق پرست، کتاب و سنّت کے عاشق صادق اور خلوص وللّٰہیت کے پیکر تھے۔ جہاد فی سبیل اللّٰہ کی تلقین فرماتے تو لوگ اثر میں ڈوب جاتے۔

نماز بہت ہی خشوع و خضوع سے پڑھتے اور تمام ارکان ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے۔ تدین و صالحیت میں اپنی مثال آپ تھے۔

فقہی مسائل پر عبور و استحضار کا یہ عالم تھا کہ دورانِ سفر اور دورانِ قیام میں اس سلسلے میں لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے۔

ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ واقعۂ بالاکوٹ کے بعد جہاد کے سلسلے میں لوگوں پر جو افسردگی طاری ہو گئی تھی، مسلسل محنت و کوشش اور بے حد بھاگ دوڑ سے اُسے ختم کیا۔ مجاہدین کی جماعت کو منظم کیا اور جو لوگ مایوسی کا شکار ہو گئے تھے، ان میں از سرِ نو روحِ جہاد پیدا کی۔ سررشتۂ نظم و نسق کو مضبوط کیا اور لوگوں کو اس میں شامل ہونے کی زوردار الفاظ و اسلوب میں دعوت دی اور اس میں اللہ نے ان کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔

وفات

سیّد نصیر الدین دہلوی نے مرکزِ مجاہدین ستھانہ سے والیِ امب پائندہ خاں تنولی کو خط لکھا کہ وہ مجاہدین سے تعاون کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان کی امداد کرے۔ خط پڑھ کر پائندہ خاں نے انھیں اپنے ہاں امب تشریف لانے کی دعوت دی، وہ امب گئے اور کئی دن وہاں مقیم رہے ــــ مشہور ہے کہ پائندہ خاں نے انھیں زہر دلوا دیا تھا۔ بعض لوگ اس بات کو صحیح نہیں قرار دیتے ــــ بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو،

---

[۴۴] سرگزشت مجاہدین، ص ۲۰۹ بحوالہ وزیرالدولہ ج اوّل، ص ۲۷۳، ۲۷۴

پائندہ خان نے انھیں زہر دلوا دیا ہو یا نہ دلوا دیا ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ امب ہی میں بیمار ہوئے، حالتِ بیماری ہی میں ستھانہ آئے اور چند روز بعد وفات پا گئے۔ وفات کے مہینے کا تعین نہیں ہو سکا، البتہ سنِ وفات ۱۸۴۰ء تھا۔ انھیں ستھانہ میں دفن کیا گیا۔ اس سے اگلے سال ۱۸۴۱ء کو دریائے سندھ میں سیلاب آیا تو ان کی قبر سیلاب میں بہہ گئی۔ اسی سیلاب میں مجاہدین کا مرکز ستھانہ بھی تباہ ہو گیا، جسے سید نصیر الدین نے بڑی محنت سے آباد کیا تھا۔ مجاہدین جو بہت کم تعداد میں باقی رہ گئے تھے، انھوں نے میر اولاد علی کو اپنا امیر مقرر کر لیا جو اس سے قبل مولوی نصیر الدین منگلوری کی شہادت کے بعد تھوڑی سی مدت کے لیے منصبِ امارت پر متمکن رہ چکے تھے۔

اہل و عیال

سید مرحوم کی شادی حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی اور ہجرت کے وقت ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام عبداللہ تھا، دوسرے کا عبدالحکیم ــــ جہاد کے لیے گھر سے نکلے تو دونوں بیٹے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بعض مکاتیب میں ان کی تعلیم کے لیے تاکید فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں اپنی اہلیہ کو لکھتے ہیں:

اُمید از مالکِ خود قوی دارند کہ او جلّ جلالہ ما و شمارا در دارِ دنیا بہ مراد ملاقی کناند و در ہر امر توکّل بر خدا باید کرد، و استقامت بر نمازِ مفروضہ و تلاوتِ قرآن باید نمود، و غفلت در زکوٰۃ نہ باید کرد، و در تعلیم عبداللہ و عبدالحکیم باید کوشید، و دل را با ہر دو فرزنداں باید چسپانید، و در وقتِ نشست و برخاست و قیام و قعود نامِ خدا باید گرفت[۴۵]

"یعنی خدا سے قوی اُمید رکھیے کہ وہ ہم اور آپ کو اس دنیا میں حسبِ مراد ملائے گا۔ ہر کام میں خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ فرض نماز اور تلاوتِ قرآن پر استقامت ضروری ہے۔ ادائے زکوٰۃ میں غفلت نہ ہو۔ عبداللہ اور عبدالحکیم کی تعلیم کے لیے کوشش کیجیے، دل دونوں بیٹوں میں لگایے۔ اُٹھتے بیٹھتے خدا کا نام لیتے رہیے۔"

---

[۴۵] اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی)، ص ۱۵

یہ ان کے ایک مکتوب کے الفاظ ہیں، لیکن ہجرت سے لے کر وفات تک اس دنیائے فانی میں اپنے اہل و عیال سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی، جس طرح کہ ہجرت کے بعد سیّد احمد شہید اپنے بال بچوں سے نہیں مل سکے۔ غالب خیال یہ ہے کہ ان کے بیٹے اور بیوی شاہ محمد اسحاق کے ساتھ ہجرت کر کے مکّہ معظمہ چلے گئے تھے۔

مولانا غلام رسول مہر رقم طراز ہیں کہ مولانا سیّد عبدالحی رائے بریلوی نے لکھا ہے کہ مولانا سیّد نصیر الدین کے اولاد نہ چلی۔ البتہ ان کے بھائی سیّد ناصر الدین کے ایک فرزند سیّد معزّ الدین تھے اور سیّد معزّ الدین کے فرزند سیّد ظہیر الدین احمد تھے، جن سے مولانا سیّد عبدالحی نے ۱۸۹۵ء میں ملاقات کی تھی۔ انہی سیّد ظہیر الدین احمد نے ولی اللّٰہی خاندان کی بیشتر تصنیفات چھپوائی تھیں، بلکہ اس غرض سے ایک مطبع قائم کر لیا تھا۔

۱۱۵ـــــ مفتی نظام الدّین سورتی

ہندوستان کے صوبہ گجرات میں ایک شہر "سورت" ہے، جسے کئی سو سال عہدِ علم کی حیثیت حاصل رہی اور بے شمار علما و فقہا نے وہاں جنم لیا اور مسانِدِ تدریس آراستہ کیں۔ وہ تصنیف و تالیف میں بھی شہرت یاب ہوئے اور تصوّف و طریقت کے میدان میں بھی درجۂ کمال حاصل کیا۔ غرض وہ تمام اصنافِ فضیلت اور تمام اقسامِ علم میں ممتاز ہوئے اور ہر شعبۂ فن میں ان کا جھنڈا بلند رہا۔ ان حضراتِ عالی مقام کے تذکار سلسلۂ فقہائے ہند کی تمام جلدوں میں بہت سے مقامات میں احاطۂ تحریر میں آچکے ہیں ـــــ تیرھویں صدی ہجری کا سورت بھی علم و علما اور فقہ و فقہا کے سلسلے میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے ـــــ اس صدی میں اس سرزمین کے جن اہلِ علم اور اصحابِ فقہ نے نام پیدا کیا، ان میں مفتی نظام الدین سورتی کا اسمِ گرامی لائقِ تذکرہ ہے ـــــ یہ سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والدِ محترم مفتی خیر الدین سورتی سے حصولِ علم کیا اور طویل عرصے تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سورت کے منصب افتا پر فائز ہوئے۔ تمام فقہی مسائل کے لیے سورت اور اس کے قرب وجوار کے لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے اور ان کا مطالعۂ علم فقہ نہایت وسیع تھا۔ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سورت کے اس عالم وفقیہ نے ۲۸۔ رجب ۱۲۴۰ھ کو سورت میں وفات پائی۔[۵۴۶]

۱۱۶ــــــــ مفتی نظر محمدؒ سہسوانی

سیدؒ مفتی نظر محمدؒ حسینی مودودی سہسوانی علم وفضل اور مشیخیت وصالحیت میں عالی مرتبت لوگوں میں سے تھے۔ مولانا سیدؒ مفتی محمد ہاشم کے فرزند اور مفتی محمد عاقل حسینی سہسوانی کے پوتے تھے۔ ۱۱۴۰ھ کے لگ بھگ سہسوان میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ ان کے والد مفتی محمد ہاشم سہسوانی کا شمار اپنے دور کے جیدؒ علما میں ہوتا تھا اور سہسوان میں ان کے درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ لائق بیٹے نے انہی سے اکتساب علم کیا اور مرتبۂ بلند پر فائز ہوئے۔ ولایت ومعرفت اور شریعت وطریقت کے رموز سے آگاہ تھے اور اس میں خاص شہرت رکھتے تھے۔

مفتی نظر محمد بہت ذہین اور انتہائی فہیم بزرگ تھے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں علومِ رسمیہ سے فراغت حاصل کرلی تھی۔ اسی اثنا میں والدِ مکرم مفتی محمد ہاشم نے وفات پائی جو مغلیہ حکومت کی طرف سے سہسوان اور اس کے اردگرد کے منصبِ افتا پر متمکن تھے۔ والد کی وفات کے بعد اس اہم منصب پر مفتی نظر محمد کو متعین کیا گیا۔ اگرچہ یہ کم عمر تھے اور منصبِ افتا بہت ذمہ دارانہ منصب تھا، لیکن مفتی نظر محمد نے اپنے مفوضہ فرائض نہایت حسن وخوبی سے انجام دیے۔ کافی عرصہ اس منصب پر مامور رہے۔

اس دوران میں ان کی زندگی ایک عجیب انقلاب سے دوچار ہوئی اور وہ

---

۵۴۶ حقیقتِ سورت، ص ـــ نزہتہ الخواطر، ج ۷، ص ۵۰۳

ذکر و فکر اور مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ ایک دور ایسا آیا کہ آبادی سے نکل بھاگے اور صحرا میں ڈیرہ لگا لیا۔ کافی مدت بعد گھر آئے اور تجرد و انزوا کی زندگی اختیار کر لی۔ ہر وقت مشغولِ عبادت رہتے، کسی سے قطعاً کوئی رابطہ نہ تھا۔ کچھ طبیعت سنبھلی تو دور و نزدیک سے بے شمار لوگ حصولِ فیض کے لیے حاضر ہونے لگے۔ فقرا و مساکین اور مہمانوں کا ہر آن جمگھٹا رہتا۔ تمام جائداد غربا و مساکین اور یتامیٰ و مستحقین میں بانٹ دی۔ اعزہ و اقارب کو بھی بہت کچھ عنایت کیا۔ وہ مغل بادشاہ محمد شاہ کا زمانہ تھا اور یہ بادشاہ علما و فقہا اور مشائخ و صلحا کا عقیدت مند تھا۔ اس کو مفتی نظر محمد کی کیفیت کا پتا چلا تو اس نے چار زرخیز گاؤں بہ طور جاگیر عطا کیے۔

مفتی محمد نظر سہسوانی جب جذب و حال کی وجہ سے منصب افتا سے علیحدہ ہو گئے تو مغل حکمران نے اس منصب پر ان کے بیٹے سید مفتی نور احمد کو متعین کر دیا۔

مفتی نظر محمد سہسوانی نے جمعے کے دن ۱۴ ذیقعدہ ۱۲۳۶ھ کو وفات پائی۔[۲۴۷]

۱۱۷ ـــــ مفتی نعمت اللہ لکھنوی

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محلی میں مفتی نعمت اللہ انصاری فرنگی محلی لکھنوی کو کبار فقہا اور مشاہیر اساتذہ میں گردانا جاتا تھا۔ ہیئت، ہندسہ، حساب وغیرہ فنونِ ریاضیہ میں لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

مفتی نعمت اللہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ تمام گھرانہ دولتِ علم سے مالا مال تھا، خود ان کے والد مفتی نوراللہ انصاری کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، ان کے عم محترم مفتی ظہوراللہ انصاری بھی مسندِ تدریس پر رونق افروز تھے۔ نعمت اللہ نے انہی دونوں سے تعلیم پائی اور

---

[۲۴۷] حیات العلما، ص ۱۹ تا ۲۱

مختلف اصنافِ علم میں ممتاز ہوئے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد یوپی کے ایک شہر فیض آباد کا منصب افتاان کے سپرد ہوا۔ یہ ایک عہدہ جلیلہ تھا جو حکومت کی طرف سے اسی عالم کو تفویض کیا جاتا تھا جو علم فقہ میں مہارت رکھتا ہو۔ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیے گئے اور ایک مدت تک فیض آباد اور لکھنؤ کی مسندِ افتا پر مامور رہے۔

بعدازاں علاقہ گجرات کے رئیس کی دعوت پر "بڑودہ" گئے، پھر علاقہ بہار کے ایک مقام "ربیا" تشریف لے گئے۔

مفتی نعمت اللہ ذکاوت وحلاوت، حلم وتواضع اور دیانت ومتانت میں خاص شہرت رکھتے تھے، گفت گو میں نہایت نرم تھے۔ طلبا کو درس بھی ٹھہر ٹھہر کر دیتے، جو کتاب پڑھانا ہوتی، اس کے متعلق تمام تفصیلات بیان کرتے اور جو مقام پڑھاتے، اس کے حواشی وتشریحات وغیرہ اچھی طرح طلبا کے ذہن نشین کراتے۔ نحیف الجثہ بزرگ تھے اور اس قدر آہستہ بات کرتے کہ قریب بیٹھا ہوا شخص بھی مشکل سے سمجھ پاتا۔ بہت سے علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا جن میں مولانا عبدالحلیم انصاری، ان کے بیٹے مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور خود مفتی نعمت اللہ کے صاحب زادے مولانا فضل اللہ انصاری شامل ہیں۔

مفتی نعمت اللہ انصاری فرنگی محلی نے ۱۲۹۹ھ کو وفات پائی[۴۸]۔

۱۱۸۔ مولانا نقی علی خاں بریلوی

مولانا نقی علی خاں بریلوی تیرھویں صدی ہجری میں اپنے نواح کے معروف عالم اور فقیہ تھے۔ مسلکاً حنفی تھے۔ پٹھان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ مختصر سا سلسلۂ نسب

---

[۴۸] تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۸۳ تا ۱۸۵ ـــــ احوال علمائے فرنگی محل، ص ۷۸، ۷۹ ـــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۳ ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۰۶۔

یہ ہے: نقی علی بن رضا علی بن کاظم علی بن اعظم شاہ بن سعادت یار ــ!

نقی علی غرۂ رجب ۱۲۴۶ھ کو بانس بریلی میں پیدا ہوئے اور تمام کتب درسیہ اپنے والدِ ماجد مولانا رضا علی سے پڑھیں۔ سید آل رسول مارہروی سے اخذِ طریقت کیا اور ۱۲۹۴ھ کو ان سے سندِ حدیث لی۔ ۱۲۹۵ھ میں حج بیت اللہ کیا اور مکہ مکرمہ میں شیخ احمد زین دحلان سے حدیث کی سند حاصل کی۔

اہل حدیث کے شدید مخالف تھے، مولانا اسماعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان کے رد میں ایک کتاب تصنیف کی۔ اپنے مخالفین پر سخت تنقید کرتے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:۔

۱۔ الکلام الاوضح فی تفسیر الم نشرح۔ سورۂ الم نشرح کی تفسیر میں یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔

۲۔ وسیلۃ النجاۃ: یہ کتاب آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ سے متعلق ہے۔

۳۔ سرور القلوب فی ذکر المحبوب: یہ وسیلۃ النجاۃ کی تلخیص ہے۔

۴۔ جواھر البیان فی اسرار الارکان: نماز روزہ وغیرہ ارکانِ دین کے بارے میں۔

۵۔ اصول الرشاد فی تصحیح مبانی الفساد: نجدیوں کے رد و ابطال میں۔

۶۔ ھدایۃ البریہ الی الشریعۃ الاحمدیہ: ان متعدد فرقوں کے رد میں جو ان کے نزدیک فساد انگیزی میں مصروف تھے۔

۷۔ اذاقۃ الآثام لمانعی المولد والقیام:

۸۔ ازالۃ الاوھام: نجدیوں کے رد میں۔

۹۔ تزکیۃ الایقان فی رد تقویۃ الایمان: مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی کتاب (تقویۃ الایمان) کی تردید میں۔

۱۰۔ فضل العلم والعلماء:

۱۱۔ الکواکب الزھراء فی فضائل العلم وآداب العلماء:

۱۲۔ الروایۃ الرویہ فی اخلاق النبویہ:

۱۳۔ النقادۃ النقویہ فی الخصائص النبویہ:

۱۴ - لمعۃ النبراس فی آداب الاکل واللباس -

۱۵ - التمکین فی تحقیق مسائل التزئین -

۱۶ - احسن الوعاء لآداب الدعاء -

۱۷ - خیر المخاطبہ فی المحاسبۃ والمراقبہ -

۱۸ - ھدایۃ المشارق الیٰ سیر الانفس والآفاق -

۱۹ - ارشاد الاحباب الیٰ آداب الاحتساب -

۲۰ - اجمل الفکر فی مباحث الذکر -

۲۱ - عین المشاھدہ لحسن المجاھدہ -

۲۲ - تشوق الاواہ الیٰ طرق محبۃ اللہ -

۲۳ - نہایۃ السعادہ فی تحقیق الھمۃ والارادہ -

۲۴ - اقوی الذریعہ الیٰ تحقیق الطریقہ -

۲۵ - ترویح الارواح فی تفسیر سورۃ الانشراح -

مولانا نقی علی خاں بریلوی نے سلخ ذیقعدہ ۱۲۹۷ھ کو وفات پائی۔[۴۹]

۱۱۹ ــــــ مفتی نور احمد سہسوانی

سہسوان (یوپی) کے تیرھویں صدی ہجری کے علما و فقہا میں سید مفتی نور احمد حسینی سہسوانی کا نام نامی بہت مشہور ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مفتی نظر محمد اور جدّ امجد کا مفتی ابو محمد تھا۔ مغل دور میں اس خاندان کے علما اپنے شہر سہسوان کے مفتی تھے اور یہ سلسلہ عہدِ مغلیہ کے آخر تک جاری رہا۔ مفتی نور احمد بھی افتا کے عہدۂ عالی پر متمکن تھے اور اپنے وقت کے شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ تدین و صالحیت میں بھی شہرت رکھتے تھے۔

---

[۴۹] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۴، ۲۴۵ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۰۸، ۵۰۹ -

نور احمد ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ سہسوان میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ چند سال کی عمر کو پہنچے تو حصولِ علم کے لیے مراد آباد، رام پور اور لکھنؤ کا سفر کیا، وہاں کے مختلف علما و اساتذہ سے ملے اور ان کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں خاص طور سے لائقِ تذکرہ شخصیت بحر العلوم عبد العلی انصاری فرنگی محلی کی ہے۔

نور احمد سہسوانی کی ذہانت وفطانت کا یہ عالم تھا کہ زمانۂ طالب علمی ہی میں حواشی و تعلیقات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس کے لیے درسیات کی مشکل ترین کتابوں کا انتخاب کیا۔ مثلاً قاضی مبارک کی "شرح سلّم" پر تعلیقات سپردِ قلم کیں، ملّا محمود جون پوری کی "شمس البازغہ" پر تعلیقات و حواشی تحریر فرمائے۔

تعلیم سے فراغ کے بعد اپنے والد مفتی نظر محمد کی جگہ سہسوان کے مفتی مقرر ہوئے اور چالیس برس تک نہایت حسن و خوبی سے یہ نازک ترین خدمت انجام دیتے رہے۔

فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ایک مثنوی گلشنِ عشق لکھی جو یوسف زلیخا کی طرز پر ہے۔

مفتی نور احمد دینی اور دنیوی وجاہت کے مالک تھے، امارت و ثروت سے بہرہ ور اور علم و کمال سے سرفراز تھے۔ ہر حلقے میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور لوگ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔

اس عالم اجل اور ممتاز فقیہ نے ۱۲۸۰ھ کے قریب سہسوان میں انتقال کیا۔[۵۰]

۱۲۰ ـــــــ مفتی نور اللہ لکھنوی

لکھنؤ کے فرنگی محلی علما کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آسانی سے اس کا احاطہ نہیں

---

۵۰ حیات العلما، ص ۲۱، ۲۲

میں ہو چکا ہے۔ انہی بزرگوں میں ایک بزرگ مفتی نور اللہ انصاری فرنگی محلی تھے جو مولانا محمد ولی کے فرزندِ گرامی اور مولانا غلام مصطفیٰ انصاری کے پوتے تھے۔ اپنے دور کے عالم و فقیہ اور شیخ تھے۔

اس نامور عالم کی ولادت اور تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ اپنے والد مولانا محمد ولی اور مفتی عبدالواحد خیرآبادی سے حصولِ علم کیا۔ حساب و ریاضی وغیرہ علوم میں بہت ماہر تھے۔ لکھنؤ کے منصبِ قضا پر متعین رہے اور یہ اہم کام بڑی خوب صورتی اور احتیاط سے انجام دیا۔ درس و افادے کا سلسلہ بھی باقاعدہ جاری رکھا۔ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ مختلف کتب درسیہ پر حواشی و تعلیقات ان سے یادگار ہیں۔ جبر و مقابلہ کے موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا۔

توضیحِ مطالب میں ان کی بہت شہرت تھی۔ طالب علم اور سائل کے سامنے اس اسلوب سے بات کرتے کہ تمام مطالب اچھی طرح اس کے ذہن کی گرفت میں آجاتے۔

مفتی نور اللہ انصاری فرنگی محلی نے ۱۲۶۱ھ کو وفات پائی۔[۱۵۱]

۱۲۱ــــــ مولانا نور محمد سوتری

ہندوستان کا ضلع "حصار" آزادی سے قبل متحدہ پنجاب میں شامل تھا۔ آزادی کے بعد یہ مشرقی پنجاب میں آیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند نے اپنی انتظامی اور سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر مشرقی پنجاب کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ صوبہ "ہریانہ" کے نام سے موسوم ہوا، ایک "ہماچل پردیش" کے نام سے اور ایک مشرقی پنجاب کے نام سے۔ اس تقسیم کی رو سے ضلع حصار کو صوبہ ہریانہ

۱۵۱؎ نزہتہ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۷

میں شامل کر دیا گیا۔

اضلاع پنجاب میں ابتدا ہی سے حصار کا ضلع مال و دولت اور زراعت کے اعتبار سے پسماندہ ضلع تھا اور عام طور پر قحط کی زد میں رہتا تھا۔ بایں ہمہ اس کے بعض مقامات علمی اعتبار سے پُر ثروت تھے اور انھیں علما و فضلا اور صوفیا و اتقیا کے مساکن و مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ان مقامات میں حصار، سرسہ، ڈربی، رانیاں، جلال آباد اور روڑی کے بلاد و قصبات قابلِ ذکر ہیں۔

ضلع حصار کی تحصیل سرسہ میں ایک "ندی" تھی جو خاصی چوڑی اور گہری تھی۔ یہ ندّی عام طور پر خشک رہتی تھی۔ بارشوں کے موسم میں اگر کھل کر بارشیں ہوتیں تو ندی خوب بہتی اور کناروں سے اچھل پڑتی۔ وہاں کے لوگ اُسے "نالی" کہتے تھے۔ دراصل یہ دریائے گھاگرا تھا۔ اس کے اردگرد کے علاقے کو وہاں کی بولی میں سَوتر کہا جاتا تھا۔ وہیں تحصیل سرسہ میں ایک گاؤں "رانیاں" تھا۔

صاحبِ ترجمہ مولانا نور محمد ۱۱۹۶ھ (۸۲-۱۷۸۱ء) کو اسی گاؤں "رانیاں" میں پیدا ہوئے۔ ان کا تخلص نورؔ تھا اور انھیں "نور محمد نورؔ سوتری" کہا جاتا تھا۔ والد کا نام چوہدری جھنڈا تھا، جو بیہ برادری سے تعلق رکھتے تھے جو راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔

چوہدری جھنڈا اپنے دور کا مشہور ڈاکو اور راہزن تھا۔ اس کی عادت تھی کہ امیروں کا مال لُوٹ کر غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس لحاظ سے غریب اسے اچھا آدمی سمجھتے اور امیر سخت بُرا قرار دیتے تھے۔

اس کے بیٹے نور محمد کو بدوِ شعور ہی سے اس کام سے نفرت تھی اور وہ باپ کے اس کاروبار کو غلط قرار دیتے تھے۔ وہ آٹھ نو سال کے ہوتے تو مسجد میں جانا اور قرآن مجید پڑھنا شروع کر دیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں "رانیاں" کے امام مسجد سے حاصل کی اور باپ ان کی راہ میں نہ صرف یہ کہ مزاحم نہیں ہوا بلکہ اس نے بیٹے کی حوصلہ افزائی کی۔

نور محمد جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتے گئے، حصولِ علم کا شوق افزوں سے افزوں تر

ہوتا گیا۔ جب دیکھا کہ گاؤں اور اس کے جوار و نواح میں کوئی شخص اتنی قابلیت کا نہیں کہ انھیں مزید تعلیم دے سکے تو دہلی کا رُخ کیا اور وہاں کے مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کرنے لگے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں دسترس حاصل کی۔ دہلی سے بریلی گئے، وہاں کے بعض اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہ کیا، لیکن ان دونوں شہروں —— دہلی اور بریلی —— میں کن کن اساتذہ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں اور کن کن طلبا کے ساتھ مل کر پڑھیں؟ اس کا پتا نہیں چل سکا۔ اس میں البتہ کوئی شبہ نہیں کہ وہ معقولات و منقولات میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور نہایت ذہین اور فطین شخص تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کب فارغ التحصیل ہوئے اور کن بزرگوں سے سندِ فراغت حاصل کی —— اگر وہ بیس سال کی عمر میں بھی دہلی گئے ہوں تو ملک کی حکمرانی کے اعتبار سے وہ مغلوں کا دور تھا اور درس و تدریس کی زمامِ حکمرانی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزندانِ گرامی اور ان کے ارشد تلامذہ کے ہاتھ میں تھی۔ کوئی حتمی بات کہنا تو مشکل ہے لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ نور محمد نے ان بزرگوں سے استفادہ کیا ہوگا۔

علوم سے فراغ کے بعد وہ وطن واپس آئے اور ضلع حصار کے ایک گاؤں "ہیکیڑ" میں سکونت اختیار کی۔ وہیں سے انھوں نے وعظ و تبلیغ کی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اسی گاؤں یعنی ہیکیڑہی کے دورانِ قیام میں ان کی شادی ہوئی۔

وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور معروف ترین مبلغ تھے۔ اسی زبان کو انھوں نے وعظ و ارشاد اور اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ وہ توحیدِ الٰہی کی نشر و اشاعت میں بالخصوص بہت سخت تھے اور اس میں کسی کی پروا نہ کرتے۔ اس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں، ایک اساتذہ کا اثر اور دوسرے اپنے علاقے کا ماحول۔

ان کا زیادہ وقت تبلیغ و اشاعت میں گزرتا اور عام طور پر سفر میں رہتے تھے۔ نہایت متوکل علی اللہ تھے اور رضائے الٰہی ان کا شیوہ تھا۔ اس ضمن میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کافی عرصے کے بعد گھر لوٹے تو بیوی نے شکایت کی کہ گھر میں کھانے

پکانے کے لیے کچھ نہ تھا، اگر بھینس نہ ہوتی تو ہم بھوک سے مرجاتے۔ آپ کی غیر حاضری میں بھینس کے دودھ اور گھی کی فروخت سے گزربسر ہوتی رہی ——— بیوی کے یہ الفاظ سنتے ہی چھرا پکڑا اور بھینس ذبح کر ڈالی۔ فرمایا دینے والا تو اللہ ہے، تم نے بھینس پر بھروسا کیا، لو آج میں نے اسے ختم کر دیا۔

حق گوئی اور راست بازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حصار کا نواب آپ کے پاس آیا اور کہا "آپ لوگوں کو کافر قرار دیتے اور سخت زبان استعمال کرتے ہیں"

فرمایا "جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اور شریعت کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہو سکتا"

نواب نے پوچھا: "ایسا کون شخص ہے؟"

فرمایا: "تم ——!

بولا: "کیسے؟"

فرمایا "شریعت اسلامی نے بہ یک وقت چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں دی، لیکن تم نے چار سے زیادہ رکھ رکھی ہیں"

نواب خاموش ہو گیا، واپس آکر درباری علما سے پوچھا تو انھوں نے مولانا نور محمد کی تصدیق کی اور کہا "ہم نے آپ کے ڈر سے آپ کو صحیح مسئلہ نہیں بتایا"

نواب نے اسی وقت چار بیویوں کے علاوہ باقی سب کو کچھ روپے دے کر آزاد کر دیا ——— یہ ان کی حق گوئی اور زبان کی اثر آفرینی کی ایک مثال ہے۔

مولانا نور محمد نہایت متقی اور پرہیزگار تھے ——— کلمۂ حق ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، ہر مسئلہ کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کرتے اور اس ضمن میں کسی بڑے سے بڑے شخص کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیتے۔

ان کی ایک عادت یہ تھی کہ کیڑے مکوڑوں کو خوراک مہیا کرتے اور غربا و مساکین کی جہاں تک ممکن ہوتا امداد فرماتے۔

وہ پنجابی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی تمام کتابیں مسائل شرعیہ اور احکام فقہیہ

پر مشتمل ہیں۔ زبان و اسلوب کے اعتبار سے نہایت عمدہ کتابیں ہیں، جن میں ادبیت کی چاشنی بھی ہے اور بے پناہ روانی بھی۔ انھوں نے اٹھارہ کتابیں تصنیف کیں جو پنجابی نظم میں ہیں۔ ہمیں ان کی صرف چھ کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ شہبازِ شریعت :۔ یہ ان کی مشہور کتاب ہے جو سات ہزار سے زائد اشعار پر محیط ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۸۳۵ء میں مکمل کی۔ کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ اس کے مضامین و محتویات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پنجاب کے ممتاز عالم و فقیہ اور کتبِ کثیرہ کے مصنف حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر فارسی زبان میں حواشی تحریر کیے۔ حافظ صاحب مرحوم کی تصنیفات میں ابوابُ الصرف، انواعِ محمدی، احوال الآخرت اور زینت الاسلام وغیرہ کے علاوہ تفسیرِ محمدی بھی شامل ہے جو سات ضخیم جلدوں میں ہے اور پنجابی نظم میں ہے۔ پنجابی زبان میں قرآن مجید کی یہ پہلی تفسیر ہے۔

شہبازِ شریعت کے علاوہ مولانا نور محمد سونتری کی پانچ کتابیں یہ ہیں :۔

۲۔ آبِ حیات۔

۳۔ چراغِ شریعت۔

۴۔ خورشیدِ شریعت۔

۵۔ مفادِ شریعت۔

۶۔ خطباتِ عیدین۔

مولانا نور محمد سونتری کی موت اس طرح واقع ہوئی کہ عصر کی نماز پڑھ کر گھر آئے اور وفات پا گئے۔ اس وقت ان کی عمر اسّی برس کی تھی۔ مہینے کا تعین نہیں ہو سکا، البتہ سن وفات ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۲ء) کے لگ بھگ تھا۔

انھوں نے اٹھارہ کتابیں، چار بیٹے اور چار بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔[۵۱]

۵۱؎ پنجابی شاعراں دا تذکرہ، ص ۱۵۵، ۱۵۶

و

۱۲۲ ــــــ مفتی واجد علی بنارسی

تیرھویں صدی ہجری کے علمائے بنارس میں مفتی واجد علی بن ابراہیم بن عمر فاروقی بنارسی بہت بڑے شیخ، فاضل اور علامہ تھے، منطق و فلسفہ اور فقہ و کلام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ تھا۔ ان کے والد ابراہیم کا شمار بھی جیّد علما میں ہوتا تھا، لائق بیٹے نے باپ سے اور دیگر علمائے عصر سے کسبِ علم کیا اور مرتبۂ عالی پایا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد حکومتِ انگریزی کی طرف سے لکھنؤ کے منصبِ افتا پر فائز کیے گئے۔ یہ اہم خدمت نہایت حسن و خوبی سے انجام دی۔ پھر علاقہ بہار کے ایک شہر "بتیا" گئے اور اس نواح کے امیر نے ان کے علم و کمال کی وجہ سے ان کو بعض اُونچے مناصب پر متعین کیا۔

مفتی واجد علی یوں تو تمام علوم رسمیہ میں اُونچا مرتبہ رکھتے تھے لیکن فلسفہ و منطق میں اپنے اقران و معاصرین سے فائق تر گردانے جاتے تھے۔

درس و تدریس میں بھی اس نواح میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ الشفا، الافق المبین کی تدریس میں یگانۂ روزگار تھے۔ قدیم و جدید حواشی و تعلیقات پر عمیق نظر تھی اور نہایت محنت سے کتابیں پڑھاتے تھے۔ عمر بھر مصروفِ درس و افادہ رہے اور لاتعداد علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

اس عالمِ اجل اور فقیہ نامدار نے ۲۳ ربیع الاوّل ۱۲۷۶ھ کو جمعۃ المبارک کے دن وفات پائی [1]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۲۱ بحوالہ حیاتِ سابق۔

۱۲۳۔۔۔۔۔ سیّد وحید الحق پھلواروی

مولانا سید وحید الحق بن وجیہ الحق بن امان اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی کبار اساتذہ ہند میں سے تھے۔ صوبہ بہار کے شہر پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بعض کتب درسیہ اپنے والد گرامی مولانا وجیہ الحق سے پڑھیں اور مطوّلات کا درس اپنے ماموں شیخ مبین جعفری سے لیا جو پھلواری میں اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں سے تھے اور ۱۲۳۲ھ کو راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔

علوم معقول و منقول کی تحصیل سے فارغ ہوئے تو خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور طلبا کی بہت بڑی جماعت ان کے گرد جمع ہوگئی۔

بہت بڑے شیخ، صدق مقال و حسنِ اخلاق کے مالک، عمدہ خصال، شیریں کلام، عابد و زاہد اور متقی تھے۔ مشتبہات سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ حکومتِ انگریزی کے ملازموں اور خدمت گذاروں کے گھر کا کھانا نہ کھاتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں پیش پیش رہتے۔ محرم کے دنوں میں جو رسوم کی جاتی ہیں، اور عاشورہ کے موقعے پر جو کچھ پکایا اور کھلایا جاتا ہے، اس سے لوگوں کو سختی سے روکتے۔ کسی معاملے میں تصنع اور تکلّف کا اظہار نہ کرتے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے، فقرا کا لباس پہنتے اور چٹائی پر بیٹھتے۔ کسی سلسلے میں دوسروں کو تکلیف میں مبتلا نہ کرتے۔ ابتدا میں غنا سے متنفر تھے اور فقہائے احناف کی طرح اس قسم کی مجالس میں نہ جاتے۔ لیکن بعد میں جب وجد و حال کی کیفیّت طاری ہوگئی تو مجالس سماع میں حاضر ہونے لگے تھے۔

درس و افادہ ان کا اصل مشغلہ تھا، لاتعداد لوگوں نے ان سے تحصیل کی اور خلقِ کثیر نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔

تصنیف و تالیف کا بھی اعلیٰ ذوق تھا، کچھ کتابوں پر حواشی تحریر کیے اور بعض کتابیں تصنیف کیں۔

۱۔ حواشی ہدایۃ الفقہ
۲۔ قرۃ العاشقین فی حلیۃ سید المرسلین یعنی شرح شمائل ترمذی۔
۳۔ تعلیقات بر تفسیر بیضاوی۔
۴۔ زاد الآخرت۔
۵۔ شرح کلمہ طیبہ۔
۶۔ ذکر الصلوٰۃ۔
۷۔ رسالہ تحقیق الایمان۔

علاوہ ازیں بعض مسائل فقہ سے متعلق کچھ رسالے تحریر کیے۔

مولانا وحید الحق پھلواروی نے ۲۴ صفر ۱۲۰۱ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔[۲]

۱۲۴ ـــــ مولانا ولایت علی عظیم آبادی

عظیم آباد (پٹنہ) کے محلہ صادق پور کے اصحابِ علم اور اربابِ فضل نے اشاعتِ دین، تبلیغِ اسلام اور ترویجِ کتاب و سنت کے سلسلے میں جو تگ و تاز کی وہ تیرھویں صدی ہجری کے خطۂ ہند کی تاریخِ علما کا ایک درخشندہ باب ہے۔ غیر مسلم طاقتوں کے ساتھ جنگ و جہاد میں بھی ان کی عزیمت و استقلال کے نقوش صفحاتِ تاریخ میں ہر اعتبار سے اُبھرے ہوئے اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ مجاہدین کے عالی ہمت گروہ کے فردِ فرید تھے جو ددھیال اور ننھیال کی طرف سے نہایت باثر اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اپنے عہد کے شیخ و امام، عالم و محدث اور فقیہ و متکلم تھے۔ والد کا اسمِ گرامی مولانا فتح علی، دادا کا وارث علی اور پردادا کا محمد سعید تھا۔ نسباً ہاشمی تھے۔ عظیم آباد (پٹنہ) میں ان کے گھرانے کو امارت و ریاست

---

[۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۸۸ ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۲۳

کا درجہ حاصل تھا۔

مولانا ولایت علی کے اسلاف میں ایک بزرگ احمد علی تھے جو صوبہ بہار کے ضلع "گیا" کے ایک قصبے "اردل" کے قاضی تھے۔ اس خدمت کے صلے اور منصبِ قضا میں حسنِ کارکردگی کی بنا پر مغل بادشاہ کی طرف سے انھیں ایک بہت بڑی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ ولایت علی کے نانا، جن کی آغوشِ شفقت میں ان کی پرورش ہوئی، رفیع الدین حسن خاں تھے جو صوبہ بہار کے دولت مند اور باوجاہت رئیس تھے۔ وہ مغل حکمران کی طرف سے صوبہ بہار کے آخری گورنر تھے۔

ولایت علی اسی ماحول میں ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) کو پیدا ہوئے۔ شعور کی آنکھیں وا ہوئیں تو حصولِ علم کا آغاز اپنے شہر (عظیم آباد) کے اساتذہ سے کیا (عظیم آباد اس زمانے میں پٹنہ کو کہا جاتا تھا جو صوبہ بہار کا دارالحکومت ہے) جب مقامی اساتذہ سے اخذِ علم کر چکے تو مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ کا عزم کیا جو اس زمانے میں علوم کا گہوارہ اور علما کا مرکز تھا۔ وہاں مولانا محمد اشرف لکھنوی کا ہنگامۂ درس جاری تھا، ولایت علی اس میں شامل ہو گئے۔

ولایت علی چونکہ دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان کا طرزِ زندگی دوسرے طلبا سے مختلف تھا۔ امیرانہ ٹھاٹھ، عمدہ لباس اور تمام شرکائے درس سے ممتاز اسلوبِ حیات۔

سیّد احمد شہید سے پہلی ملاقات

ان کے دورِ طالب علمی میں امیر المجاہدین سیّد احمد شہید لکھنؤ گئے تو ان سے پہلی ملاقات وہیں ہوئی اور گفتگو کا سلسلہ چلا تو فوراً ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ چند روز میں ظاہر و باطن کی کیفیت بدل گئی اور اسی قالب میں ڈھل گئے جس میں سیّد صاحب کے متعلقین و معتقدین ڈھلے ہوئے تھے۔ سیّد صاحب کے ہم رکاب ہو کر رائے بریلی کا قصد کیا اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی سے ربط و ضبط پیدا ہوا۔ ان سے بعض درسی کتابیں بھی پڑھنا شروع کیں۔ عبادتِ الٰہی اور تعلیم

کے بعد جو وقت بچتا وہ ساتھیوں کی خدمت گزاری میں بسر ہونے لگا اور رئیسانہ انداز حیات کو ترک کر کے، درویشانہ اور فقیرانہ زندگی اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے لگے۔ کسی چھوٹے سے چھوٹے کام میں کوئی عار محسوس نہ کرتے۔

ایک عجیب و غریب واقعہ

تذکرۂ صادقہ میں جس کا ایک نام "الدار المنثور" ہے، اس سلسلے کا یہ عجیب و غریب واقعہ مرقوم ہے کہ جب مولانا ولایت علی کے والد ماجد مولانا فتح علی کو پتا چلا کہ ان کا بیٹا سید احمد بریلوی کے ساتھ رائے بریلی چلا گیا ہے تو اس کے لیے ایک ملازم کے ہاتھ چار سو روپے اور کچھ کپڑے بھیجے۔ اس زمانے میں سید صاحب مہمانوں کے لیے ایک مہمان خانہ تعمیر کر رہے تھے۔ تمام عقیدت مند اور خود سید صاحب مہمان خانے کی تعمیر میں مصروف تھے اور مختلف کام کر رہے تھے۔ مولانا ولایت علی ان بزرگوں میں شامل تھے جن کے ذمے گارا تیار کرنا تھا یہ ملازم رائے بریلی پہنچا اور سید صاحب کے ہاں گیا تو مولانا ولایت علی نے ایک موٹا سا کالے رنگ کا تہمند پہن رکھا تھا اور تمام جسم گارے میں لتھڑا ہوا تھا۔ ملازم نے خود انھی سے پوچھا کہ "مولانا ولایت علی کہاں ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "میں ہی ولایت علی ہوں۔" وہ انھیں پہچان نہ سکا بلکہ اظہار خفگی کیا کہ ایک پردیسی کے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ مولانا اس سے باتیں کر رہے ہیں اور اسے یقین دلا رہے ہیں کہ میں ہی ولایت علی ہوں، لیکن وہ نہیں مانا۔ بالآخر انھوں نے کہا کہ اگر میری بات تمھیں صحیح معلوم نہیں ہوتی تو کسی اور سے پوچھ لو کہ میں کون ہوں۔ جب لوگوں نے یقین دلایا کہ عظیم آباد کا رئیس زادہ یہی ہے تو ملازم نادم بھی ہوا اور سخت حیران بھی ——— اس نے مولانا کو گلے لگا لیا، معافی مانگی اور ان کی حالت دیکھ کر رونے لگا۔ باپ کے بھیجے ہوئے روپے اور کپڑے ان کی خدمت میں پیش کیے تو انھوں نے پکڑ کر اسی طرح دونوں چیزیں سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں[۳۹]۔

---

[۳۹] تذکرہ صادقہ، ص ۱۱۲۔

تبلیغِ دین اور وعظ وارشاد

کچھ عرصہ رائے بریلی گزارنے کے بعد مولانا ولایت علی وطن گئے تو اپنے آپ کو تبلیغِ دین اور وعظ وارشاد کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی شب روز کی کوششوں سے ان کے خاندان کے تمام افراد اور اعزہ واقربا سید صاحب کے حلقۂ بیعت و ارادت میں داخل ہو گئے، جن میں ان کے والد مولانا فتح علی اور بھائی مولانا عنایت علی، مولانا طالب علی اور مولانا فرحت حسین شامل ہیں۔ باقی اعزہ واقربا میں سے مولانا شاہ محمد حسین، مولوی الٰہی بخش، مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی، مولانا فیاض علی، مولوی قمر الدین، مولوی باقر علی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ غرض ان کے متعلقین میں سے تمام لوگ سید سے وابستہ ہو گئے اور ان کی عقیدت وارادت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لیا۔ پھر ان حضرات نے تحریک مجاہدین اور تحریک وہابیت میں جو قربانیاں دیں اور جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اس موضوع کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔ ان حضرات میں سے بعض کے کارنامے "فقہائے پاک وہند تیرھویں صدی ہجری" کی جلد اوّل میں اور بعض کے "فقہائے پاک وہند تیرھویں صدی ہجری" کی جلد دوم کے مقدمے میں بیان کیے جا چکے ہیں اور بعض کے زیرِ مطالعہ کتاب میں مرقوم ہیں۔

خدماتِ دینی کی وُسعت

مولانا ولایت علی کی خدماتِ دینی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ابتدا میں سید احمد شہید کے ساتھ ہجرت کر کے بغرضِ جہاد سرحد گئے، لیکن سید صاحب نے ان کو اس لیے واپس بھیج دیا کہ حیدر آباد (دکن) جا کر دعوت وتبلیغ کی خدمت انجام دیں۔ اس نواح میں وہ تقریباً چار سال رہے اور خوب کام کیا۔ کچھ عرصہ بعد بالاکوٹ کا واقعہ پیش آیا اور سید صاحب اور ان کے رفقا جامِ شہادت نوش کر گئے۔ انھی دنوں مولانا ولایت علی کے والد مولانا فتح علی کا انتقال ہو گیا۔ پھر وہ مختلف مقامات سے ہوتے اور فریضۂ تبلیغ انجام دیتے ہوئے

عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے۔ کچھ مدت وہاں رہے۔ اس کے بعد بہار، بنگال، اڑیسہ اور الٰہ آباد میں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم کیا۔ طریقِ تبلیغ یہ تھا کہ مولانا خود اور ان کے مقرر کیے ہوئے داعی ایک ایک قریے اور ایک ایک گاؤں میں جاتے مسلمانوں کو پابندِ شریعت بناتے مسجدیں آباد کرتے اور ارشاد و ہدایت کا مستقل سلسلہ جاری کر دیتے۔[۵۴]

تذکرۂ صادقہ میں اس ضمن میں بتایا گیا ہے۔

"اشاعتِ دین میں آپ کی اَن تھک کوشش غرب و شرق، شمال و جنوب کل کو محیط تھی۔ مجمعوں اور میلوں (مثلاً بہار کا چراغاں) میں بھی بغرضِ تبلیغ و پند پہنچتے اور نوروانوں کو کرگاہ میں جاکر اور کسانوں کو ان کے کھیتوں پر پہنچ کر اللہ کی اطاعت و بندگی کی ترغیب دیتے اور ان کی بدزبانی اور غیظ و غضب کو شربت کی طرح نوش کر جاتے۔ آپ اپنے دوروں میں قریہ قریہ فروکش ہوتے جاتے اور اللہ کی باتیں پہنچاتے جاتے، اسی لیے اپنی قیام گاہ تک پہنچنے میں مہینوں اور برسوں کی آپ کو دیر لگتی۔[۵۵]"

تعلیم و تدریس

قیامِ وطن کے دوران میں باقاعدہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا اور ظہر سے عصر تک لوگوں کو قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ تذکرہ صادقہ میں مرقوم ہے۔

"مولوی عبداللہ آپ کے خلفِ اکبر قاری ہوتے۔ دوسرے علما ایک ایک تفسیر ہاتھ میں لے کر بیٹھتے۔ علما کے علاوہ مریدوں کی بڑی بھاری صف ہوتی۔ قرآنِ مجید اور بلوغ المرام کا لفظی ترجمہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے تاکہ لوگ اللہ کی مرضی اور غیر مرضی (یعنی امر و نہی) سے آگاہ ہو جائیں۔ اَن پڑھ بھی نمازوں میں اپنے پڑھنے کی سورتوں اور

---

۵۴ سرگزشتِ مجاہدین، ص ۲۲۸

۵۵ تذکرہ صادقہ، ص ۱۶

دُعاؤں کے معانی اور مطالب سے خوب آگاہ ہوتے ہیں[۶]"

یہ بھی منقول ہے کہ جب وطن میں اقامت گزیں ہوتے تو ہر منگل کے دن نمازِ مغرب کے بعد اپنے گھر میں وعظ کہتے۔ ایک جانب پانچ چھ سو عورتیں جمع ہوتیں، دوسری جانب پانچ چھ ہزار مرد — وعظ میں بہت تاثیر تھی، جو سنتا اس کی قلبی حالت بدل جاتی۔

وعظ کی اثر انگیزی

ان کا وعظ نہایت مؤثر اور پُر تاثیر ہوتا تھا۔ جو بات کہتے دل کی گہرائیوں میں اُترتی جاتی۔ ان کے مواعظ حسنہ سے بے شمار لوگوں نے بدعات و محدثات سے توبہ کی اور کتاب و سنّت پر عامل ہوئے۔ اس عالم باعمل کے مواعظ کی اثر آفرینی کے بارے میں سیّد نواب صدیق حسن خاں تحریر فرماتے ہیں۔

"مولوی ولایت علی قنوّج میں تشریف لائے۔ میرے مکان پر آئے۔ اپنے اہلِ بیت کو واسطے ملاقات والدہ مرحومہ کے بھیجا۔ جامع مسجد قنوّج میں چند جمعہ تک وعظ کہا۔ مجھ سے کہہ گئے کہ تم کتاب "بلوغ المرام" ضرور پڑھنا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا ہوں گا — جو اثر سریع میں نے وعظ مولوی ولایت علی مرحوم میں پایا، کسی کے وعظ میں دیکھا نہ سُنا۔ ان کے پاس بیٹھنے سے دل دنیا سے بالکل سرد ہو جاتا تھا اور دین کا جوش تہِ دل سے اُٹھتا تھا[۷]"

کتبِ دینیہ کی اشاعت کا اہتمام

مولانا ولایت علی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ تبلیغ و دعوتِ دین میں گزرتا تھا انھوں نے وعظ و تقریر کو بھی اپنا معمول ٹھہرایا اور کتبِ دینیہ کی طباعت و اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔ اس کے لیے شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کا ترجمۂ قرآن اور رشاد

۶۔ تذکرہ صادقہ، ص ۱۶۔

۷۔ القاء المنن، ص ۱۲۔

شاہ محمد اسحاق دہلوی اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی کے رسائل منگوائے اور انھیں لکھنؤ کے مطبع حسینی سے چھپوانے کی کوشش کی، وہاں یہ نہ چھپ سکے تو اپنے خلیفہ مولوی بدیع الزمان بردوانی کو اس اہم اور بنیادی کام کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ مولوی صاحب ممدوح نے دس ہزار روپے میں ٹائپ کا پریس خریدا اور بہت سی دینی کتابیں اس میں چھاپ کر شائع کیں۔[۵]

حج بیت اللہ

مولانا نے حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل کیا۔ بنگال کا دورہ کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ پھر بہار میں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شہر سورج گڑھ گئے، وہاں وعظ و نصیحت کی، جس میں سید نذیر حسین بھی شامل ہوئے اور ان کے مواعظ سے بہت متاثر ہوئے۔ بعد ازاں اہل و عیال سمیت کلکتے سے بذریعہ جہاز بمبئی پہنچے۔ دو مہینے وہاں قیام رہا۔ پھر حجاز تشریف لے گئے اور حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ وہاں مشہور محدث شیخ عبداللہ سراج سے سندِ حدیث حاصل کی۔ شیخ موصوف نے سند دے کر فرمایا، "مولانا ولایت علی نے حدیث کے الفاظ کی سند مجھ سے لی اور معانی کی سند میں نے ان سے حاصل کی۔"

حج کے بعد وہ نجد، عسیر اور یمن گئے اور قاضی محمد بن علی شوکانی سے ملے اور ان سے سندِ حدیث لی۔ اسی اثنا میں حضرموت، مخا، حدیدہ، مسقط اور سوڈان کے شہر سواکن کا سفر کیا۔ پھر بذریعہ جہاز کلکتے آئے اور وارد وطن ہوئے۔

چھوٹے بھائی کا کردار

مولانا ولایت علی کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی تھے۔ وہ بھی سید احمد شہید سے بیعت تھے۔ وعظ و تبلیغ اور اشاعتِ دین کے بارے میں ان کا کردار بھی بہت اونچا تھا۔ وہ بھی علاقہ سرحد میں سید صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے گئے

---

[۵] تذکرہ صادقہ ص ۱۶۔

تھے، انھیں بھی سیّد صاحب نے بنگال میں دعوت کے لیے مامور کر دیا تھا۔ان کا مرکزِ دعوت ضلع جیسور میں موضع "حاکم پور" تھا۔ بہت سے لوگ ان کے معاون و مددگار رہتے۔جیسور، ندیا، فرید پور، راج شاہی، مالدہ اور بوگرا کے علاقے ان کی تبلیغی تگ و تاز کے خاص مراکز تھے اور ان علاقوں کے بے شمار لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

سیّد صاحب کی شہادت کے بعد بھی انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔پھر وہ اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی کی ہدایات کے مطابق یہ خدمتِ دینی سرانجام دینے لگے۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جہاں جاتے، پہلے یہ دیکھتے کہ مسجد ہے یا نہیں، اگر ہوتی تو کسی مناسب آدمی کو امام مقرر کر دیتے، اگر نہ ہوتی تو مسجد تعمیر کرا دیتے۔اس طرح انھوں نے بہت سی مسجدیں آباد کیں اور تعمیر کرائیں۔اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ امام مسجد کا کام صرف نمازیں پڑھانا اور دینی کتابیں پڑھانا ہی نہ تھا، بلکہ اپنے علاقے کے نزاعی معاملات کے فیصلے کرنا بھی اس کے ذمے تھا۔سیّد صاحب اور ان کے اصحابِ عقیدت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انگریزوں کی عدالتوں میں نہیں جانا چاہیے، اس سے دل سیاہ ہو جاتے ہیں اور ایمان کمزور پڑ جاتا ہے۔

سکھوں کی باہمی کشمکش

مولانا ولایت علی اور عنایت علی بنگال میں سرگرم دعوت و تبلیغ بھی تھے اور ساتھ ہی ان علاقوں سے مجاہدین بھی تیار کر رہے تھے، اس لیے کہ ان کا اصل مقصد سرحد کے مرکزِ مجاہدین میں جا کر سکھوں سے جہاد کرنا تھا۔اس ضمن میں وہ موقع کی تلاش میں تھے کہ جیسے ہی حالات سازگار ہوں، سلسلۂ جہاد شروع کر دیا جائے۔چنانچہ وقت نے پلٹا کھایا اور حالات سازگار ہوئے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ رنجیت سنگھ نے تقریباً چالیس برس پورے پنجاب اور سرحد کے بعض علاقوں میں حکومت کی۔۱۸۳۹ء میں اس

کی موت واقع ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا کھڑک سنگھ تھا جو بالکل نا اہل تھا۔ باپ کی موت کے بعد وہ تخت نشین ہوا، لیکن ڈیڑھ سال بعد مر گیا۔ اس کا بیٹا نونہال سنگھ تھا جو اسی دن ایک حادثے کی نذر ہو گیا، جس دن اس کا باپ کھڑک سنگھ مرا تھا۔ رنجیت سنگھ کے خاندان میں نونہال سنگھ سب سے قابل آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد جنوری ۱۸۴۱ء میں رنجیت سنگھ کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ نے مسندِ حکومت سنبھالی۔ یہ ستمبر ۱۸۴۳ء میں اجیت سنگھ سندھاں والیہ کے ہاتھوں قتل ہوا، اس کے نو عمر بیٹے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ـــــ یہ وہ زمانہ تھا جب سکھوں کے مختلف گروہ ایک دوسرے کو دھڑا دھڑ قتل کر رہے تھے اور سکھ حکومت کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ بالآخر ۱۸۴۳ء میں رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے دلیپ سنگھ کو گدی پر بٹھایا گیا جو اس وقت صرف چھ سال کا بچّہ تھا۔ کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے ایک کونسل بنا دی گئی تھی ـــــ لیکن اس کے باوجود سکھوں کی باہمی کش مکش اور لڑائیوں کا سلسلہ بند نہ ہوا ـــــ سکھوں کی آپس کی لڑائیوں کو روکنے کے لیے ان کے بعض سرکردہ لوگوں نے انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی تاکہ توجہ اُدھر مبذول ہو جائے۔ انگریزوں سے انھوں نے پے در پے شکستیں کھائیں اور آخر صلح پر مجبور ہو گئے۔ انگریزوں کو پنجاب کے بہت سے علاقے بھی دیے اور تاوانِ جنگ بھی ادا کیا۔

اس اثنا میں انگریزوں نے پورا کشمیر اور ہزارے کا بالائی حصّہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا، جس نے سکھوں اور انگریزوں کی جنگ میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا اور اسے انگریزوں کا ہمدرد سمجھا جاتا تھا۔

اس کے بعد انگریزوں اور سکھوں کی ایک اور جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں سکھوں کے باقی ماندہ علاقوں پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور سکھوں کی عمل داری کے نقوش صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ـــــ ہندوستان کے بعض علاقوں پر یہ سکھوں کی پہلی اور آخری حکومت تھی جو رنجیت سنگھ کی موت کے بعد ان کی باہمی

خوں ریزیوں کی وجہ سے چند سالوں میں ختم ہو گئی۔

سکھوں کے خلاف ہنگامے

جب سکھ حکومت کے مرکز پنجاب میں ان کو پے در پے شکست ہونے لگی اور آپس کی لڑائیوں نے ان کو کمزور کر دیا تو سرحدی علاقوں میں بھی ان کے خلاف ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہزارہ اور کاغان میں بالخصوص ان کی مخالفت میں شدت پیدا ہوئی۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں کے باشندوں پر سکھوں نے اپنے دورِ حکمرانی میں سخت مظالم ڈھائے تھے اور ان کو ہر اعتبار سے مبتلائے اذیت کیے رکھا تھا۔ اب سکھوں کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی پڑی تو انھوں نے عَلمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اور سرحد کے مختلف بلاد و قصبات کے رئیس اور بااثر لوگ میدانِ عمل میں نکل آئے۔ اس سلسلے کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ مسلمان موقعے کی تلاش میں تھے، جوں ہی اُنھیں موقع ملا، وہ سکھوں پر چڑھ دوڑے اور ان کے بعض عمال کا مقابلہ کر کے ان علاقوں سے مار بھگایا۔ بعض علاقوں میں مسلمانوں نے اپنے عامل اور سردار بھی مقرر کر لیے۔ ان آزاد کردہ مقامات کے سرداروں میں سے ایک بزرگ سید اکبر شاہ ستھانوی تھے۔

مولانا ولایت علی کو دعوت

ان منتخب اور مقرر کردہ رؤسا میں سے کچھ حضرات نے مولانا ولایت علی کو دعوت بھیجی کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور فضا سازگار ہے، آپ تشریف لائیں، جہاں کہیں سکھ موجود ہیں، اُن کے خلاف جہاد کریں اور ان کو یہاں سے نکال کر اسلامی حکومت کے قیام کے لیے کوشاں ہوں۔ مولانا ولایت علی اس وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں کا تبلیغی اور دعوتی دورہ کر رہے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی بنگال میں سرگرم دعوت و ارشاد تھے۔ مولانا ولایت علی نے سرحد کے رؤسا کا پیغام سنتے ہی مولانا عنایت علی کو اطلاع بھیجی، انھیں سرحد کی صورتِ حال سے باخبر کیا اور کہلا بھیجا کہ وہ سرحد جائیں اور

وہاں جا کر سلسلۂ جہاد کا آغاز کریں۔ وہ بھائی کا پیغام ملتے ہی دو ہزار مجاہدین کے ساتھ اپنے گھر عظیم آباد پہنچے۔ اس سے انگریزی حکومت کے ہندوستانی کارکنوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت مولانا ولایت علی بھی عظیم آباد میں تھے۔ انھوں نے مصلحت و احتیاط کے پیشِ نظر دو ہزار مجاہدین کی یہ جمعیت منتشر کر دی اور پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کی ٹولیاں بنا کر انھیں سرحد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کو سرحد روانہ کرنے کا آغاز جمادی الاخریٰ ۱۲۵۹ھ (جولائی ۱۸۴۳ء) سے ہوا جو کچھ عرصہ جاری رہا۔ یہ لوگ ٹولیوں کی صورت میں "پکھلی" پہنچے جو نواح ہزارہ میں واقع ہے ان کے سرکردہ اور معروف حضرات میں سے مولانا عنایت علی، مولانا ولایت علی کے بیٹے مولانا عبداللہ، میر اولاد علی سورج گڑھی، مولوی مقصود علی، مولوی کرم علی اور مولوی زین العابدین قابلِ ذکر ہیں۔

بالاکوٹ پر قبضہ

ان ہندی مجاہدین نے وہاں پہنچتے ہی مقامی لوگوں سے رابطہ پیدا کیا جو پہلے سے ان کے انتظار میں تھے اور جن کی دعوت پر یہ وہاں پہنچے تھے۔ سب نے مل کر جہاد شروع کر دیا، کاغان اور ہزارہ کے مختلف علاقوں کے لوگ ان کے معاون اور رفیقِ جہاد تھے۔ مجاہدین نے اس قدر شدید حملے کیے کہ شنکیاری، بیر کھنڈ، گڑھی حبیب اللہ خاں اور اگرور کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور ان کے محافظ دستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ان فتوحات کا دائرہ یہاں تک پھیلا کہ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) میں مجاہدین بالاکوٹ پر قابض ہو گئے اور اسی مقام پر انھوں نے مولانا عنایت علی عظیم آبادی کو اپنا باقاعدہ امیرِ جہاد بنا لیا۔ بالاکوٹ کے آس پاس کے علاقوں کو بھی سکھوں کے قبضے سے آزاد کرانے کا عہد کیا اور اس کے لیے زبردست جہاد کا آغاز کر دیا گیا۔۔۔۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد بریلوی، مولانا اسماعیل دہلوی اور ان کے بہت سے رفقا نے

سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے شہادت پائی تھی ، اس سے ساڑھے چودہ سال بعد اسی میدان میں مجاہدین نے سکھوں کو قتل کیا ، انھیں شکست دی اور ان کے مقبوضہ علاقے پر قابض ہوئے ۔

سکھوں کے علاوہ کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں نے بھی مسلمانوں کو نشانۂ ستم بنایا تھا اور اب وہ کئی مسلمان علاقوں پر تسلط جمانے کی فکر میں تھے ۔ مجاہدین نے ان سب کا مقابلہ ضروری سمجھا اور سب کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا ۔ مسلمانوں نے تمام اہم مقامات پر سکھوں سے جنگ لڑی اور جنگی نوعیت کے ہر علاقے میں انھیں ہزیمت سے دوچار کیا ۔ گڑھی حبیب اللہ کو مسخر کیا ، مظفر آباد پر یورش کی ، فتح گڑھ میں ان سے برسرِ پیکار ہوئے ، غرض ہر جگہ ان پر تلوار اٹھائی اور انھیں اس درجے سراسیمگی اور پریشانی میں مبتلا کر دیا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ کہیں بھی جم کر مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکے ۔

مسلمانوں کا نظم و نسق

سکھوں کے جو علاقے مجاہدین نے فتح کیے ان میں خالص اسلامی نوعیت کا نظام قائم کیا ، حدود و احتساب کا سلسلہ شروع کیا ، انسدادِ جرائم کو اوّلین حیثیت دی ، نماز باجماعت کی پابندی عاید کی ۔ جو شخص کسی عذرِ شرعی کے بغیر باجماعت نماز ادا نہ کرتا اس سے جرمانہ وصول کیا جاتا ، عام لوگوں سے پانچ سیر غلّہ اور امیروں سے ایک روپیہ فی کس لیا جاتا ــــ نمازِ جمعہ میں کوتاہی کرنے والوں کے لیے بھی سزائیں مقرر تھیں ۔ ڈاکوؤں کو قتل کی سزا دی جاتی ، جو لوگ شادی اور غمی کے مواقع پر غیر شرعی حرکات کے مرتکب ہوتے ، ان سے بھی جرمانہ لیا جاتا ، جگہ جگہ مفتی مقرر کر دیے گئے تھے ــــ بالاکوٹ میں خدمتِ افتا پر مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی مامور تھے ۔ درّۂ کہنار میں ملا میر اسد اخوندزادہ کو احتساب اور افتا کا کام سونپا گیا تھا ۔ ان کے ماتحت بہت سے علما مقرر تھے جو دیہات میں دورے کرتے اور بے نمازوں کو نماز کی تعلیم دیتے تھے ۔ محمد حی اخوندزادہ علاقۂ درّۂ کہنار کے قاضی

تھے۔ محمد حسین اتو منڈزادہ پکھلی میں وعظ و نصیحت کی خدمت انجام دینے پر مامور تھے۔[۹]

غرض اس مفتوحہ علاقے میں مسلمانوں نے باقاعدہ حکومت قائم کرلی تھی جو کتاب و سنّت کے مقرّر کیے ہوئے خطوط کے مطابق تھی۔ خراج وغیرہ کا نظام بھی جاری کردیا گیا تھا۔

مرکز کے تعلقات

اس حکومت کا مرکز فتح گڑھ تھا جو سکھوں سے جنگ کر کے بزورِ شمشیر فتح کیا گیا تھا۔ مولانا عنایت علی جو اس حکومت کے سربراہ تھے، فتح گڑھ میں اقامت گزیں تھے اور اس کا نام بدل کر اسلام گڑھ رکھ دیا گیا تھا۔ علاقے کے سرداروں اور خوانین کو مشیر مقرر کیا گیا تھا جن سے جہاد کے متعلق مشورے لیے جاتے تھے۔ کابل سے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد انگریزوں نے علاقۂ کشمیر سکھوں سے چھین کر گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کیا تھا، اس وقت سکھ حکومت کی طرف سے کشمیر کا گورنر نواب شیخ امام الدین تھا۔ وہ ایسا بہادر اور جرأت مند تھا کہ اس نے ابتدا میں گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ دینے سے انکار کردیا تھا اور مولانا عنایت علی عظیم آبادی سے خط و کتابت شروع کردی تھی۔

اس زمانے کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب مولانا غلام رسول مہر کو مولانا مسعود عالم ندوی نے دیا تھا جو انھوں نے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) سے حاصل کیا تھا۔ یہ مکتوب ۹ — ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ (۲۹ — اکتوبر ۱۸۴۶ء) کا مرقومہ ہے۔ اس میں محرم ۱۲۶۲ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) سے شوال ۱۲۶۲ھ (اکتوبر ۱۸۴۶ء) کے حالاتِ جہاد

---

[۹] سرگزشتِ مجاہدین، ص ۲۴۹

قلم بند کیے گئے ہیں ـــــ یہ مکتوب کسی مجاہد نے ہندوستان کے کسی شخص کو بھیجا تھا۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو کسی کتاب میں درج نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "سرگزشتِ مجاہدین" میں مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے واقعات و حالات کے ضمن میں اس مکتوب کے متعدد حوالے دیے ہیں۔ مکتوب میں بیان کیا گیا ہے:

صوبہ دار کشمیر شیخ امام الدین بہ کمال تمنا راہِ موافقت پیمودہ برائے ارسال خطوط جوڑی ہرکارہ مقرر نمودہ۔ چنانچہ در ہر ماہ دو سہ خط شیخ موصوف متضمن کلام محبّت و دوستی می رسند۔[۱]

یعنی کشمیر کے صوبے دار شیخ امام الدین نے اپنی دلی خواہش سے موافقت کا راستہ پیدا کیا اور ارسالِ خطوط کے لیے ہرکاروں کی جوڑی مقرر کر دی۔ چنانچہ ہر مہینے اس کی طرف سے دوستی اور محبّت کے دو تین خطوط آجاتے ہیں۔

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ نواب امام الدین جو کشمیر کا گورنر تھا، مولانا عنایت علی عظیم آبادی سے انتہائی عقیدت و احترام کا تعلق رکھتا تھا اور اس کا ان سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ بھی مرقوم ہے کہ مجاہدین نے نواں شہر کا قلعہ فتح کیا تو اس پر توپیں سر کی گئیں۔ شیخ نواب امام الدین کے پاس قاصد یہ خبر لے کر گیا تو اس نے قاصد کو بہت سا انعام دیا۔

فرماں روائے کابل امیر دوست محمد خاں اور اس کے بیٹے محمد اکبر خاں غازی سے بھی مولانا عنایت علی اور مجاہدین نے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ بلکہ مذکورہ غیر مطبوعہ مکتوب میں یہاں تک بتایا گیا ہے کہ کابل کے حکمران نے امداد و رفاقت کے عہد نامے لکھ بھیجے تھے۔

مولانا ولایت علی کی آمد

ان سازگار اور معاون حالات میں ۱۷۔ شوال ۱۲۶۲ھ (۹۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء)

---

[۱] بحوالہ سرگزشت مجاہدین، ص ۲۵۰۔

کو مولانا ولایت علی اچانک علاقہ مجاہدین میں تشریف لائے۔ اس غیر مطبوعہ مکتوب میں جس کا حوالہ گزشتہ سطور میں دیا گیا ہے، مولانا ولایت علی کی آمد کے بارے میں لکھا ہے:

مرشدنا و امیرنا مولوی ولایت علی صاحب ادام اللہ برکاتہ و انوارہ مع تمام اہل قافلہ و آلات و اسباب و خیل و دواب محض از فضل رب الارباب از میان ہجوم اعدا بہ عافیت تمام بہ حکومت اہل اسلام جلوہ افروز شدہ موجب حیرت خویش و بیگانہ و ظہور آیۂ حافظ یگانہ گشتند[۱۱]۔

یعنی ہمارے مرشد اور امیر مولوی ولایت علی صاحب (خدا ان کے برکات و انوار کو دوام بخشے) اہل قافلہ، ہتھیاروں، اسباب، گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ اہل اسلام کے دائرۂ حکومت میں جلوہ افروز ہوئے۔ یہ خدا کا فضل تھا کہ وہ دشمنوں کے ہجوم سے سلامت گزر آئے۔ اس پر اپنے اور بیگانے ہر ایک کو حیرت ہوئی اور اس واقعے کو حافظ حقیقی کے نشان کا ظہور سمجھا گیا۔

مولانا ولایت علی کا شاہانہ استقبال کیا گیا اور جہاں گئے ان کے اعزاز میں توپیں اور بندوقیں چلائی گئیں۔ مانسہرہ سے چند میل کے فاصلے پر مقام "اتر شیشہ" میں دونوں بھائیوں — مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی — کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت ہزاروں سپاہی اور مجاہد موجود تھے جو خوشی سے بندوقیں اور قرابینیں چلا رہے تھے۔ ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ دونوں بھائیوں کی ملاقات مشکل ہو گئی۔ آخر بڑی کوشش سے لوگوں کو دور ہٹایا گیا تو بھائیوں کی ملاقات کی صورت پیدا ہوئی۔ ملاقات کے موقعے پر دونوں بھائیوں اور لوگوں پر کیا کیفیت طاری ہوئی۔ اس کا ذکر غیر مطبوعہ مکتوب میں اس طرح کیا گیا ہے:

ہر دو برادر از فراغ معانقہ و مصافحہ باخود درمیان ہمیں میدان سر بہ زمین

---

[۱۱] سرگزشت مجاہدین، ص ۲۵۲

نہادہ نا دیر وظیفۂ شکر وسپاس رب العالمین بجا آوردند وتمامی لشکر بہ سجود رفت وحمد وثنائے آں واہب العطیات بسیار از بسیار گفتند[۱۲]

مصافحے اور معانقے کے بعد دونوں بھائی اسی میدان میں زمین پر پیشانی رکھ کر دیر تک جہانوں کے پروردگار کا فریضۂ شکر ادا کرتے رہے۔ تمام لشکر بھی سجدے میں گر گیا اور سب دیر تک خدا کی حمد وثنا کرتے رہے۔

اتر شیشہ میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس کے بعد دونوں بھائی اسلامی حکومت کے مرکز۔ اسلام گڑھ پہنچے۔ یہ شام کا وقت اور اتوار کا دن تھا۔ تاریخ ۱۹۔ شوال ۱۲۶۲ھ (۱۱ — اکتوبر ۱۸۴۶ء) تھی۔ یہاں بھی ان کا خوب استقبال ہوا۔

۲۴ — شوال ۱۲۶۲ھ (۱۶ — اکتوبر ۱۸۴۶ء) کو جمعے کا دن تھا کہ مولانا عنایت علی نے مجاہدین اور اسلامی حکومت کی امارت وسیادت کا تمام کاروبار مولانا ولایت علی کے سپرد کر دیا۔ مولانا ولایت علی کو اپنے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی کی محنت، مستعدی اور انتظام وانصرام کا پورا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس پر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس ضمن میں فارسی مکتوب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

درمجلسِ جمعہ بعد از گرفتنِ بیعتِ امارت بہ آواز بلند فرمودند کہ برادرِ خُرد را از طرفِ خود رئیس جملہ مجاہدین نمودم وانتظام کاروبار بہ دستورِ قدیم سپردم۔ برادرِ خُرد ساختم۔

یعنی جمعے کی مجلس میں بیعت کے بعد مولانا ولایت علی نے بلند آواز سے فرمایا کہ میں اپنی طرف سے چھوٹے بھائی کو مجاہدین کا سالار بناتا ہوں اور سب انتظامات سابقہ دستور کے مطابق ان کے حوالے کرتا ہوں۔

بہرحال مولانا ولایت علی کے سرحد پہنچتے ہی مولانا عنایت علی نے جہاد اور

---

[۱۲] سرگزشتِ مجاہدین، ص ۲۵۵۔

مجاہدین کے جملہ انتظامات ان کے حوالے کر دیے، معاملاتِ حکومت بھی انھی کے سپرد ہوئے اور مجاہدین نے ان کے ہاتھ پر بیعتِ امارت کر لی — یہ حضرات بالاکوٹ بھی گئے۔

کامیابی کے بعد ناکامی

مولانا ولایت علی کی سرحد آمد پر پورے تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ "درۂ دُبؔ" کی جنگ کا واقعہ پیش آگیا۔ مجاہدین کے لیے اس جنگ کا نتیجہ نہایت المناک نکلا۔ کئی سال کی بھاگ دوڑ اور جاں فشانی سے جو مرکز بنایا تھا وہ ختم ہو گیا اور قیام و سکونت کے لیے کوئی جگہ ان کے پاس باقی نہ رہی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی کامیابی کیوں اچانک ناکامی میں بدلی اور ہزارہ میں اُنھوں نے اسلامی حکومت کی جو تاسیس کی تھی وہ کس بنا پر آناً فاناً انہدام پذیر ہوئی —؟

صورتِ حال پر ایک نظر

اس کو سمجھنے کے لیے صورتِ حال پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

انگریزوں نے سکھوں سے پہلی جنگ کے بعد دوآبہ بست جالندھر لے لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سکھوں کی حکومت پر ڈیڑھ کروڑ روپے تاوانِ جنگ عائد کیا تھا۔ لاہور کے خزانے میں سکھوں کے پاس چونکہ اتنی بڑی رقم نہ تھی، لہٰذا فیصلہ ہوا کہ دریائے بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان کشمیر اور بالائی ہزارہ سمیت جو کوہستانی علاقے ہیں، وہ ایک کروڑ روپے کے معاوضے میں انگریزوں کے حوالے کر دیے جائیں۔ اس علاقے میں جو خطے دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب میں واقع تھے، وہ پچھتر لاکھ روپے میں گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیے گئے۔ ان میں جموں اور کشمیر کا علاقہ بھی شامل تھا اور بالائی ہزارہ کا بھی — جب سکھوں کی مرکزی حکومت میں کش مکش اور خلفشار اُبھرا اور انگریزوں سے جنگ شروع ہوئی تو اس زمانے میں علاقۂ ہزارہ میں سکھوں سے حصولِ آزادی کی دو زبردست تحریکیں شروع ہوئیں۔ ایک زیریں ہزارہ میں اور

ایک بالائی ہزارہ میں ۔ یہ دونوں تحریکیں کامیابی سے ہم کنار ہوئیں ۔ زیریں ہزارہ کا علاقہ سکھوں سے آزاد کرا یا گیا تو اس کا بادشاہ اکبر شاہ ستھانوی کو بنایا گیا، جس نے اس کے نظم ونسق کو بہترین طریقے سے چلانا شروع کیا ۔ بالائی ہزارہ کا علاقہ سکھوں سے چھینا گیا تو اس کے قائد و امیر مولانا عنایت علی عظیم آبادی کو مقرر کیا گیا۔ اس کی سرحدیں مانگلی سے شروع ہو کر مشرق میں مظفر آباد اور شمال میں کاغان تک چلی گئی تھیں ۔ یہ تمام علاقے مقامی خوانین اور مجاہدین کے قبضے میں تھے اور ان کا نظام حکومت نہایت کامیابی سے چل رہا تھا ۔

پیچیدگی

یہاں ایک عجیب وغریب پیچیدگی پیدا ہوئی جس میں تین فریق ملوّث تھے اور وہ تھے :

۱ ۔ انگریز۔

۲ ۔ سکھ ــــــ اور

۳ ۔ گلاب سنگھ ڈوگرہ ۔

اس نواح میں سکھوں کے پاس کوئی قابلِ ذکر علاقہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہزارے کا بالائی حصہ (جو انھوں نے ایک معاہدے کے تحت انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا اور انگریزوں نے اُسے کشمیر سمیت گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا) مجاہدین کے قبضے میں چلا گیا تھا اور اس کا نظم ونسق مولانا عنایت علی عظیم آبادی کے ہاتھ میں تھا ۔ زیریں حصّے پر مقامی خوانین قابض ہو چکے تھے اور ان کی حکومت قائم ہو گئی تھی، جس کا سربراہ سیّد اکبر شاہ ستھانوی کو بنا لیا گیا تھا ۔

گلاب سنگھ ڈوگرہ کی پوزیشن یہ تھی کہ اس نے پچھتّر لاکھ روپے ادا کیے لیکن اسے نہ کشمیر کا قبضہ ملا اور نہ بالائی ہزارہ اس کے ہاتھ آیا ۔ کشمیر کا قبضہ اسے شیخ نوّاب امام الدین دینے کو تیار نہ تھا جو سکھوں کی طرف سے کشمیر کا گورنر تھا اور ہزارے کے بالائی حصّے پر مجاہدین نے قبضہ کر لیا تھا ۔

اس کے حامی ہوں گے۔ اس نے انگریزوں کی بات ماننے سے تو انکار کر دیا لیکن اپنے دوست ملک فتح خاں ٹوانہ کے سامنے جھک گیا۔ اگر ملک مذکور بیچ میں نہ پڑتا اور قبضے کے سلسلے میں کوشاں نہ ہوتا تو اغلب ہے لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی اور کشمیر کی تاریخ شاید کچھ اور ہی رُخ اختیار کر لیتی ــــ ملک فتح خاں ٹوانہ پنجاب کے انگریزی عہد کے آخری وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کے دادا تھے۔

اُدھر ایبٹ صاحب کی کوششوں سے زیریں ہزارہ کے خوانین نے بھی اپنے مفتوحہ اور مقبوضہ علاقے سے دست کش ہونے کا فیصلہ کر لیا اور کچھ جاگیریں اور مراعات لے کر یہ علاقہ سکھوں کے حوالے کر دیا اور وہاں سکھوں کی حکومت بحال ہو گئی۔

اب مجاہدین تنہا میدان میں رہ گئے تھے جو بالائی ہزارہ پر قابض تھے اور جہاں کے امیر مولانا عنایت علی عظیم آبادی تھے۔ انگریز، سکھ اور گلاب سنگھ ڈوگرہ تو پہلے سے ان کے مخالف تھے، در پیش حالات میں اس علاقے کے سرکردہ لوگ اور خوانین بھی ظاہر ہے، ان کی زیادہ حمایت کرنے کی حیثیت میں نہ رہے تھے۔ یہ تھے وہ حالات و واقعات جن کے نتیجے میں مجاہدین شکست کھا گئے۔

درۂ دُبّ کی جنگ

درۂ دُبّ ایک مشہور درّہ ہے جو گڑھی حبیب اللہ خاں اور مظفر آباد کے درمیان پڑتا ہے۔ اس کی بلندی کم و بیش پانچ ہزار فٹ ہے۔ اس کے مشرق میں کچھ فاصلے پر پیر چناسی پہاڑ ہے جو دُبّ سے کافی بلند ہے۔ اسی پہاڑ کے جنوب مغربی دامن میں دریائے کشن گنگا کے کنارے مظفر آباد واقع ہے جو آزاد کشمیر کا دار الحکومت ہے۔ دُبّ کے شمال میں کوہ سری کوٹ ہے جس کی اونچائی سات ہزار فٹ سے بھی زیادہ ہے۔ پھر بالاکوٹ کے سامنے تک ایک پہاڑی سلسلہ چلا گیا ہے۔ موجودہ جغرافیائی لحاظ سے دُبّ صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ اور آزاد کشمیر کے ضلع مظفر آباد کی درمیانی حد پر واقع ہے۔

ان اہم معاملات کا تیسرا فریق انگریز تھا۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کے ہاتھ کشمیر فروخت کیا تھا اور انگریزوں نے ہی ہزارے کا بالائی حصہ اسے دیا تھا۔ علاوہ ازیں انگریزوں کا سکھوں سے معاہدہ بھی تھا کہ سرحد میں ان کے جو باقی مقبوضات ہیں وہ انہی کے پاس رہیں گے لیکن اب معاملہ بالکل اُلٹ ہو گیا تھا۔

یہ مسئلہ نہایت پیچیدگی اختیار کر گیا تھا اور مذکورہ تینوں فریق اس سے بہت پریشان تھے۔ بالآخر انگریز میدان میں آئے ایک طرف ایبٹ صاحب کو ہزارہ بھیجا گیا کہ وہ کسی طرح زیریں ہزارہ پر قابض خوانین اور ان کے معاونوں کو اس علاقے سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرے ۔۔۔ دوسری طرف ہنری لارنس جو دربارِ لاہور میں ریذیڈنٹ کے عہدے پر متمکّن تھا، خود فوج لے کر جمّوں پہنچا وہاں سے اس نے ہربرٹ ایڈورڈز کو کشمیر کے گورنر نواب شیخ امام الدین کے پاس بھیجا تاکہ براہِ راست گفتگو کر کے کشمیر کا قبضہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کو دیا جائے ہربرٹ ایڈورڈز کو معلوم تھا کہ ملک فتح خاں ٹوانہ ایک ایسا شخص ہے جو امام الدین کا جگری دوست ہے۔ چنانچہ اس نے ملک فتح خاں ٹوانہ کو ساتھ لیا اور کشمیر جا کر امام الدین سے گفتگو کی۔ امام الدین اپنے اس دوست کے سامنے جھک گیا اور اس کی کوششوں سے کشمیر کا قبضہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کو دے دیا[۱۳۱]۔ امام الدین نے یہ راز بھی فاش کر دیا کہ اس کو لاہور کے سکھ دربار نے ہدایت کی تھی کہ کشمیر کا علاقہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے حوالے نہ کیا جائے۔ اس کارروائی کا ذمے دار لال سنگھ وزیر تھا، جس کے خلاف لاہور میں مقدمہ چلا اور اسے وزارت سے علیحدہ کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔

بلاشبہ کشمیر کا گورنر شیخ نواب امام الدین جرأت مند اور جسور آدمی تھا، اس نے یوں ہی کشمیر کا قبضہ دینے سے انکار نہیں کیا ہو گا، کشمیر کی فوج اور عوام و خواص

۱۳۱ھ سرگزشتِ مجاہدین، ص ۲۵۸

جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں، اس میں انگریزوں کے ہاتھوں سکھوں کی شکست اور اس کے نتیجے میں کچھ علاقوں پر انگریزوں کے قبضے کے بعد دونوں فریقوں میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ جو علاقے سکھوں کے پاس ہیں وہ انہی کے قبضے میں رہیں گے۔ انگریز سکھوں کو فوجی تربیت دیں گے اور کسی سے لڑائی کے وقت ان کی مدد کریں گے۔ گلاب سنگھ ڈوگرہ کی امداد کا وعدہ بھی انگریزوں نے کر لیا تھا اور یہ طے پا گیا تھا کہ ہزارے کا بالائی علاقہ جو مجاہدین کے قبضے میں ہے، اسے فتح کر کے گلاب سنگھ کی تحویل میں دیا جائے گا۔

یہ ذہن میں رہے کہ اس وقت تین طاقتیں مجاہدین کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ انگریز، سکھ اور گلاب سنگھ ڈوگرہ — نواب شیخ امام الدین کو مجبور کرنے پر کشمیر گلاب سنگھ کے تسلط میں آگیا تھا اور وہاں کی فوج اس کے ہاتھ میں تھی۔

ان حالات میں سکھوں کی ایک فوج جو دس رجمنٹوں پر مشتمل تھی، سری نگر سے مظفر آباد کے راستے بالائی ہزارہ پہنچی تاکہ اس علاقے کو فتح کر لیا جائے۔ اس فوج کا کمان دار دیوان کرم چند تھا۔ انگریزی فوج اور اس کے بڑے بڑے افسر بھی اس کے ساتھ تھے۔ ۶۔ جنوری ۱۸۴۷ء کو درۂ دُبّ میں اس کا مقابلہ مجاہدین سے ہوا۔ مجاہدین کی تعداد بہت کم تھی اور اُدھر گلاب سنگھ ڈوگرہ اور سکھوں اور انگریزوں کا زبردست لشکر ان کے مقابلے میں کھڑا تھا۔ نتیجتاً مجاہدین کو شکست ہوئی اور حریف جیت گیا۔ جھڑپوں کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ لیکن حالات بالکل بدل چکے تھے اور مجاہدین کی کامیابی کی کوئی صورت نہ تھی۔ دشمن ہزارے کی تمام وادیوں پر قابض ہو چکا تھا۔

مولانا ولایت علی اور عنایت علی کے مچلکے

مجاہدین کے امیر مولانا عنایت علی تھے، ان کے بڑے بھائی مولانا ولایت علی بھی ان کے ساتھ تھے۔ انگریزی سرکار کی نگرانی میں دونوں بھائیوں کو اس علاقے سے

سے نکال کر ان کے وطن عظیم آباد روانہ کر دیا گیا اور دونوں سے دس دس ہزار روپے کے مچلکے لیے گئے۔ دو سال کے لیے انگریزی حکومت نے انھیں عظیم آباد (پٹنہ) میں پابند کر دیا اور حکم جاری کیا کہ اس مدّت کے اختتام سے پہلے وہ شہر سے باہر نہیں نکل سکتے۔

آزادی کے بعد مستقل ہجرت

دو سال بعد جولائی یا اگست ۱۸۴۹ء میں مچلکوں کی میعاد ختم ہوئی اور انھیں آزادی ملی۔ ۱۳ — شوال ۱۲۶۵ھ (یکم ستمبر ۱۸۴۹ء) کو مولانا ولایت علی مستقل طور پر وطن سے ہجرت کر کے سرحد روانہ ہو گئے۔ مولانا یحییٰ علی اور چند احباب ان کے ساتھ تھے۔ مولانا عنایت علی ان دنوں بنگال گئے ہوئے تھے، انھیں بھی پیغام بھیجا کہ سرحد پہنچ جائیں۔

دہلی میں قیام اور بادشاہ سے ملاقات

سرحد جاتے ہوئے مولانا ولایت علی مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے دہلی آئے تو مسجد فتح پوری کے قریب ایک مکان میں ٹھہرے۔ دہلی میں وعظ و نصیحت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مغلوں کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اس زمانے میں دہلی کا بادشاہ تھا۔ اس کی بیگم نوّاب زینت محل کے استاد مولوی امام علی اور معروف شاعر حکیم مومن خاں مومنؔ ان کے وعظوں میں شریک ہوتے رہے۔ مولوی امام علی نے ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ انھوں نے بیگم زینت محل اور بادشاہ سے مولانا کے تدین و تقویٰ اور وعظ کی اثر آفرینی کا ذکر کیا۔ بیگم اور بادشاہ نے دعوت نامہ بھیج کر مولانا کو قلعۂ معلّیٰ میں بُلایا۔ مولانا چھ سات آدمیوں کے ساتھ قلعے میں پہنچے۔ بادشاہ نے تخت سے اُتر کر لبِ فرش تک آپ کا استقبال کیا۔ مصافحہ و معانقہ کے بعد اپنے ساتھ بٹھایا، عطر اور پان سے تواضع کی۔ مولانا نے وعظ شروع کرتے وقت یہ آیت پڑھی جو سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۰ ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ...

(یعنی جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا، زینت و آرائش، تمہارے آپس میں فخر و ستائش اور مال و دولت کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب اور خواہش ہے........)

مولانا نے آیت پڑھی تو وزیر اعظم نے کان میں کہا کہ بادشاہ سلامت کے سامنے عذاب کے متعلق بیان کرنے کا دستور نہیں ـــــ لیکن مولانا نے اس کی پروا نہیں کی، اور بے جھجک عذاب قبر، ہنگامۂ حشر اور دوزخ کا بیان نہایت شدّ و مدّ اور موثر طریقے سے بیان کرتے رہے۔ اس سے بادشاہ، شہزادے، زینت محل اور تمام حاضرین مجلس بہ درجۂ غایت متاثر ہوئے اور زار و زار رونے لگے۔

وعظ کے بعد مولانا رخصت ہونے لگے تو بادشاہ کے حکم سے جملہ مکاناتِ شاہی اور موتی مسجد وغیرہ کی سیر کرائی گئی ـــــ قیام گاہ پر پہنچے تو پچاس خوان کھانوں کے مطبخ شاہی سے مولوی امام علی اور حکیم مومن خاں مومن کی معرفت بھیجے گئے۔[۱۴]

رمضان کا مہینہ قریب آگیا تھا اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی خواہش تھی کہ مولانا یہ مقدس مہینہ قلعۂ معلّٰی میں گزاریں تاکہ قلعے کے لوگ ان کے ساتھ نمازِ تراویح ادا کریں اور وعظ و نصیحت سنیں۔ لیکن ریذیڈنٹ نے مولانا کے متعلق کچھ ایسے انداز میں سوالات پوچھنا شروع کر دیے کہ رکاوٹ کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا، لہٰذا وہاں زیادہ عرصہ قیام کرنا مناسب نہ سمجھا گیا اور مولانا معذرت کر کے دہلی سے روانہ ہو گئے۔ جمنا پار پہنچے تو رمضان کا چاند دیکھا۔[۱۵]

تھانہ کو روانگی

دہلی سے مولانا تھانہ کو روانہ ہوئے۔ کھنہ یا لدھیانہ میں تھے کہ چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی بھی وہاں پہنچ گئے۔ یہ ۷۔ محرم ۱۲۶۷ھ (۱۲ ـــــ نومبر ۱۸۵۰ء) کی بات ہے۔ وہ مولانا ولایت علی کی روانگی سے تقریباً دس مہینے

---

[۱۴] تذکرہ صادقہ، ص ۱۲۶، ۱۲۷،

[۱۵] ایضاً، ص ۱۲۷،

بعد ۸ — شعبان ۱۲۶۶ھ (۱۹ — جون ۱۸۵۰ء) کو وطن سے روانہ ہوئے تھے۔ اس سے آگے ستھانہ تک کا سفر دونوں بھائیوں نے اکٹھے طے کیا۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں :—

اوکنلے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی ستھانہ پہنچ گئے اور ان کے بعض ساتھیوں کو کھبل[16] میں روکا گیا۔ آدمی نکل گئے، لیکن اونٹ روک لیے گئے، جن پر مال واسباب لدا تھا اور انھیں ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ انھیں بہ حفاظت مالکوں کو لوٹا دیا جائے[17]۔

مولانا صاحبان اور اُن کے ساتھی ۸ — ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ (۱۰ — فروری ۱۸۵۱ء) کو ستھانہ پہنچے۔

مولانا ولایت علی کے اہل وعیال آٹھ دن بعد ۱۶ —— ربیع الثانی (۱۸ — فروری) کو وارد ستھانہ ہوئے۔

ستھانہ پہنچنے کے بعد دونوں بھائیوں —— مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی —— میں طریق کار سے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے مولانا عنایت علی ستھانہ کی سکونت ترک کر کے منگل تھانہ چلے گئے تھے۔

تصنیف وتالیف

مولانا ولایت علی تصنیف وتالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا بیشتر وقت وعظ وتبلیغ، دعوت وارشاد اور تنظیم جہاد میں گزرتا تھا لیکن ان مشاغل ومصروفیات کے باوجود انھوں نے بعض رسائل بھی لکھے جو عربی، فارسی اور اُردو میں ہیں اور جنھیں ان کے بھتیجے مولانا عبدالرحیم نے مجموعۂ رسائلِ تسعہ میں شائع کر دیا ہے۔

۱ — رسالہ اربعین فی المہدیین :— عربی

---

[16] کھبل تربیلہ کے سامنے دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع ہے ستھانہ سے اس کا فاصلہ پانچ چھ میل ہے۔

[17] سرگزشتِ مجاہدین، ص ۲۷۳۔

رسالہ ردِّ شرک :۔ فارسی

رسالہ عمل بالحدیث :۔ فارسی

رسالہ تیسیر الصلوٰۃ :۔ اُردو

رسالہ شجرۂ باثمرہ :۔ اُردو

رسالہ تبیان الشرک :۔ اُردو

رسالۂ دعوت :۔ یہ رسالہ بھی اُردو میں ہے۔ مولانا ولایت علی کا یہ عقیدہ تھا کہ سیّد احمد بریلوی شہید نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے ہیں۔ اس رسالے میں یہ عقیدہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ صحیح نہ تھا۔ لیکن ہمیں ان کے محاسن ہی کو پیش نگاہ رکھنا چاہیے۔ ان کی لغزشوں اور کمزوریوں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے۔

وفات

ولایت علی نے سرحد پہنچ کر ستھانہ کو اپنا مرکز بنایا اور انتظامی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ پہلا تمام سلسلہ ختم ہو چکا تھا، دوسری مرتبہ لوگوں کو جمع کرنے اور مجاہدین کی جمعیت فراہم کرنے کا کام بہت مشکل اور صبر آزما تھا، لیکن مولانا ممدوح اس میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تھے۔ انھوں نے درسِ قرآن و حدیث کا حلقہ بھی قائم کیا، لوگوں کو مراقبہ و مشاہدہ کی بھی تلقین کرنے لگے اور فنِ سپاہ گری کی تعلیم بھی ضروری قرار دی۔

ان کو ستھانہ آئے اور اپنا کام شروع کیے بیس مہینے گذرے تھے کہ ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ (۵ — نومبر ۱۹۵۲ء) کو خناق کے عارضے سے وفات پا گئے اور اپنے مرکز کے قبرستان میں دفن ہوئے، کل چونسٹھ سال عمر پائی۔

تذکرۂ صادقہ کے مطابق ان کا حلیہ یہ تھا :۔

میانہ قامت مائل بہ طول، رنگ سانولا، جسم بلغمی اور پُر گوشت، ابرو پیوستہ، ڈاڑھی اوسط درجے کی۔

مولانا عنایت علی جو بعض امور میں مولانا ولایت علی سے اختلاف کی بنا پر منگل تھانہ چلے گئے تھے، بھائی کی وفات کے بعد مجاہدین کے مرکز ستھانہ آئے تو ۴ — صفر ۱۲۶۹ھ (۱۷ — نومبر ۱۸۵۲ء) کو سب نے متفقہ طور پر ان کو اپنا امیر بنا لیا۔

کشف قبور کے ایک ماہر کا بیان

مولانا غلام رسول مہر نے مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے بارے میں کشفِ قبور کے ایک ماہر کا واقعہ بیان کیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ مولانا مہر لکھتے ہیں:

مولانا سید عبدالجبار شاہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جب صوات کی سلطنت چھن گئی اور میں ستھانہ واپس آیا تو ایک صاحب ملنے کے لیے آئے، جنھیں کشفِ قبور میں مہارت حاصل تھی۔ میں انھیں مجاہدین کے قبرستان میں لے گیا اور مولانا ولایت علی کی قبر کے پاس بٹھا کر کہا کہ فرمائیے یہ کون صاحب ہیں اور ان کا حلیہ کیا ہے۔؟ وہ تقریباً آدھ گھنٹہ مراقب رہے، پھر اُٹھے تو مجھ سے کہا کہ آؤ چلیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ صاحبِ قبر نے ان کے دل پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ راستے میں مجھے بتایا کہ یہ بزرگ سرحد کے نہیں، ہندوستان کے ہیں اور ان کا درجہ بہت اونچا ہے۔ میں نے حلیہ پوچھا تو کہا کہ رنگ سانولا ہے اور ڈاڑھی کے بال رخساروں پر کم ہیں، ٹھوڑی پر زیادہ — غرض جو حلیہ بتایا، وہ مولانا کے فرزندانِ گرامی مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالکریم سے خاصا مشابہ تھا، لہٰذا یقین ہو گیا کہ صاحبِ کشف کا بیان درست ہے۔[۱۸۱]"

۱۲۵ — مفتی ولی اللہ فرخ آبادی

فرخ آباد (یوپی) کے اصحابِ علم میں سید مفتی ولی اللہ بن سید احمد علی حسینی

---

[۱۸۱] سرگزشتِ مجاہدین، ص، ۲۷۹، ۲۸۰۔

اپنے گرد و پیش میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ اعمالِ فرخ آباد میں ایک گاؤں کا نام "سانڈی" ہے، وہاں جمعے کے دن ۱۰۔ شوال ۱۱۶۵ھ کو پیدا ہوئے۔ صغر سنی ہی میں اپنے والدِ مکرم سید احمد علی کے ساتھ فرخ آباد چلے گئے تھے، اور وہاں کے علما سے کسبِ علم کا آغاز کیا۔ اس کے بعد قنوج گئے۔ قنوج میں مولانا عبدالباسط قنوجی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور تمام کتبِ درسیہ کی تکمیل انھی سے کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے ۱۱۸۹ھ کو حرمین شریفین کا عزم کیا اور حج و زیارت سے بہرہ یاب ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں شیخ احمد بن محمد سعید، ان کے والد شیخ محمد سعید صفر، مفتیٔ مکہ شیخ عبدالملک اور شیخ ابراہیم شافعی زبیری سے حدیث کا درس لیا اور قرأت و تجوید سیکھی۔ سات سال ارضِ حجاز میں رہے۔ ۱۱۹۶ھ کو ہندوستان تشریف لائے اور فرخ آباد میں سکونت اختیار کی۔ ۱۲۲۴ھ کو فرخ آباد میں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا، جس کا نام "فخر المران و ربع المفاخر" رکھا۔ اس میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور بے شمار علما و طلبا کو مستفید فرمایا۔ ۲۹۔ اگست ۱۸۰۵ء کو مفتی مقرر ہوئے۔ ۱۳۔ اکتوبر ۱۸۲۸ء تک اس عہدے پر متمکن رہے۔

مفتی ولی اللہ فرخ آبادی بہت بڑے مفتی اور فقیہ ہونے کے علاوہ ممتاز مصنف تھے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:۔

۱۔ شرح در دالتقرب۔

۲۔ حزب التوسل الی سید الانبیاء والرسل۔

۳۔ نظم الجواہر۔

۴۔ نضد الفرائد۔

۵۔ قرآن مجید کی تفسیر جو فارسی زبان میں ہے اور تین ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے۔ یہ تفسیر انھوں نے ۱۲۳۶ھ میں لکھی۔

۶۔ تاریخ فرخ آباد :۔ یہ ایک جلد میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

۷۔ المطر الثجاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج : صحیح مسلم کی شرح۔

سیّد مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے ۵ ــ رجب ۱۲۴۹ھ (۱۸ ــ نومبر ۱۸۳۲ء) کو وفات پائی، سوموار کا دن تھا۔[۱۹]

۱۲۶ ــــــ مولانا ولی اللہ فرنگی محلی

مولانا ولی اللہ بن حبیب اللہ انصاری فرنگی محلی لکھنوی، ممتاز و مشہور اساتذہ میں سے تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ گھر میں علم و عرفان کا دریا رواں تھا۔ اپنے والد ملّا حبیب اللہ انصاری اور عمِ محترم ملّا محمد مبین انصاری سے تحصیل کی اور طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ پھر خود غلغلۂ درس بلند کیا اور نہایت محنت و مستعدی سے پڑھانے لگے۔ اپنے زمانے میں لکھنؤ کی ریاستِ علمیہ کے مالک تھے۔

تصنیف و تالیف اور تشریح و تعلیقات کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات اور شروح و حواشی میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں :

۱۔ معدن الجواھر : قرآن مجید کی تفسیر۔

۲۔ نفائس الملکوت شرح مسلّم الثبوت : اصولِ فقہ سے متعلق۔

۳۔ حاشیہ علیٰ ھدایۃ الفقہ :

۴۔ حاشیہ بر عروۃ الوثقٰی : علم کلام کے بارے میں (از علامہ کمال الدین)

۵۔ حاشیہ بر شرح ھدایۃ الحکمت : از شیرازی، حکمت و فلسفہ کے متعلق۔

۶۔ تکملہ شرح سلّم : از ملّا حسن

۷۔ غایۃ العلوم و معارج الفھوم : اس کتاب کی بسیط شرح قلم بند کی۔

۱۹ے تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۲ ــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۲۶، ۵۲۷ ــــ حدائق الحنفیہ، ص ۴۷۱؛

۸۔ حاشیہ بر تذکرۃ المیزان۔

۹۔ حاشیہ بر میر زاہد ملا جلال۔

۱۰۔ حاشیہ بر میر زاہد شرح المواقف۔

۱۱۔ رسالہ فی مبحث التشکیک۔

۱۲۔ کشف الاسرار فی خصائص سید الابرار۔

۱۳۔ مرأۃ المؤمنین۔

۱۴۔ تنبیہ الغافلین فی مناقب آل سید المرسلین۔

۱۵۔ آداب السلاطین۔

۱۶۔ عمدۃ الوسائل۔

۱۷۔ الاغصان الاربعہ۔

فرنگی محل لکھنؤ کے اس عالم و فقیہ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں اور کئی اہم کتب درسیہ پر حواشی و تعلیقات قلم بند کیں۔

مولانا ولی اللہ انصاری فرنگی محلی نے ۱۰ صفر ۱۲۷۰ھ کو اٹھاسی سال کی عمر میں وفات پائی[20]۔

۱۲۷ —— مولانا ولی اللہ سورتی

ہندوستان کے صوبہ گجرات میں ایک شہر "سورت" ہے، جس کے علما و صلحا اور فقہا و متکلمین کا تذکرہ فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں متعدد مقامات پر کیا جا چکا ہے۔ ان میں تیرھویں صدی ہجری کے ایک عالم و فقیہ مولانا ولی اللہ سورتی تھے، جو غلام محمد سورتی کے فرزند نامدار تھے اور جن کا شمار اپنے دور کے

---

[20] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۲، ۲۵۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۲۷، ۵۲۸ — تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۹۷ تا ۲۰۰۔

مشاہیر فضلا میں ہوتا تھا۔

ولی اللہ کی ولادت و تربیت گجرات میں ہوئی۔ پھر جب ان کے والد مولانا غلام محمد گجرات سے برہان پور گئے اور وہاں کی مسندِ تدریس پر فائز ہوئے تو بیٹے کو بھی ساتھ لے گئے۔ لائق بیٹا سات برس تک باپ سے علم حاصل کرتا رہا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سوئے حرم مقدس روانہ ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مدینہ منورہ میں شیخ ابوالحسن سندھی درسِ حدیث دیتے تھے اور عرب وعجم کے بے شمار علما و طلبا ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ ولی اللہ سورتی بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے، ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور کبار علما اور نامور مشائخ میں گردانے گئے۔ ان کے والد مولانا غلام محمد نے ۱۱۴۹ء میں وفات پائی تو بیٹے نے قصدِ وطن کیا اور سورت میں سکونت اختیار کی۔ پھر تمام عمر سورت ہی میں رہے اور درس و افادہ کو اپنا مشغلہ قرار دے رکھا۔ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

مولانا ولی اللہ سورتی کے شب و روز تدریس میں گزرتے تھے، تصنیف کے لیے وقت نہ ملتا تھا۔ انھوں نے ایک ہی کتاب تصنیف کی جس کا نام "التنبیہات النبویہ فی سلوک الطریقۃ النبویہ" ہے۔ اس کتاب میں زہد و آداب اور اس سے ملتے جلتے ابواب جمع کر دیے ہیں، جن میں "مشکوٰۃ" قاضی عیاض کی "الشفا" اور امام ابن حجر قسطلانی کی "المواہب اللدنیہ" کا ملخص پیش کیا گیا ہے۔

سورت کے اس عالم و فقیہ اور نامور مدرس نے ۱۱۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۰۷ھ کو اس دنیائے فانی سے منہ موڑا۔ اور عالم جاودانی کی راہ لی۔ انھوں نے سورت میں وفات پائی اور وہیں محلہ سید پور میں دفن کیے گئے۔[۲۱]

---

[۲۱] تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۵۲ ——— نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۲۸؛

۱۲۸۔۔۔۔۔ حافظ ولی اللہ لاہوری

پاکستان کا شہر لاہور ہر عہد میں علم و علما کا مرکز اور فقہا و صلحا کا مسکن رہا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں یہاں جو اصحاب فضل اور ارباب کمال پیدا ہوئے، ان میں ایک بزرگ حافظ ولی اللہ لاہوری تھے۔ آپ شیخ و فاضل اور بہت بڑے فقیہ تھے۔ ان کے اساتذہ میں جو جلیل القدر عالم شامل ہیں، ان میں مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ) مولانا نور احمد کوٹلوی اور مولانا نور احمد بگوی کے اسمائے گرامی تذکرہ و رجال کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔

حافظ ولی اللہ لاہوری نہایت ذہین و فطین، قوی الحافظہ اور سریع الادراک عالم تھے۔ مخالفین اسلام سے مناظرہ و مباحثہ میں انتہائی تیز تھے۔ بہت موثر وعظ کہتے تھے، تقریر کرتے تو ان کی باتیں سامعین کے دل میں اترتی جاتیں۔ عیسائی پادریوں کو آڑے ہاتھوں لیتے، بہ درجۂ غایت شدت سے اسلام کی حمایت کرتے اور مضبوط دلائل سے پادریوں کے حملوں کا جواب دیتے۔ اس سلسلے میں بے حد جری اور غیور تھے۔

متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ صیانۃ الاسلام عن وسوسۃ الشیطان۔

۲۔ الابحاث الضروریہ۔

۳۔ المباحثۃ الدینیہ۔

لاہور اور قرب و جوار کے لوگ مسائلِ دینیہ میں ان سے رجوع کرتے اور ان کے فتوے کو لائقِ اعتنا ٹھہراتے۔

لاہور کے اس جید عالم و واعظ اور نامور فقیہ و مفتی نے ۲۴۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ کو جمعۃ المبارک کے دن بہ عارضہ اسہال وفات پائی۔[۲۲]

---

[۲۲] حدائق الحنفیہ ص ۴۹۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۲۹۔

ی

۱۲۹ ــــــ مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی

عظیم آباد (پٹنہ) کے متعدد علما و فقہا کے حالات و سوانح "فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری" کی جلد دوم کے مقدمے میں بیان ہو چکے ہیں۔ زیر تصنیف کتاب کے بھی گزشتہ صفحات میں بعض بزرگوں کے احوال و کوائف معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔

ان حضراتِ عالی مقام میں ایک عالمِ دین مولانا یحییٰ علی تھے، جن کے والد کا نام الٰہی بخش اور دادا کا ہدایت علی جعفری تھا۔ یہ حضرات عظیم آباد کے محلہ صادق پور میں سکونت پذیر تھے، اس لیے "صادق پوری" کی نسبت سے مشہور تھے۔ یہ محلہ کئی علمی خاندانوں کا مرکز اور اصحابِ فضل کا مسکن تھا۔

مولانا یحییٰ علی اسی محلے میں ۱۲۳۷ھ کو پیدا ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ عظیم آبادی اور مولانا ولایت علی سے اکتسابِ علم کیا۔ تصوّف و سلوک سے گہرا لگاؤ تھا، یہ فیض بھی مولانا ولایت علی سے حاصل کیا اور انہی سے سندِ حدیث لی ــــ پھر بہت بڑے عالم، محدث و فقیہ اور شیخ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ درس و تدریس اور ذکر و تذکیر کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ حدیث و فقہ اور دیگر علوم مروّجہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، مسائلِ دینیہ کے استخراج و استنباط میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا، معاملاتِ وراثت کے تمام گوشوں میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔

ان کے اُستاذ و شیخ مولانا ولایت علی عظیم آبادی جہاد کے لیے سرحد گئے تو یہ عظیم المرتبت عالم ان کے ہم رکاب تھے اور سلسلۂ جہاد میں استاد کے معاون و مددگار رہے۔ اس کے بعد جب سرحد سے وطن واپس آئے تو پھر تدریس و تذکیر

میں مشغول ہو گئے اور ایک عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں شوال ۱۲۶۵ھ (ستمبر ۱۸۴۹ء) کو مولانا ولایت علی جب آخری مرتبہ مستقل طور پر وطن سے ہجرت کر کے سرحد کو روانہ ہوتے تو بھی مولانا یحییٰ علی ان کے ہم عنان تھے۔ جب ۲۲۔ محرم ۱۲۶۹ھ (۵۔ نومبر ۱۸۵۲ء) کو مولانا ولایت علی مرکز مجاہدین ستھانہ میں وفات پا گئے تو مولانا یحییٰ علی واپس وطن تشریف لے آئے اور حسبِ معمولِ سابق اپنے شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں درس و تدریس اور ذکر و تذکیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ طویل عرصے تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔

اس کے بعد برِصغیر کے سیاسی حالات نے ایسی کروٹ لی کہ انگریزی حکومت نے ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں ملک کے مختلف مقامات سے گیارہ آدمیوں کو گرفتار کر کے اُن پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا اور ان سب کو انبالہ جیل میں بھیج دیا۔ اسے "وہابیوں کا پہلا مقدمہ بغاوت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کی تمام کارروائی انبالہ جیل میں ہوئی۔ اس مقدمے کی ضروری تفصیلات "فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری" کی دوسری جلد میں بیان کی جا چکی ہیں۔

انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے ان مجرموں میں مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی بھی شامل تھے جنھیں ۲۶۔ رمضان ۱۲۸۰ھ (۵۔ مارچ ۱۸۶۴ء) کو گرفتار کر کے بذریعہ ریل گاڑی انبالہ بھیجا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر بیالیس برس کی تھی اور مجاہدین سرحد کے خادموں اور معاونوں کی فہرست میں ان کا نام "محی الدین" تھا۔

جن لوگوں پر مقدمۂ بغاوت قائم کیا گیا تھا، وہ سب اپنی اپنی جگہ معزز اور خوش حال لوگ تھے، لیکن انھیں انتہائی اذیت ناک صورتِ حال سے دوچار کیا گیا۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر کے انھیں ہتھکڑیاں اور لوہے کے طوق پہنائے گئے، کھانے کو ایسی روٹیاں دی گئیں جن میں چوتھا حصہ ریت اور مٹی شامل تھی، ان

میں سے بعض کو علیحدہ علیحدہ پھانسی کی کوٹھڑیوں میں رکھا گیا۔

مقدمے کی ابتدائی کارروائی انبالہ کے ڈپٹی کمشنر کپتان ٹائی کی عدالت میں ہوئی جو ایک ہفتہ جاری رہی۔ اس اثنا میں الزامات کی نوعیت، گواہوں کی ترتیب اور شہادتوں کی تفصیل مرتب کی گئی۔ پھر تمام ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا گیا اور سیشن عدالت میں باقاعدہ مقدمے کا آغاز ہوا۔

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملزم پہلے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہوئے تو دوران مقدمہ میں نماز کا وقت ہو گیا، نماز کے لیے اجازت طلب کی گئی تو نہ ملی۔ پھر معمول یہ رہا کہ جب نماز کا وقت ہوتا تو ملزم تیمّم کر کے اور بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لیتے۔ مقدمے کی سماعت جتنے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں جاری رہی، تمام ملزم الگ الگ پھانسیوں کی کوٹھڑیوں میں بند رہے۔ جب مقدمہ سیشن سپرد ہوا تو سب کو حوالات میں یک جا کر دیا گیا۔ یہ ماحول بہت حد تک سازگار تھا اور تمام دوست اکٹھے رہتے تھے۔ اس لیے تکلیفوں اور اذیتوں کا احساس تقریباً ختم ہو گیا تھا۔

مولانا یحییٰ علی انتہائی صابر و ضابط شخص تھے۔ ابتلا و آزمائش کے دنوں میں وہ عام طور پر عربی کی یہ رُباعی پڑھتے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے اور اس کی رضا پر راضی رہتے۔

لَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا ‏ عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ لِلّٰہِ مَصْرَعِیْ

وَذَالِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَأْ ‏ یُبَارِکْ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُّمَزَّعٖ

یعنی جب میں مسلمان مارا جاؤں تو مجھے کچھ پروا نہیں کہ اللہ کی طرف میرا لوٹنا اگرچہ کسی بھی طرح سے ہو۔

یہ سب اللہ کی راہ میں ہے، وہ چاہے تو بوسیدہ ہڈیوں اور تمام اعضائے جسم میں برکت اور بالیدگی پیدا کر دے۔

عدالت نے ۲۔ مئی ۱۸۶۴ء کو مقدمے کا فیصلہ سنایا۔ مولانا یحییٰ علی کے لیے

سزائے موت اور لاش جیل کے قبرستان میں دفن کرنے کا فیصلہ ہوا، نیز حکم دیا گیا کہ ان کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ بحق سرکار ضبط کر لی جائے ۔ بعد میں سزائے موت کو حبسِ دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ یہ فیصلہ ۲۴ اگست ۱۸۶۴ء کو صادر ہوا، جس کی اطلاع انھیں ۱۶ ستمبر ۱۸۶۴ء کو ملی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ موت کی سزا تین ملزموں کو سنائی گئی تھی اور وہ تھے: (۱) مولانا یحییٰ علی (۲) مولانا محمد جعفر تھانیسری اور (۳) شیخ محمد شفیع ۔ اس سزا سن کر شیخ محمد شفیع تو بہت مغموم ہوئے، البتہ دوسرے دونوں بزرگ انتہائی خوش تھے۔ انگریز پولیس کپتان نے مولانا محمد جعفر سے خوشی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ شہادت کی اُمید پر خوش ہیں، جو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، تم اس کو کیا جانو[1]

اس کے بعد ان کی سزائے موت ختم کر دی گئی کہ ملزم اس سے خوشی محسوس کرتے تھے اور ان کو خوش کرنا ہرگز مقصود نہ تھا۔ اس کے بجائے حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی کہ موت کے مقابلے میں یہ سزا زیادہ تلخ اور اذیت ناک ہو گی۔

جن لوگوں کو پھانسی کی سزا ختم کر کے حبسِ دوام کی سزا دی گئی تھی، ان کے سر اور ڈاڑھی مونچھ مونڈ دیے گئے تھے۔ مولانا یحییٰ علی ڈاڑھی کے کٹے ہوئے بال ہاتھ میں اُٹھائے پھرتے اور کہتے:

"افسوس نہ کر کہ تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اُسی کی خاطر کاٹی گئی[2]"

بغاوت کے گیارہ ملزموں میں سے چار کو، جن میں مولانا یحییٰ علی شامل تھے، کالا پانی بھیجا گیا۔ مولانا کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر انبالہ سے پیدل لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرت سر کے راستے لاہور لایا گیا اور کچھ عرصہ لاہور سنٹرل جیل میں

---

[1] کالا پانی، ص ۶۸،

[2] ایضاً، ص ۷۳،

رکھا گیا۔ اس کے بعد ریل گاڑی کے ذریعے ملتان اور وہاں سے کشتی میں سوار کر کے کوٹڑی پہنچایا گیا۔ کوٹڑی سے کراچی اور کراچی سے بادبانی جہاز سے بمبئی پہنچے۔ ۸ - دسمبر ۱۸۶۵ء کو بمبئی سے جمنا جہاز میں سوار ہوئے اور چونتیس دن کے بعد ۱۱ - جنوری ۱۸۶۶ء کو پورٹ بلیئر (جزائر انڈمان) میں اُترے۔

مولانا یحییٰ علی کی جائداد نیلام کر دی گئی تھی۔ یہ لاکھوں کی جائداد تھی جو انگریزی حکومت نے کوڑیوں میں فروخت کی۔ غیر منقولہ جائداد صرف دو ہزار ساٹھ روپے چار آنے میں اور منقولہ جائداد چھ سو پینتالیس روپے میں نیلام ہوئی۔

انبالہ وہابی سازش کیس سے تقریباً ایک سال بعد عظیم آباد کا پہلا مقدمۂ بغاوت شروع ہوا۔ اس میں جو حضرات گرفتار ہوئے ان میں مولانا یحییٰ علی کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ بھی شامل تھے۔ ان کا فیصلہ ۲۹ - رمضان ۱۲۸۱ھ (۲۷ - فروری ۱۸۶۵ء) کو ہوا۔ پہلے ضبطیٔ جائداد اور پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ پھر اسے حبسِ دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ ان کو مولانا یحییٰ علی سے پہلے ۱۵ - جون ۱۸۶۵ء کو پورٹ بلیئر (جزائر انڈمان) پہنچا دیا گیا تھا۔ جو لوگ اعانتِ مجاہدین کے جرم میں ماخوذ تھے، ان میں کالا پانی پہنچنے والے مولانا احمد اللہ اوّلین بزرگ تھے۔

اس زمانے میں انڈمان (کالا پانی) میں ایک شخص سید اکبر زمان اکبر آبادی چیف کمشنر انڈمان کے میر منشی تھے، جنھیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی بنا پر بیس سال قید کی سزا ہوئی تھی اور انڈمان بھیج دیے گئے تھے۔ یہ نہایت شریف آدمی تھے اور وہاں مقدمات کے تمام لوگوں کی انتہائی عزت کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے یہ ہندوستان میں قلعہ آگرہ کے محکمۂ فوج میں میر منشی تھے۔ کالا پانی پہنچنے کے بعد بھی انھیں میر منشی مقرر کیا گیا۔ قید کی مدت پوری ہونے کے بعد ۱۹۰۴ء میں آگرہ آئے اور وہیں وفات پائی۔

مولانا احمد اللہ جب کالے پانی پہنچے تو سید اکبر زمان نے چیف کمشنر سے

بات کی اور اس کی اجازت سے انھیں اپنے گھر لے گئے جو وہاں کے ایک جزیرے "روس آئی لینڈ" میں تھا۔ پھر اپنے قریب ہی ان کے لیے ایک الگ مکان کا انتظام کر دیا اور چیف کمشنر کی کچہری میں اپنے ماتحت لکھنے پڑھنے کا کام ان کو دلا دیا۔ مولانا احمد اللہ کے بعد ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۶ء کو مولانا یحییٰ علی انڈمان پہنچے تو سید اکبر زمان نے انھیں بھی اپنے پاس ہی جزیرہ روس آئی لینڈ میں ٹھہرایا۔ اس طرح مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی دونوں بھائی ایک ہی جگہ رہنے لگے۔ تبلیغ دین، اشاعتِ اسلام اور اصلاح عوام میں دونوں بھائی کوشاں رہتے۔ فرصت کے اوقات میں لوگوں کو قرآن، وحدیث کی تعلیم دیتے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین فرماتے۔ دونوں نہایت صابر و شاکر بزرگ تھے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، سزا کے بعد عظیم آباد میں ان کی تمام جائداد نیلام کر دی گئی تھی، مکانات خالی کرا لیے گئے تھے، عورتوں اور بچوں کو گھروں سے نکال دیا گیا تھا۔ سب مال و اسباب، کتابیں اور مسوّدے ضبط کر لیے گئے تھے جن مکانوں میں یہ لوگ کئی پشتوں سے سکونت پذیر تھے، انھیں مسمار کر دیا گیا تھا خاندانی قبرستان بھی کھدوا دیا گیا تھا اور مُردوں کی ہڈیاں قبروں سے نکلوا کر باہر پھینک دی گئی تھیں۔

یہ انتہائی وحشت ناک اذیتیں اور مصیبتیں تھیں جو ان پاک باز حضرات کو پہنچائی گئیں۔ یہ عظیم قربانیاں محض سیاست کے لیے نہ تھیں، یہ تقاضائے فرض تھا اور اس کا مقصد فقط اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رضا مندی اور خوشنودی تھا۔ کوئی دنیوی مفاد اس میں ہرگز نہ تھا، بلکہ دنیوی نقطۂ نظر سے یہ سراسر نقصان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مصائب و آلام کو انھوں نے نہایت تحمل سے برداشت کیا کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔

مولانا یحییٰ علی کو گھر میں پیش آنے والے حوادث کا علم ہوا تو کالے پانی سے

اہلیہ محترمہ کو ایک خط تحریر فرمایا جو لائق مطالعہ ہے۔ لکھتے ہیں :-

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یحییٰ علی کی طرف سے بخدمت ام حبیبہ، ام محمد یوسف سلمہا اللہ تعالیٰ۔

ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نورِ چشم محمد حسن مدعمرہ کے، حال انہدام دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا، اور صدمہ بہت گزرا۔ کیونکہ سکونتِ قدیم سے، خصوصاً وہ مکان کہ جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو، اور کاروبارِ فریضہ بہت انجام پائے ہوں، مومنین کو، انس و محبت بطور اہل و عیال کے ہوتی ہے۔

اسی روز شب کو روحِ انور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ تبسم کناں فرمانے لگے کہ البتہ انہدام سے مکانوں کے، مالکان کو، خصوصاً نسواں کو رنج والم بہت ہوا ہے، اور ہونے کی جگہ ہے اور ان آیاتِ کریمہ کو زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا :

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ؕ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَرَحۡمَۃٌ ۟ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ ۝[۳]

---

[۳] یہ سورۂ بقرہ کی آیات نمبر ۱۵۵ تا ۱۵۷ ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے : اور جو لوگ صبر کرنے والے ہیں، انھیں کامیابی کی بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی ان پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو ان کی زبانِ حال کی صدا یہ ہوتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ۝ (کہ ہم تو مال و اولاد سمیت اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب دنیا سے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جانے والے ہیں) سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں، جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ اور وہی اُس کی رحمت کے حق دار ہیں اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ہیں۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ [۴]
عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ [۵]۔

اور فرمایا ان آیات کو وردِ زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجدِ اقصیٰ اور مکاناتِ انبیا علیہم السّلام بخت اور جالوت کے ہاتھ سے انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیاً منسیاً ہو گئے اور یہ اماکنِ متبرکہ از سرِ نو بنا ہوئے اور پہلے سے زیادہ آباد ہوئے۔ تم بھی اپنے رب کے فضل سے ایسی ہی اُمید رکھو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے۔

بعد اس مکاشفہ کے میں نے بہت انشراح و تسکین پایا اور اپنے بڑے بھائی (مولانا احمد اللہ صاحب) کو آگاہ کیا۔

دریائے عشقِ خالقِ ہر دو جہاں میں ہم
نام و نشان دارِ فنا کے ڈبا چکے

کفنی گلے میں ڈال کے تسمہ کمر کے بیچ
جوگی ہوئے ہیں محرمِ اسرار کے لیے

اے فدائے من فدایت جانِ من
جملہ فرزندان و خادمانِ من [۶]

---

[۴] یہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۲۶ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے ہلے ہمارے پروردگار۔ ہمیں صبر کی نعمت سے شاد کام فرما، اور ہمیں اسلام کی حالت میں اس دنیا سے اُٹھا۔

[۵] یہ سورہ قلم کی آیت نمبر ۳۲ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس کا اچھا بدلہ دے۔ ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

[۶] اقتباس از مکتوب مولانا یحییٰ علی جو ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۳ھ کو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

کالے پانی پہنچنے کے تقریباً دو سال بعد مولانا یحییٰ علی بیمار ہوئے اور قانون کے مطابق ہسپتال میں ڈاکٹری علاج ہونے لگا۔ مولانا عبدالرحیم (جو ان کے بھانجے تھے اور انڈمان میں قید تھے) حکامِ بالا کی اجازت سے کچھ دیر اپنا کام کرنے اور کچھ دیر مولانا کی خدمت میں رہتے۔

بیماری کے دنوں میں مولانا یحییٰ علی کا یہ معمول رہا کہ جو لوگ عیادت کے لیے آتے، انھیں پند و نصیحت فرماتے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ زندگی کے آخری لمحے تک انجام دیتے رہے۔

مرض اگرچہ زیادہ شدید نہ تھا تاہم تکلیف ضرور تھی۔ بڑے بھائی مولانا احمد اللہ دن میں دو مرتبہ مزاج پرسی کے لیے ہسپتال تشریف لاتے۔ ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ کو طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوئی تو مولانا احمد اللہ کو بھی بلا لیا گیا اور مولانا عبدالرحیم بھی آ گئے۔ زبان پر اللہ کا ذکر جاری تھا اور ہوش بجا تھے کہ اسی دن یعنی ۲۶ شوال ۱۲۸۴ھ (۲۰ فروری ۱۸۶۸ء) کو روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، اور قیدِ فرنگ اور قیدِ حیات دونوں سے نجات پائی۔ کالا پانی پہنچنے کے بعد دو سال ایک مہینہ اور نو دن زندہ رہے۔

وفات ہسپتال میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد میت کو گھر لے جایا گیا۔ سید اکبر زمان نے چیف کمشنر سے اجازت لے کر تمام جزیروں میں اعلان کرا دیا تھا کہ جو لوگ تکفین و تدفین اور نمازِ جنازہ میں شامل ہونا چاہیں، ان کے مکان پر پہنچ جائیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی مقررہ مقام اور متعین وقت پر پہنچ گئے۔ پانچ ہزار کے قریب لوگ اس مردِ مجاہد اور عالمِ جلیل کی خبرِ وفات سن کر ان کے گھر پہنچے۔ نمازِ جنازہ کئی مرتبہ پڑھی گئی اور اس پیکرِ عزیمت و استقلال کو انڈمان کے جزیرہ روس آئی لینڈ میں دفن کر دیا گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) یک شنبہ کے روز انڈمان سے اپنی اہلیہ محترمہ کے نام ارسال فرمایا (بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج ۳، ص ۱۵۶ تا ۱۵۸)۔

مولوی کبیر احمد پھلواروی نے مندرجہ ذیل اشعار میں تاریخ وفات کہی۔

چونکہ یحییٰ علی ستودہ خصال | عالم و زاہد و محدث بود
روحِ پاکش گزاشت مجلسِ تن | راہِ ملکِ وصالِ حق پیمود
گشت راضی خدائے پاک ازو | عزّتش پیشِ قدسیاں افزود
ہاتفِ سالِ او ز روئے الم | رضی اللہ ربہ فرمود

۱۲۸۴ھ

۱۳۰ـــــــ مفتی یعقوب علی سندیلوی

صوبہ یوپی کے شہر سندیلہ کی سرزمین سے متعدد اہلِ کمال نے جنم لیا، جن میں ایک لائقِ احترام شخصیت مولانا یعقوب علی عثمانی گوپاموی کی ہے۔ ان کے والد فضل علی اور دادا رحم علی تھے۔ عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، لہٰذا یعقوب علی عثمانی کہلائے۔ متقی اور عابد و زاہد علما میں گردانے جاتے تھے۔

مفتی یعقوب علی عثمانی ماہِ رمضان ۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو اپنے علاقے کے اہلِ علم سے حصولِ علم کا آغاز کیا۔ پھر مدراس گئے، وہاں مولانا تراب علی خیرآبادی، شیخ حسن علی باہلی اور قاضی ارتضا علی گوپاموی سے تحصیل کی۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو جنوبی ہند میں مالا بار کے مفتی مقرر کیے گئے۔ فقہ و کلام پر عبور حاصل تھا، اس لیے کچھ مدت بعد مچھلی بندر کے منصبِ قضا پر فائز ہوئے۔ پھر راجمندری کی صدارت کا عہدہ پایا۔ یہ تمام خدمات انھوں نے نہایت حسن و خوبی سے انجام دیں اور طویل عرصے تک ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے منصب پر متمکن رہے۔

پھر حرمین شریفین کا عزم کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ واپس وطن تشریف لائے تو تمام علائق سے منقطع ہو کر راجمندری میں سکونت اختیار کر لی۔ اب لوگوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور بالکل گوشہ گیر تھے۔ راجمندری

ہی میں ۲۰ ــــــــــ رمضان ۱۲۸۳ھ کو انتقال ہوا، تہتر سال کی عمر پائی[ے]

۱۳۱ ــــــــــ مولانا یعقُوب دسنوی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک مقام "دِسنہ" ہے جس کی خاک سے بہت سے ارباب فضل اور اصحاب کمال اُبھرے اور آسمانِ شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔ یہ وہ مقام ہے جسے چودھویں صدی ہجری کی نامور و ممتاز شخصیت علامہ سیّد سلیمان ندوی کے مولد و منشا ہونے کا فخر حاصل ہے۔ سیّد صاحب اپنے اوصاف گوناگوں کی بنا پر نہ صرف برّصغیر میں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں مشہور ہوئے اور اپنی بوقلموں خدماتِ علمی کی وجہ سے ہر حلقے میں لائق اعزاز و اکرام قرار پائے۔

تیرھویں صدی ہجری میں "دِسنہ" کے چھوٹے سے گاؤں میں ایک عالم مولانا یعقوب کی ولادت ہوئی جن کو اپنے عہد کے فحول علما میں شمار کیا گیا اور فقہ و اصول اور علوم ریاضیہ میں جن کی مہارت کا لوہا مانا گیا۔

مولانا یعقوب دسنوی نے مختصرات کی تکمیل اپنے گرد و پیش کے اساتذہ سے کی۔ پھر مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری کی خدمت میں گئے اور ان سے علوم درسیہ کی کتابیں پڑھیں۔

سندِ فراغ کے بعد صوبہ بہار ہی کے ایک مشہور شہر مونگیر کا قصد کیا اور وہاں درس و افادہ کی مسند بچھائی۔ ایک مدّت تک مونگیر میں رہے اور بہت سے علما و طلبا کو زیورِ علم سے آراستہ کیا۔ پھر اُن کی خدمات شہر بہار کے انگریزی مدرسے کے لیے حاصل کر لی گئیں۔

اس عالم و فقیہ نے ۱۲۸۰ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا[ش]

[ے] نزہتہ الخواطر، ج ۷، ص ۵۳۳ ــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۵، ۲۵۶ ــ

[ش] نزہتہ الخواطر، ج ۷، ص ۵۳۴ ۔

۱۳۲ —— قاضی یوسف شاہ جہان پوری

قاضی یوسف بن ابو یوسف افغانی شاہ جہان پوری، اپنے عصر کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ بہت بڑے شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔ شاہ جہان پور (یوپی) میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اس زمانے میں بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی شاہ جہان پور میں قیام پذیر تھے اور وہاں ان کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، قاضی یوسف نے ان کے مدرسے میں داخلہ لیا اور ان سے کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر ایک شہر "بہار" کا رُخ کیا اور وہاں کے اساتذہ سے تکمیل علم کی۔ شادی بھی اُسی علاقے میں ہوئی۔

فراغت کے بعد مدراس گئے، وہاں کچھ عرصہ والیٔ مدراس والا جاہ کے دربار میں رہے۔

پھر حیدر آباد (دکن) کا رُخ کیا اور ۱۲۰۸ھ میں حیدر آباد کے عہدۂ قضا پر متمکن ہوئے۔ حیدر آباد میں یہ نظام الملک نظام علی خاں کا دورِ حکومت تھا۔ وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا، اور انھیں "شریعت اللہ خان بہادر" کے لقب سے مفتخر کیا۔

قاضی یوسف شاہ جہان پوری کا زیادہ تر وقت درس و افادۂ طلبا میں صرف ہوتا تھا۔ ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا۔

اس جیّد عالم اور فقیہ نام دار کی وفات ۱۲۴۰ھ میں ہوئی[۱]

۱۳۳ —— سیّد یوسف بیجا پوری

سیّد یوسف بن عبد اللہ بن محمّد درویش حسینی بیجاپوری، علمائے صالحین میں سے تھے۔ نامور شیخ اور فقیہ تھے۔ مفتی عبد القوی حیدر آبادی کے شاگرد تھے۔ علوم سے

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۳۶۔

فراغت کے بعد سوئے حرم روانہ ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ طویل عرصے تک ارضِ حجاز میں سکونت اختیار کیے رکھی۔ ہندوستان واپس آئے تو حیدر آباد (دکن) میں اقامت گزیں ہوئے اور وہاں حدیث و فقہ کے درس کا سلسلہ شروع کیا جو عمر بھر جاری رہا۔

اس عالم و فقیہ نے ۳ صفر ۱۲۱۹ھ کو حیدر آباد میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے۔[۱]

صادق علی خوش نویس۔ لاہور

۱۔ محبوب ذی المنن ص — نزہتہ الخواطر، ج ۷ ص ۵۳۷

مراجع ومصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ آثار الاُوَل من علمائے فرنگی محل : عبدالباری فرنگی محلی ۔ مطبع مجتبائی، لکھنؤ ۔

۲۔ آثار الصنادید : سرسید احمد خاں ۔ ترتیب وحواشی : ڈاکٹر معین الحق ۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۔ کراچی ۱۹۶۶ء

۳۔ ابجد العلوم : نواب محمد صدیق حسن خاں ۔ مکتبہ قدوسیہ ۔ لاہور ۱۹۸۳ء

۴۔ اتحاف النبلا : نواب محمد صدیق حسن خاں ۔ مطبع نظامی، کان پور ۔ ۱۲۸۸ھ

۵۔ احوال علمائے فرنگی محل : شیخ الطاف الرحمٰن ۔ مطبع مجتبائی، لکھنؤ ۔

۶۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما : انتظام اللہ شہابی ۔ طبع دہلی ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء

۷۔ بوستانِ اخیار : سعید احمد مارہروی ۔ طبع آگرہ ۔ ۱۳۳۱ھ

۸۔ پنجابی ادب دی کہانی : عبدالغفور قریشی ۔ طبع لاہور

۹۔ پنجابی شاعراں دا تذکرہ : مولا بخش کشتہ ۔ پاکستان پرنٹنگ پریس، لاہور ۔ ۱۹۶۰ء

۱۰۔ تاریخ اہل حدیث : مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی ۔ اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور ۔ ۱۹۵۳ء

۱۱۔ تاریخ اولیائے دہلی : احمد سعید دہلوی ۔ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی ۔ ۱۹۵۴ء

۱۲۔ تاریخ دار العلوم دیوبند جلد اوّل : سید محبوب رضوی ۔ ادارہ اہتمام دار العلوم دیوبند ۔ ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء

۱۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور : سید اقبال احمد ۔ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس ۔ جون پور ۔ ۱۹۶۳ء

۱۴۔ تاریخ لاہور : کنھیا لال ۔ مجلس ترقی ادب، لاہور ۔ ۱۹۷۶ء

۱۵۔ تاریخ مشائخ چشت ۔ خلیق احمد نظامی ۔ ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۳ء

۱۶۔ تاریخ النوائط : نواب عزیز جنگ بہادر ۔ عزیز المطابع، حیدر آباد (دکن) ۱۹۵۳ء

۱۷۔ تحقیقات چشتی : نور احمد چشتی ۔ پنجابی ادبی اکیڈمی ۔ لاہور ۔ ۱۹۶۴ء

۱۸ - تذکرہ : مولانا ابوالکلام آزاد - مکتبہ احباب - لاہور

۱۹ - تذکرہ علمائے پنجاب : اختر راہی - مکتبہ رحمانیہ، لاہور - ۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۱ء

۲۰ - تذکرۃ العلماء والمشائخ : محمد الدین فوق - گلزار اسٹیم پریس، لاہور - ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء

۲۱ - تذکرہ علمائے فرنگی محل : محمد عنایت اللہ - طبع لکھنؤ - ۱۹۳۰ء

۲۲ - تذکرہ علمائے ہند : رحمان علی مطبع نول کشور - لکھنؤ - ۱۹۱۴ء

۲۳ - تذکرہ مشاہیر کاکوری : محمد علی حیدر - مطبع اصح المطابع، لکھنؤ - ۱۹۲۷ء

۲۴ - تراجم علمائے حدیث ہند : ابو یحییٰ امام خان نوشہروی - جید برقی پریس، دہلی ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۸ء

۲۵ - جماعت مجاہدین : غلام رسول مہر - کتاب منزل - لاہور - ۱۹۵۵ء

۲۶ - حدائق الحنفیہ : مولوی فقیر محمد جہلمی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء

۲۷ - حدیقۃ الاولیا : مفتی غلام سرور لاہوری - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۷۷ء

۲۸ - الحیات بعد المماۃ : مولانا فضل حسنین بہاری - مکتبہ سعودیہ - حدیث منزل، کراچی - ۱۹۵۹ء

۲۹ - حیات جاوید : مولانا الطاف حسین حالی - اکادمی پنجاب، لاہور - ۱۹۵۷ء

۳۰ - حیات العلماء : سید عبدالباقی سہسوانی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۲ء

۳۱ - حیات ولی : مولانا رحیم بخش دہلوی - مکتبہ سلفیہ، لاہور - ۱۹۵۵ء

۳۲ - خزینۃ الاصفیاء : مفتی غلام سرور لاہوری - مطبع نامی گرامی موسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ - ۱۲۹۰ھ

۳۳ - روضۃ الابرار : محمد الدین، سراج المطابع، جہلم - ۱۳۰۲ھ

۳۴ - سرگزشت مجاہدین : غلام رسول مہر، کتاب منزل - لاہور - ۱۹۵۴ء

۳۵ - سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی : از مولانا عبدالجبار غزنوی و مولانا غلام رسول طبع - لاہور

۳۶ - سوانح مولوی غلام رسول : مولوی عبدالقادر، طبع لاہور ۔

۳۷ - سوانح قاسمی : مولانا مناظر احسن گیلانی جلد اوّل - دتی پرنٹنگ ورکس دہلی ۔
۱۳۵۴ھ

۳۸ - سوانح قاسمی : مولانا مناظر احسن گیلانی جلد دوم - الجمیعتہ برقی پریس، دہلی ۔
۱۳۷۳ھ

۳۹ - سوانح قاسمی : مولانا مناظر احسن گیلانی جلد سوم - الجمیعتہ برقی پریس، دہلی ۔
۱۳۷۳ھ

۴۰ - طرب الاماثل بتراجم الافاضل : مولانا عبدالحی لکھنوی - مطبع یوسفی، لکھنؤ ۔
۱۹۲۱ء

۴۱ - علمائے ہند کا شاندار ماضی : مولانا محمد میاں، مکتبہ محمودیہ، لاہور ۔
۱۳۹۷ھ / ۱۹۷۷ء

۴۲ - فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری : جلد اوّل - محمد اسحاق بھٹی - ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور - ۱۹۸۲ء

۴۳ - فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری : جلد دوم - محمد اسحاق بھٹی - ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور - ۱۹۸۲ء

۴۴ - قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب : ذوالفقار احمد - فیض طبع مفید عام - آگرہ - ۱۳۱۶ھ

۴۵ - کمپنی کی حکومت : باری - نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور - طبع چہارم - ۱۹۶۹ء

۴۶ - مسلمانوں کا روشن مستقبل : سید طفیل احمد منگلوری علیگ - حماد الکتبی، شیش محل روڈ، لاہور ۔

۴۷ - مکتوبات سرسید : مجلس ترقی ادب، لاہور - ۱۹۵۹ء

۴۸ - موج کوثر : شیخ محمد اکرام : ادارہ ثقافت اسلامیہ - طبع دہم -
۱۹۷۹ء

۴۹ ۔ مولانا محمد احسن نانوتوی : محمد ایوب قادری ۔ مکتبہ عثمانیہ پیر الٰہی بخش کالونی ۔ کراچی
۱۹۶۶ء

۵۰ ۔ نزہتہ الخواطر : جلد ۷ ۔ سید عبدالحی حسنی ۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ ۔
حیدر آباد (دکن) ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۹ء

۵۱ ۔ واقعات دار الحکومت دہلی : جلد دوم ۔ بشیر الدین احمد دہلوی ۔ شمسی مشین پریس
آگرہ ۔ ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء

۵۲ ۔ الیانع الجنی : محمد بن یحییٰ ترہٹی ۔ مطبع صدیقی پریس بریلی ۔ ۱۲۸۷ھ

۵۳ ۔ التاج المکلل : نواب سید صدیق حسن خان ۔ طبع ثانی ۔ ناشر، شرف الدین و اولادہ، بمبئی
۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء
۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء

۵۴ ۔ تقویۃ الایمان از مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی (مقدمہ غلام رسول مہر) ناشر: اہل حدیث
اکادمی ۔ لاہور ۔

۵۵ ۔ ارواح ثلاثہ : مولانا اشرف علی تھانوی ۔ اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور ۔ ۱۹۷۶ء

۵۶ ۔ تذکرہ شہید : محمد خالد سیف ۔ مکتبہ غزنویہ ۔ شیش محل روڈ ۔ لاہور ۔ ۱۹۸۳ء

۵۷ ۔ حیات اسماعیل شہید : پیام شاہجہان پوری ۔ ادارۂ تاریخ و تحقیق، چاہ میراں ۔ لاہور ۱۹۷۳ء

۵۸ ۔ کلام شاہ اسماعیل شہید : مرتب محمد خالد سیف ۔ طارق اکیڈمی ۔ فیصل آباد ۔

۵۹ ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ (واقعات و شخصیات) ڈاکٹر محمد ایوب قادری ۔ پاک اکیڈمی، کراچی
۱۹۷۶ء

۶۰ ۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان : ڈاکٹر ہنٹر ۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین ۔ اقبال اکیڈمی،
لاہور ۔ ۱۹۴۶ء